

ایک تھی مثال

رُحسانہ بکار عمائدہ

پاک سوسائٹی فاؤنڈیشن

ایک گفتگو مسال

”بیبی برتھ ڈے ٹویو۔۔۔ بیبی برتھ ڈے ڈیر مشال۔۔۔ بیبی برتھ ڈے۔“ تالیوں اور آوازوں کے شور میں سات سالہ گلابی خوب صورت باربی فرائک میں ملبوس مشال نے میک کاٹا۔ بشری اور عدیل نے خوب گے لگا کر اسے پیار کیا۔ اس نے بھی دونوں کے پیار کا جواب خوب خوش ہو کر دیا۔ ذکیہ بیگم کے صبر کا پیمانہ جیسے لہرز ہو گیا۔

”ارے کیا ایسا باوا، ہاں ہاں پیار لٹا دیں گے بچی پر۔ کچھ نانی، دادی کا بھی حق ہے یا نہیں؟“ ذکیہ نے کھینچ کر مشال کو سینے سے لگایا۔ پھر دادی کی باری آئی۔ پھوپھی اور ماموں کیوں پیچھے رہتے۔

مشال تو دونوں گھروں کا وہ خوب صورت کھلونا تھا جس سے کوئی بھی سیر نہیں ہوتا تھا۔ دونوں گھروں میں بھلے ہر معاملے میں اختلاف ہوتا مگر مشال کے نام پر سب ایک ہو جاتے تھے۔ وہ بچی کبھی ہی کچھ اتنی پیاری مومنہ صورت والی کہ جو کوئی دیکھتا ہے اختیار اسے پیار کرنے لگتا۔ پھر اس کی عادت اتنی اچھی تھی۔ ادب اور تمیز سے بات کرنے والی۔ نانی کے گھر جاتی۔ دادی کی برائی کرتی نہ پھوپھی کی۔ ماموں نانو کے پاس ایک رات رہ کر آئی یا پورا ہفتہ، کبھی ان کی باتیں دادی پھوپھی کے پاس گھس گھس کر نہ کہتی۔ اگرچہ نسیم بیگم کئی بار اسے ٹولنے کی کوشش کرتیں مگر مشال پیاری سی شکل بنا کر فوراً ہی کہہ دیتی۔

”نہیں دادو! نانو نے تو آپ کی اور فوزیہ پھوپھی کی ایسی کوئی بات کی ہی نہیں بلکہ وہ مجھے کہہ رہی تھیں پوری دادی پر ہے خوش اخلاق اور ہنس مکھ۔“

اور دادی چاہتے ہوئے بھی کوئی برا جواب نہ دے پاتیں۔ النابی سے کہتیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی ویب سائٹ

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو امیل لنک
- ✧ ڈاؤن لوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر پو پو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریویو
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ دیب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ پیریم کو الٹی، مندل کو الٹی، کمپریڈ کو الٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریویو
- ✧ ایڈ فزری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد دیب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤن لوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤن لوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤن لوڈنگ کے لئے ہمیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤن لوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”ذکیہ میں یہ اچھی عادت ہے دوسرے سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو اس کی برائی نہ پیٹھ پیچھے کرتی ہے، بلکہ اس کی اچھائیاں ہی بیان کرتی ہے۔“ اور فوزیہ کا موڈ آف ہو جاتا۔

”خوب سمجھتی ہوں میں مشال کا کاپن۔ امی! یہ کبھی نانی ماموں کی برائی نہیں کرے گی۔ ماں نے بڑا اچھا ٹریڈ کر رکھا ہے۔ پورا تھلا کا بیٹنگن ہے۔ جانتی ہوں میں اسے۔“

اور مشال معصوم سی شکل بنائے بڑی بڑی آنکھیں ہٹھٹاتی پہلے تو نا سمجھی سے دونوں کو دیکھتی رہتی پھر پھوپھو کے کندھے سے جھول کر بھولہن سے پوچھتی۔

”پھوپھو! یہ تھالی کا بیٹنگن کیا ہوتا ہے؟“ فوزیہ جل کر کباب ہو جاتی۔

”بھئی! یہ میری مشال کے لیے سونے کی بالیاں اور پانچ سوٹ ہیں۔ ماموں نے تو بھانجی کے لیے خدا جانے کون کون سی وڈیو گیمنز اور کھلونے اکٹھے کر دیے ہیں۔ ان گفٹ بکس کو خود ہی بشری اور عدیل کے ساتھ کھول کر دیکھ لیتا اور یہ بشری اور عدیل کے جوڑے ہیں اور یہ مٹھائی بھی۔“

ذکیہ نے ٹیک کٹنے کے بعد تحائف کا ڈھیر میز پر رکھنا شروع کر دیا۔

بشری کا چہرہ فخر سے چمکنے لگا۔

عدیل بھی سسرال سے آئے بھاری تحفوں پہ بیٹی کی خوش قسمتی کو دل میں سراہنے لگا۔ جب سے پیدا ہوئی تھی، نھیاں دھیاں کے ہاتھ کاچھالانی ہوئی تھی۔ دونوں طرف سے نہ پیار میں کمی تھی نہ اس کے لیے چیزوں میں۔

”اور یہ میری اور فوزیہ کی طرف سے گولڈ کی چین ہے۔ یہ اس کے کپڑے اور کھلونے۔ خاص فرمائش کر کے فوزیہ سے مشال نے یہ ناپنے والی بابی ڈول لی ہے اور ساتھ میں ڈول ہاؤس کا پورا سیٹ بھی۔ مشال پھوپھو سے کوئی فرمائش کرے اور فوزیہ اسے ٹال دے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”تھینک یو ناؤ اینڈ ماموں! اور بہت سا تھینک یو دادو اور پھوپھو کے لیے اور مشال کا پیار بھی۔“ مشال باری باری سب سے گلے لگ کر سب کو پیار کرنے لگی۔ اس کی یہ بی ادائیگی تو سب کو بھاتی تھیں۔

”میرے خیال میں پہلے سب کے لیے کھانا نہ لگا دیا جائے؟ چائے گولڈ ڈرنگس بعد میں ہو جائیں گی۔“ بشری ساس کے پاس آ کر بولی۔

ساس نے باہر سے آئے مہمانوں اور خاندان کے لوگوں کا حساب نظروں ہی میں لگا لیا۔

”فی الحال چائے گولڈ ڈرنگ اور مٹھائی رکھو۔ یہ ادھر ادھر کے لوگ جنہوں نے پانچ پانچ سو کے لفافے دیے ہیں۔ ان کو جانے دو۔ کھانا تو خاندان والوں کو ہی پورا پڑے گا بمشکل۔“

”نہیں امی! آرڈر تو سب کے حساب سے دیا تھا عدیل نے۔ کم تو نہیں پڑے گا۔ یوں بھی پرا لگتا ہے کہ محلے والوں کو یوں ہی جانے دیں اور بعد میں آدھے لوگوں کو کھانا کھلائیں۔“ بشری نے ساس سے آہستگی سے کہا۔

”تو بھابھی! پھر امی کی صلاح کیوں لے رہی ہیں؟ اپنی مرضی کریں نا جو آپ نے پہلے سے طے کر رکھا ہے۔“ فوزیہ اپنے مختصر سے جسم کو ذرا سا جھلا کر بولی۔

”اور میں نے تو بی بی! مشورہ اس لیے دیا تھا کہ کچھ تو بچت ہو سکے۔ عدیل کا کوئی باند تو نہیں کھل گیا جو پوری بارات کو کھانا کھلانے بٹھا دو۔ آگے تمہاری مرضی اور نہ بعد میں عدیل سے کچھ کا کچھ بول کر ماں کو بے عقل ٹھہراؤ گی۔ جو تمہارا جی چاہے وہ کر دو۔“ نسیم بیگم نے نروٹھے پن سے کہہ کر گویا بات ہی ختم کر دی۔

بشری متذبذب سی اٹھ کر چلی گئی۔ عدیل سے مشورے کے بعد سب کو کھانا کھلا کر ہی بھیجا گیا۔

اور یہ بات نسیم بیگم اور فوزیہ دونوں ہی کو پتا گئی۔ اول تو انہیں یہ پہلے سے نہیں پتا تھا کہ ساگر اتنے بڑے

پیمانے پہ منائی جائے گی۔ اگرچہ تیاریاں تو بہت دنوں سے ہو رہی تھیں مگر موٹل سے کھانے کا آرڈر وہ بھی تین تین ڈشز کا۔ بیٹے کی کمائی یوں بے دریغ لٹنے پر نسیم بیگم کیوں نہ خفا ہو تیں اور فوزیہ جس نے چند دن پہلے عدیل سے دس ہزار مانگے تھے۔ اسے امپٹیشن کا سیٹ پسند آیا تھا۔ اس نے اگلے ماہ لینے کا کہہ کر منع کر دیا تھا۔ وہ بھی دل ہی دل میں بھائی سے خفا ہو گئی کہ بیٹی کے فنکشن پر ہزاروں لٹا دیے اور بہن کے لیے صرف دس ہزار نہیں تھے ان کے پاس۔

فنکشن ہنسی خوشی ختم ہوا۔ سب سے آخر میں ذکیہ اور عمران روانہ ہوئے اور جاتے جاتے بشری اور عدیل کو اگلے ایک اینڈ پر اپنے گھر آنے کی دعوت دے گئے۔ دعوت تو خیر انہوں نے نسیم بیگم اور فوزیہ کو بھی دی تھی جسے نسیم بیگم نے تو اپنی گھنٹوں کی تکلیف اور فوزیہ نے اپنی دوست کی شادی کا بہانہ کر کے رو کر دیا۔ یوں بھی ذکیہ نے کون سا دل سے دعوت دی تھی ان دونوں کو؟ ”یوں کہا کہ کہیں وہ بشری کو باقی نہ سنائیں یا اسے آنے سے روک نہ دیں۔ ان دونوں کے انکار پر مطمئن ہو کر چلے گئے۔“



عمران گھر جا کر لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گیا۔

”امی! ایک کپ چائے ملے گی؟“ بچن کی طرف جاتی ذکیہ کی طرف دیکھ کر اس نے آواز لگائی۔

”ابھی تو پی کر آرہے ہو بشری کی طرف سے۔“

”آپ تو جانتی ہیں آپ کے ہاتھ کی چائے پیے بغیر مجھ سے کام نہیں ہوتا۔“

ذرا درمیں وہ دو کپ لیے اس کے پاس ہی آ بیٹھیں۔

”اب کیا کام کرنا ہے تمہیں نا کم تو کمانی ہو گیا ہے۔“ ذکیہ نے اسے مصروف دیکھ کر پوچھا۔

”ہوں! کام تو کمانی ہے مگر ایک آدھ گھنٹہ ہی کروں گا۔ کافی تھکاوٹ ہو رہی ہے۔ دیر تک نہیں بیٹھ سکوں گا اور مجھے منع کر کے آپ خود بھی چائے بنا لائیں اپنے لیے؟“ وہ ماں کو ٹوک کر بولا۔

”ہاں! بس سر میں درد سا ہو رہا تھا۔ میں نے کہا کچھ سکون ملے گا اور میں تو حیران ہوں ابھی تک۔ یہ نسیم اور فوزیہ نے اتنا جکرا کہاں سے دکھا دیا۔ مشال کے لیے چین وہ بھی سونے کی۔ بڑی بات ہے۔“ ذکیہ کے بغیر نہ رہ سکیں۔

”ہاں! تو میں بھی حیران تھا اور نہ ہر سال تو وہ مشال کو ہزار پانچ سو دے دیا کرتی تھیں یا ایک دو فرائیڈوں پر ٹر خا دیا۔ آج تو واقعی کمال ہو گیا عمران بھی چائے کی چسکی بھر کر بولا۔

”ظاہر ہے! بیٹے کی ترقی ہوئی ہے۔ اسے بیٹے کو خوش نہیں کرنا تھا کیا؟ معلوم تو ہے انہیں کہ عدیل کی جان تو مشال میں ہے اس کی ہنسی اس کی خوشی تو عدیل کے لیے سب سے بڑھ کر ہے۔ یوں بھی فوزیہ کے لیے جینز اکٹھا کرنے میں لگی ہے دن رات یہ نسیم بیگم تو بیٹے کو مٹھانے کا اس سے اچھا موقع اور کون سا ہو گا۔ وہ سمجھتی ہیں لوگ گدھے ہیں ہنسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آتیں ان کی چالاکیاں اور نہ میری بشری جیسے ان کے ساتھ رہ رہی ہے۔ ہر لڑکی نہیں رہ سکتی۔ حرفوں کی بنی ہیں دونوں ماں بیٹی۔“ وہ تنفر سے بولیں۔

”فوزیہ کا رشتہ ہو گیا کہیں؟“ عمران لیپ ٹاپ میں مصروف تھا۔ اس نے شاید ماں کی نسیم بیگم کے خلاف کوئی بات سنی بھی نہیں تھی۔

ابھی کمال۔ ہر دوسرے دن کوئی نہ کوئی رشتہ دیکھنے چلا آتا ہے۔ کسی میں ان ماں بیٹی کو کیزے نظر آتے ہیں اور

کسی کو فوزیہ بی بی اچھی نہیں لگتی سوہ اور مزوالے بھی آئے تھے ایک ہشتہ والی کے توسط سے۔
 ”اچھا واقعی! عمران بے اختیار چونک کر بولا۔
 ”ہاں! تو اور نہیں۔ بڑا اونچا ہاتھ مارنے کے چکر میں ہے نسیم بیگم بی بی کے لیے۔“
 ”پھر کچھ بات بنی؟“

”کہاں۔ انہوں نے تو صاف منہ پر بول دیا کہ ہمیں تو ذرا کم عمر لڑکی چاہیے۔ فوزیہ کی شکل ہی ایسی بچی ہے۔ پھر عمر بھی تو دیکھو! کم تو نہیں۔ عدیل سے سال بھر تو چھوٹی ہے۔ عدیل کی شادی کو ماشاء اللہ آٹھواں سال ہونے لگا ہے اور ان بی معصومہ کی کہیں بات ہی نہیں کھری رہی۔ اب دوسرا تو بڑی عمر کا کہہ کر چلا جاتا ہے اور جلن نکالتی ہے بشری پر۔“

”کیوں پھر کوئی جھگڑا ہوا؟“ عمران کچھ چونک کر بولا۔

”یہ کون سی نئی بات ہے۔ کوئی نہ کوئی عین سچ تو ماں بی بی نکالتی رہتی ہیں۔ میں نے بشری ہی سے کہہ رکھا ہے کہ بیٹا! محل سے برداشت کر لیا کرو۔ دو چار مہینوں یا سال بھر میں فوزیہ بی بی کا کاشا بھی کسی نہ کسی طرح نکل ہی جائے گا۔ ماں اتاؤلی تو خوب ہو رہی ہے۔“ ذکیہ کن اکیوں سے لپ لپ کی اسکرین کی سائڈ پر آئی۔ نسیم برمنہ لڑکیوں کے اشتہاروں کی تصویروں کو دیکھ کر بولیں۔
 عمران بالکل بھی متوجہ نہیں تھا۔ وہ کھڑی ہو گئیں۔ پھر کچھ یاد آگیا۔

”وہ مجھے یاد آیا۔ بشری کے ہمسائے سے جو رضوی صاحب کی دونوں بیٹیاں آئی ہوئی تھیں، ابھی مشال کے فنکشن میں بہن کی طرف میں نے اشارے بھی کر کے بتایا تھا۔ تمہیں کیسی لگیں وہ دونوں؟“
 ”ہوں! کچھ خاص نہیں۔ دونوں نے اتنا میک اپ تھوپ رکھا تھا کہ رنگت کا کچھ ٹھیک سے اندازہ بھی نہیں ہو رہا تھا اور نیلے سوٹ والی تو اچھی خاصی آٹھی لگ رہی تھی۔ ابھی سے ان کا یہ حال ہے تو شادی کے بعد کا سوچیں۔ اور دوسری بالکل سوکھی لڑکی۔ کچھ عجیب سی نہیں لگیں آپ کو؟“ عمران منہ بگاڑ کر بولتا چلا گیا۔ ذکیہ کچھ مایوس سی ہو گئیں۔

”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کیسے یہ معاملہ حل ہو گا بھلا۔ تمہارے بینک میں ایسی ایسی فیشن اہل خوب صورت لڑکیاں کام کرتی ہیں، تم کیوں نہیں دیکھ لیتے کوئی اچھی فیملی کی مناسب لڑکی؟“

”ای! میں وہاں کام کرنے جاتا ہوں لڑکیاں تازے نہیں۔ یوں بھی یہ بینکوں، دفاتروں میں کام کرنے والی لڑکیاں ماں باپ کے ہاتھوں سے نکلی ہوتی ہیں ان سے گھر نہیں بسا کرتے۔ شربے مہارسی ہوتی ہیں۔ سچی بات ہے مجھے ایسی لڑکیاں پسند بھی نہیں۔“ عمران اب بھر لگی لٹی رکھے بولا تو ذکیہ اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

”یہ تو ہے۔ وہ تو خالہ کلثوم بھی تین چار رشتے ایسے لے کر آئیں کہ لڑکی نوکری کرتی تھی۔ میں نے اسے منع کر دیا کہ بھی! ان نوکری کرنے والیوں سے گھروں میں بندھ کر نہیں بیٹھا جاتا۔ ہمیں تو ایسی ہو چاہیے جو گھر کو سنبھالے، چلائے۔ اپنی سلیقہ مندی اور سکھو دین سے شوہر اور ساس کے دل میں جگہ بنائے نہ کہ اپنی تنخواہ اور نوکری کا رعب ہم پر جمانے لگے۔ شکر ہے کلثوم بی بی سمجھ گئیں۔ دوبارہ ایسا رشتہ نہیں لے کر آئیں۔ چلو اللہ کچھ بہتر ہی کرے گا۔ میں پہلے عشا کی نماز پڑھ لوں۔ آج تو دیر بھی بہت ہو گئی۔ تم کاوٹ سے جی سستی کرنے لگا ہے۔ نماز پڑھے بغیر نیند کہاں آئے گی مجھے۔ سو جانا تم بھی جلدی۔“ وہ کہتے ہوئے چلی گئیں۔

فوزیہ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بیٹھی اپنا میک اپ اتار رہی تھی۔
 نسیم بیگم تسبیح ہاتھ میں لیے منہ میں پڑھتی بستر کی طرف بڑھ گئیں۔
 ”اپنی سہ ماہی صاحبہ کی شوبازی دیکھی تھی آپ نے؟“ فوزیہ عیشے میں ماں کو دیکھ کر حنا لے والے انداز میں بولی۔

”شروع سے عادت سے اس کی تو کوئی نئی بات تھوڑی ہے یہ۔ کیسے پانی پڑ گیا اس سے۔ جب ہم نے بھی ڈسکے کی چوٹ پر کھٹے دیے۔ اس کے تو وہم گماں میں نہیں تھا کہ بازی ہمارے ہاتھ جائے گی۔“ نسیم بیگم اپنے سینے پہ پھونک مارنے کے بعد تسبیح مٹھی میں لپیٹ کر ٹھٹھا مار کر بیٹھیں۔

”رفع کریں باری واری! اچھا خاصا خرچ ہو گیا امی! آپ نے میری جین اٹھا کر دے دی مشال کے لیے۔ میرا تو بہت دل برا ہو رہا ہے۔“

”پانگل ہے تو تو۔ ایک آدھے تولے کی چین دے کر عدیل سے چار تولے کا سیٹ نہ اس مہینے نکلاوایا تو میرا نام ہڈل رہتا۔“

”اتنے اچھے بھیا جان۔ بھابھی بیگم اشارہ کریں گی تو ہی جیب کی طرف ہاتھ جاتا ہے ان کا۔“ فوزیہ چڑ کر بولی۔
 ”بشری بی بی کو جتنے بھی چلتے آتے ہوں۔ ابھی وہ عدیل کی ماں کے برابر نہیں ہو سکتی، عقل اور ذہانت میں۔“ نسیم بیگم فخر سے بولیں۔

”اچھا امی۔۔۔ وہ کیسے؟“ فوزیہ مشتاق سی ماں کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔
 ”تو دیکھتی جا اور مجھے تو سچ میں آگ لگی ہے فوزیہ! عدیل کی ترقی کیا ہوئی، بشری نے کیسے بیٹی کی سالگرہ کا فنکشن اٹھا لیا۔ وہ بھی اتنے کھلے ہاتھوں سے۔ مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا اور نہ اس عدیل کو تو میں اچھی طرح سمجھا رہی تھی۔ بے وقوف کسے اپنا نقصان کیے جا رہا ہے بیوی کو سیٹ بھی لے کر دیا ہے۔ مجھے معلوم ہے؟“

”گیا؟ آپ کو کس نے بتایا؟“ فوزیہ کو جیسے کرنٹ لگا۔
 ”جانتی تھی میں۔ کل شام میں یوں ہی بشری کو چائے کا کہنے گئی تو عدیل آفس سے آیا ہی تھا اور بشری کو سیٹ کھول کر دکھا رہا تھا۔ دونوں نے مجھے نہیں دیکھا، گھر میں نے سب سن لیا، کیسے وہ بیوی کے گن گاتے ہوئے اسے تختہ دے رہا تھا جیسے قلو پطرہ ہو کہیں کی۔“

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

☆ تئلیاں، پھول اور خوشبو راحت جنیں قیمت: 225 روپے

☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 500 روپے

☆ محبت بیاں نہیں لبنی جدون قیمت: 250 روپے

شعار ہونگے ہیں

خوبصورت سرورق
خوبصورت چھپائی
مضبوط جلد
آفٹ ہو

شعار کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

”اور آپ نے مجھے بتایا تک نہیں۔“ فوزیہ بے حد رنج سے بولی۔
 ”میں خود حق دق رہ گئی تھی۔ تمہیں بتانی تو تم اور دل برا کرتی بلکہ میں نے کچھ دیر بعد خود ہی جا کر دونوں کو مبارکباد دے دی۔“ نسیم گہرا سانس لے کر بولیں۔
 ”امی! فوزیہ جیسے ابھی رو دینے کو تھی۔“
 ”پگلی! غم نہ کر۔ جو کڑے مرے آسے زہر نہیں دیتے۔“
 ”کیا مطلب؟“

”میں ابھی ہمارا وقت ہے۔ سمجھا کر۔“ نسیم اس کا ہاتھ دبا کر نرمی سے بولیں۔
 ”میں ابھی بھی نہیں سمجھی۔ کیا مطلب ہے آپ کی اس مصلحت پسندی کا بلکہ بزدلی کتنا چاہیے مجھے تو۔“
 فوزیہ تپ کر بولی۔

”تیرا رشتہ کہیں اچھی جگہ ہو جائے۔ دونوں کو آرام رکھیں گے تو تیرے رشتے کے لیے دوڑو دھوپ کرتے رہیں گے۔ آئے دن مہمانوں کی خاطر تواضع کے علاوہ تیرے لیے اتنا اعلا جینز بنا رہی ہوں تو اسی مصلحت پسندی کی وجہ سے یہ ضروری ہے بیٹا!“

”اچھا! آپ کے خیال میں اگر آپ اس بشری بی بی کے آگے پیچھے نہیں پھریں گی اس کی اور عدیل کی خوشامد نہیں کریں گی تو کیا وہ یہ سب نہیں کریں گے؟“

”کریں گے تب بھی نگرے دل اور بگڑے منہ کے ساتھ۔ اس سے آنے والوں پر اچھا اثر نہیں پڑے گا۔ اس بشری کو ہی آگے بڑھ کر ملنا ہوتا ہے۔ میں کبھی بیمار کبھی کچھ۔ ایسے میں بشری اور عدیل سے بنا کر رکھنا بہت ضروری ہے فوزیہ! نسیم نے سمجھایا۔

”آپ کریں اس کی خوشامد اور منتیں۔ مجھ سے یہ سب نہیں ہو سکتا۔ کیوں کریں یہ؟ میرا حق ہے یہ سب وصولنا۔ بشری بی بی کو ابھی جسد جسد آٹھ دن نہیں ہوئے اس گھر میں آئے اور وہ مالکن بن جائے اور ہم نوکر تو امی! ایسا تو میں ہونے نہیں دوں گی۔“ وہ غصہ میں بولتی بستر جا کر لیٹ گئی۔ نسیم بیگم نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر فوزیہ کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گئیں اور لیٹ کر تسبیح پڑھنے لگیں۔



چلو مشال! رکھو۔ باقی کے گفتگوں صبح کھول کر دیکھ لینا۔ بہت رات ہو گئی ہے۔ صبح پھر اٹھو گی نہیں تم جلدی! بشری مشال کے آگے بڑے گفتگوں ہٹاتے ہوئے بولی۔

”نہیں ماما! مجھے ابھی دیکھنا ہے سب۔ پلیز مجھے دیکھنے دیں نا!“ مشال متجسس نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”جان! بولا ہے نا صبح دیکھ لینا۔ اب بہت تاؤ ہو گیا۔ بابا بھی تھکے ہوئے ہیں۔ ہمیں بھی آرام کرنا ہے۔“ بشری سمجھاتے ہوئے تھکے تھکے اٹھا کر الماری میں رکھنے لگی۔

مشال منہ بنا کر بیٹھ گئی۔
 ”مجھے ابھی نہیں سونا۔ آپ دونوں سو جائیں۔“

”بری بات مشال! اب تم مجھ سے ڈانٹ کھاؤ گی؟“ بشری ذرا سختی سے بولی۔
 ”کوئی میری گڑیا کو ذرا سا بھی ڈانٹ کر دکھائے پاپا اچھی طرح چپٹ لیں گے اس سے۔ کیوں جان پاپا۔“ عدیل ہاتھ روم سے نکل کر مشال کو ساتھ لپٹاتے ہوئے پیار سے بولا۔

”حد ہے عدیل! لانا بیارگی بھی۔ اتنا نہ اسے سر جڑھائیں کہ پھر اتارنا مشکل ہو جائے۔“ بشری کچھ چڑ کر بولی۔
 ”کیوں اتاریں گے اسے ہم۔ ہماری آنکھ کا اتارنا ہے ہماری بیٹی۔“
 ”آئی لو پاپا۔“ مشال باپ سے چٹ کر پیار کرتے ہوئے بولی۔

”لو پوٹو جان!“ عدیل نے بھی اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔
 ”بس بھی کریں اب۔ تھک گئی ہوں میں صبح سویرے کی اٹھی ہوئی ہوں بارہ بجتے کو ہیں۔“ بشری کو غصہ آ گیا۔

”تو بھی آپ لیٹ جائیں نا بیگم صاحبہ! آپ کو کس نے منع کیا ہے۔ اب ہم اپنی پیاری سی بیٹی سے دو گھنٹی بات نہ کریں۔“ عدیل مشال کو اسی طرح ساتھ لگائے بیٹھا تھا۔
 بشری بیڈ پر جگہ بنا کر نیم دراز ہو گئی۔

”پاپا! ارادوں نے کتنی اچھی چین دی ہے۔“ مشال نے باپ کو چین دکھاتے ہوئے کہا۔
 ”اچھا تو کیا نانو کا گفتگو اچھا نہیں تھا؟“ بشری نے فوراً ٹوک کر کہا۔

”وہ بھی بہت اچھا ہے، ہے نانا پاپا!“ مشال جلدی سے بولی۔
 ”یہی نہیں! ہماری بیٹی بڑی ہو کر کہیں بیالی ٹیشن (سیاست دان) تو نہیں بنے گی؟“ بشری نے ہنس کر کہا۔

”جی نہیں! میری گڑیا کا دل بہت بڑا ہے سب سے پیار کرتی ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ اتنی چھوٹی سی عمر میں اسے احساس ہے کہ کسی کو ہرٹ نہیں کرنا اسی لیے تو مجھے اس پر اتنا پیار آتا ہے۔“ عدیل نے مشال کو پیار کیا۔
 مشال دیس لیٹ گئی۔

”مشال! جا کر اپنے بیڈ پر لیٹو بیٹا۔ ورنہ ہمیں سو جاؤ گی تو تمہیں بیڈ پر کون لٹا کر آئے گا۔“ اسے آنکھیں بند کرتے دیکھ کر بشری نے جلدی سے کہا۔

”میں لٹا آؤں گا۔ سونے دو اسے۔ اس کا دل چاہ رہا ہے آج پاپا کے پاس سونے کو۔“ عدیل مشال کے بال سمیٹتے ہوئے بولا۔

”پتا ہے عدیل! وہ اتنی شاکرہ آج کیا کہہ رہی تھیں۔“ بشری کو ایک دم یاد آیا۔
 ”کیا۔“ عدیل نے بے رہیانی سے کہا۔

”کہہ رہی تھیں ان کی زندگی بیٹی نے کسی گانا کا لوجسٹ کو دکھایا ہے۔ آٹھ سال ہو گئے تھے پہلے بچے کو۔ اب اس ڈاکٹر کے علاج سے دوبارہ اللہ کی رحمت ہوئی ہے۔ تم بھی اسی ڈاکٹر کو دکھاؤ جا کر۔ میں تمہیں اس کے کلینک کا بتاؤں گی اپنی منہ سے پوچھ کر۔ کہہ رہی تھیں مشال بڑی ہوئی جا رہی ہے۔ اس کا بھائی تو ہونا چاہیے نا کوئی۔“

”ہوں!“ عدیل نے جھمکی لی۔
 ”تمہارا دل نہیں چاہتا اب ہمارا دو سرا بچہ بھی ہو؟“

”کیوں نہیں چاہتا پاپا! اب اللہ کو منظور نہیں فی الحال تو کیا کریں اور ہمیں جو اللہ نے اتنا پیارا تحفہ دے رکھا ہے اس کی قدر کیوں نہ کریں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے عدیل! مگر اب دو سرا بچہ ہو جانا چاہیے۔ ای بھی آتے جاتے سب کو کہتی ہیں کہ مشال کو پیدا کر کے جیسے بشری نے تو دنیا فتح کر لی۔ دوسرے بچے کا نام نہیں لیتی۔ اب انہیں کیا بتاؤں میں۔ کتنا علاج کروایا ہے میں نے۔“ اس کی آنکھوں میں نمی سی آئی۔

”جان! تم کیوں پریشان ہوتی ہو۔ اللہ جانتا ہے ہمارے بارے میں سب۔ ہم نے کوئی علاج چھوڑا تو نہیں۔ اب اگر اس کے گھر میں ویرے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔“ عدیل اس کی آنکھیں صاف کر کے نرمی سے بولا۔

”ویسے میں نے شاکرہ اتنی سے ان کی منہ کا فون نمبر لے لیا ہے۔ کل کسی وقت فرصت میں فون کر کے ساری

تفصیل پوچھوں گی۔ اب ہمیں اور دیر نہیں کرنی چاہیے ورنہ تو بہت مشکل ہوتا جائے گا اور پتا ہے یہ مثال میری اسکول سے آکر جان کھائی ہے کہ اس کی سب فرینڈز کے بہن بھائی ہیں تو میرے کیوں نہیں۔ ہر بار اسے کہتی ہوں کہ آپ بس دعا کریں اللہ تعالیٰ سے تو وہ آپ کو بہن بھائی ضرور دے گا۔ بس تو الجھنے لگی ہے کہ ماں میں اتنے دنوں سے ہر وقت دعا کرتی رہتی ہوں پھر اللہ تعالیٰ میرا بھائی کیوں نہیں دے رہا۔ "بشری حسرت بھرے لہجے میں بولی۔

"ہو جائے گا بچہ بھی۔ فکر نہیں کرو تم۔ ایک ڈاکٹر کا مجھے سمجھنے بھی جایا ہے۔ اس سے مکمل معلوما لے کر وہاں بھی چلیں گے۔ اب سو جاؤ۔ بہت وقت ہو گیا ہے۔ صبح پھر اٹھا نہیں جائے گا۔" وہ لہجے سے بولا۔ بشری خاموشی سے کچھ سوچ رہی تھی۔

"کتنے پیسے چاہئیں آپ کو امی! عدیل نے چائے کا کپ رکھتے ہوئے ماں سے پوچھا۔ بشری نسیم بیگم کے آگے ناشتہ رکھ رہی تھی۔

"کم از کم دس پندرہ ہزار تو ہوں۔ تمہیں تو معلوم ہے آج کل کراچی کتنی مہنگی ہوتی ہے۔ ابھی تو دو سیٹ ہی لوں گی۔ باقی ڈائری سیٹ کی سیٹ وغیرہ بعد میں دیکھ لوں گی۔" نسیم بیگم تفصیل بتانے لگیں۔ عدیل بے چارگی سے بشری کی طرف دیکھنے لگا۔

"اب دیکھو نا! تھوڑا تھوڑا کر کے بنا رہی ہوں فوزیہ کے لیے میں پھر بھی ابھی کچھ نہیں ہوا۔ تھوڑے سے بستر بنے ہیں اور کچھ برتن۔ سونا ہی اتنا منگنا ہوا جا رہا ہے۔ میں تو کہتی ہوں تم مجھے تھوڑی تھوڑی رقم دیتے جاؤ تو بس ساتھ ساتھ تھوڑا زلیور بھی بنائی جاؤں گی۔ ایک دم نہیں رشتہ طے ہو گیا لافز پھر اور دوسرے ضروری سامان کے لیے اچھی خاصی رقم چاہیے ہوتی ہے۔ کھانا وغیرہ تو ایک طرف کیوں ہو؟" نسیم نے بشری سے تائید چاہی۔

"امی! ابھی تو دس ہزار نہیں ہیں میرے پاس۔" عدیل بہت مشکل سے بولا۔

"کیوں عین نے تو پچھلے ہفتے سے تمہیں کہہ رکھا تھا سالگرہ سے بھی پہلے کا۔" نسیم جتاتے ہوئے انداز میں تھل سے بولیں۔

عدیل سے فوری طور پر کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

"میں تو سمجھی تمہارے نزدیک میری بات کوئی ویلیور رکھتی ہوگی۔ تم سالگرہ کا خرچ نکال کر ماں کی کمی رقم انگل سے نکال رکھو گے مگر شاید تم بھول گئے تھے نا!" نسیم پھر سے جتا کر بولیں۔

عدیل نے اثبات میں سر ہلایا۔

"دیکھو عدیل بیٹے! برا نہیں ماننا۔ یہ سالگرہ جیسی مغربی رسمیں ہماری زندگی کا ضروری حصہ نہیں۔ اگر تم ایک سال بیٹی کی سالگرہ دھوم دھام سے نہیں مناؤ گے تو کچھ فرق نہیں پڑے گا لیکن اگر اکلوتی بہن کو تم خالی ہاتھ بھیجو گے تو دنیا ہمیں لعن طعن کرے گی ہی میری اس یتیم بیٹی کا جینا حرام کر دے گی۔ آج کو اس کا باپ زندہ ہوتا کیا اس کی شاوی کے معمولی خرچوں کے لیے مجھے یوں تمہارے آگے ہاتھ پھیلانے پڑتے۔" نسیم بیگم کی آواز زندہ ہوئی۔

"تم بھی تو باپ ہو بیٹی کے۔ کس چاؤ سے ہر سال اس کی سالگرہ مناتے ہو۔ آوہا شہر تو اس دفعہ بلا لیا۔ اس یتیم بچی کا باپ اگر زندہ ہوتا تو کیا اس کی خوشیاں نہ مناتا۔" وہ دوپٹا منہ کے آگے رکھ کر رونے لگیں۔ بشری کے چہرے

پر غصہ کے ساتھ ساتھ مخالفت بھی تھی۔ وہاں سے چلی گئی۔

عدیل نے والٹ نکال کر کچھ نوٹ نکالے۔

"امی! ابھی یہ سات ہزار ہیں۔ یہ رکھیں۔ باقی میں شام میں دے دوں گا۔ مجھے دیر ہو رہی ہے آفس سے۔ میں اب چلوں۔"

"تم ابھی یہ بھی اپنے پاس ہی رکھو بلکہ یوں کرو اپنی بیوی کو دے جاؤ اور اس سے کہو وہ خود جا کر نند کے لیے تھوڑے بہت برتن لے لے۔ جو اس غریب کے نصیبوں میں ہو گا اسے مل جائے گا۔ یہ نہ ہو میرا ہاتھ کھل جائے اور اس فضول خرچی کر آؤں تو تمہاری بیوی تمہیں خود سے قیمتیں بتانے لگے چیزوں کی اور تمہارا دل مجھ سے برا ہو جائے۔" نسیم نے پیسے اس کے آگے رکھ دیے۔

"امی! ایسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔ میں بشری کی باتوں میں کیوں آنے لگا اور آپ فوزیہ کو ساتھ لے جائیں۔ جو بھی خریدنا ہو اس کی پسند کا خرید لیں۔ میں کچھ دنوں میں آپ کو اور رقم بھی دوں گا۔ پھر آپ کو جو خریدنا ہو گا وہ بھی خرید لیجئے گا۔" عدیل ماں کا کندھا ہاتھ کر کر ممان کی جھولی میں رکھتے ہوئے سعادت مندی سے بولا۔

"اور وہ جو میں نے تم سے فوزیہ کے لیے سونے کے سیٹ کا کہا تھا؟" نسیم نے موقع غنیمت جان کر یاد دہانی کرائی۔

عدیل لہجہ بھر کو سوچ میں پڑ گیا۔

"یہ سالگرہ تو اچھی خاصی مہنگی پڑ گئی۔" وہ دل میں جھلا کر رہ گیا۔ "امی کو بھی سارے بھولے بسرے خرچ یاد آ رہے ہیں۔"

"وہ بھی ہو جائے گا۔ اب بس دعا کریں فوزیہ کا اچھی جگہ رشتہ ہو جائے۔ پھر دیکھیے گا میں ہر خرچہ کیسے ہنسی خوشی پورا کرتا ہوں۔ میری اکلوتی بہن کی خوشی ہے عین خیال نہیں رکھوں گا تو اور کون رکھے گا۔ اور پلیز! آپ اس طرح کی باتیں نہیں سوچا کریں۔ مجھے مشال بعد میں ہے فوزیہ پہلے ہے۔ اب انہیں رہے تو کیا ہوا عین جو ہوں سب کچھ کرنے کے لیے۔ آپ کوئی بھی ٹینشن نہ لیں ورنہ پھر آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔" وہ ماں کے پاس بیٹھ کر انہیں تسلی دیتا چلا گیا۔

اور کچھ میں کام کرتی بشری اجل بھن کر رہ گئی۔

"ایک نمبر کی ڈرا سے باز ہیں دونوں ماں بیٹی۔ مل کر بیٹے کو الو بناتی ہیں اور یہ عدیل ایسے بے وقوف بنتے ہیں جیسے ان دونوں کی چالاکیوں کو جانتے نہیں۔ دیکھ لوں گی میں بھی کیسے یہ دونوں ماں بیٹی اپنے منصوبوں میں کامیاب ہوتی ہیں۔" وہ ہنستا ہوا برتن دھونے لگی۔

"ٹھیک ہے امی! میں کوشش کروں گی شام میں آنے کی۔ اب عدیل کے آنے پہ ہے۔ اگر وہ جلدی آجاتے ہیں تو ہی میں اسکول کی نا! "بشری فون پر ذکیہ سے کہہ رہی تھی۔

"تو پتا لیا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ اگر تم کو تو میں عمران کو بھیج دیتی ہوں۔ وہ آفس سے آتے ہوئے تمہیں اور مشال کو یک کر لے گا۔ رات کا کھانا میری طرف ہی کھانا۔ عدیل بھی بعد میں آجائے گا۔" ذکیہ محبت سے بولیں۔

"نہیں امی! آپ کو پتا تو ہے ورنہ ڈیز میں عدیل کو رات دیر تک باہر رہنا بہت ناپسند ہے۔ پھر ان کی اماں جان ہیں یوں بولا۔ جا میں گی جیسے عدیل دودھ پیتا بچہ ہو اور اسے صبح اسکول جانے سے دیر ہو جائے گی۔" بشری چڑھے ہوئے لہجے میں بولی۔

رہا ہے نا۔ یوں محبت نہیں دکھائے گی تو کیا اس عمر میں بیٹے کو ہاتھ سے گنوائے گی۔ ”ذکیہ تمسخرانہ لہجے بولیں۔“

”ٹھیک کہتی ہیں امی! یقین کر سکتے ہیں پینترے یہ دونوں ماں بیٹی بدلتی ہیں عدیل کو مٹھی میں کرنے کے لیے عین آؤں گی تو ہاتھوں کی۔“ بشری دھکی لہجے میں بولی۔ اسے صبح والا منظر یاد آ گیا تھا۔

”میری بچی! میں جانتی ہوں تم کیسے ان دونوں چلتروں کے درمیان گزارہ کر رہی ہو۔ یہ تمہارا صبر ہی تو ہے جو تمہیں شوہر کے دل کی ملکہ بنائے ہوئے ہے ورنہ کوئی اور ہوتی تو دوسرے دن عدیل کو ان ماں بیٹی کا اصل چہرہ دکھا کر کہیں الگ گھر لے چکی ہوتی۔“ ذکیہ بیٹی سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے بولیں۔

”پھر تم آ رہی ہوناں شام میں؟“ انہیں پھر سے فون کرنے کا مقصد یاد آیا۔

”دیکھو! بڑی اچھی لڑکی ہے۔ بڑھی لکھی مگر ہمتن اور سب سے بڑھ کر خوب کھاتے مٹے لوگ ہیں اور خاندان بھی نیک شریف۔ اب بتاؤ اور کیا چاہے۔ ایسی لڑکی کو تو ہاتھ سے نہیں نکلنا چاہیے بشری! آ“

”وہ امی! آپ کی بات ٹھیک ہے مگر مجھے پہلے عدیل کو فون کر لینے دیں۔ پتا نہیں وہ مانتے بھی ہیں یا نہیں۔“

”اتنا بھی عدیل کی مرضی پر نہ چلو کہ تمہاری اپنی کوئی خوشی ہی نہ رہے۔ ظاہر ہے اب بھائی کے لیے تم تھوڑی دوڑ دھوپ نہیں کرو گی تو اور کون کرے گا۔ ابھی تو میری ہڈیاں کچھ کام کر رہی ہیں تو میں ساتھ لگی ہوں۔ کل کو خدا نخواستہ مجھے کچھ ہو گیا تو۔“

”امی! پلیز ایسی باتیں نہیں کریں۔ اللہ آپ کو ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ میں عدیل کو فون کر کے کہتی ہوں کہ میں عمران کے ساتھ جا رہی ہوں امی کی طرف سوہ رات میں مجھے آکر لے جائیں۔ ٹھیک ہے نا۔“ بشری کو شاید ماں کی بات بڑی لگی کہ عدیل کے آگے اس کی ذرا سی بھی مرضی نہیں چلتی۔

”بالکل صحیح۔ اور سنو! اپنا وہ سالگرہ والا سوٹ پس لینا اور سیٹ بھی وہی جو عدیل نے تمہیں بنا کر دیا ہے۔ ذرا لڑکی والوں پر اچھا امپریشن پڑے گا۔ ماشاء اللہ سالگرہ میں میری بچی اتنی پیاری لگ رہی تھی اور وہ فوزیہ۔ جیسے دس سالوں کی بیٹی ہی ہوئی۔ شکل سے ہی دیکھا پن جھلکنے لگا ہے اب تو۔ کہیں اس کے رشتے کی بات چلی؟“ ذکیہ نے کرید۔

”لگی تو ہوئی ہیں دونوں۔ آئے دن رشتہ کرانے والیوں کی جیبتیں گرم کرتی رہتی ہیں۔ پھر بھی بات نہیں بن رہی اس کی شادی تک عدیل کو کنگال کر دیں گی دونوں۔“

”اللہ نہ کرے۔ چلو! تم تیار ہی کرو۔ میں عمران کو فون کر کے کہہ دیتی ہوں۔“

”مشال سو رہی ہے۔ میں اٹھاتی ہوں ابھی اللہ حافظ۔“ کہہ کر فون بند کر کے وہ سوئی ہوئی مشال کو دیکھتے لگی۔

”نہیں یار! یہ بہت مشکل کام ہے۔ تمہیں پتا ہے گھر آنے کے بعد میرا کہیں اور جانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ تم آئی سے کہتیں کہ وہ یہ سلسلہ کسی اور دن کے لیے اٹھا رکھتیں۔“ عدیل آفس میں کام کر رہا تھا جب بشری کی کال آئی تھی۔

”عدیل! میں نے پہلے ہی امی سے یہ بات کی تھی کہ آپ کو دو رنگ ڈیز میں اتنی دیر تک گھر سے باہر رہنا پسند نہیں مگر امی بے چاری بھی مجبور ہیں۔ لڑکی بہت اچھی ہے اور رشتہ کرانے والی آئی تیار ہی تھیں کہ اس کے دھڑا دھڑرتے آرہے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ ہمیں دیر ہو جائے۔“ بشری نے اسے صورت حال کی سچائی بتائی۔

”اب ایسی بچی آگ نہیں لگی کہ دو تین دن میں اس کا رشتہ ہی کہیں ہو جائے۔“ عدیل بے زاری سے بولا۔

”عدیل! آپ کو میرے ساتھ نہیں چلنا تو صاف انکار کر دیں۔ ظاہر ہے آپ کو آپ کی امی کچھ کہیں گی تو ان کو تو آپ انکار نہیں کر سکیں گے، لیکن جو میں کہوں گی وہ ایک دم فضول بیکار بے معنی ہوتا ہے آپ کے نزدیک بشری! پھٹ پڑی اور آواز بھی رندہ گئی۔“

”بھئی! میرا یہ مطلب تھوڑی تھا۔۔۔ چلو ٹھیک ہے! تم عمران سے کہو وہ آکر تمہیں لے جائے ورنہ مجھے آفس میں اگر دیر ہو گئی تو۔“

”آب نیشن نہیں لیں۔ وہ غریب ہی مجھے واپس ڈراپ بھی کر جائے گا۔ ظاہر ہے اس کا کام ہے تو سزا بھی وہ ہی بھگتے گا آسنے جانے کی۔ آپ اپنا کام کریں۔ میں چلی جاؤں گی اللہ حافظ۔“ اس نے ناراضی سے کہہ کر فون بند کر دیا۔

”میرے تو کوئی وقعت ہی نہیں ہے۔ ان عدیل صاحب کی نظروں میں۔“ بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گئی۔



بشری نے تیار ہو کر آئینے پر نظر ڈالی اور مطمئن ہو کر مسکرائی۔ تب ہی مشال خوب صورت فراک پننے اپنی گڑیا ہاتھ میں پکڑے چلی آئی۔

”مما! میں اسکول بیگ بھی لے لوں۔ اگر ہمیں نانو کی طرف رات رہنا ہو تو؟“ وہ بھی ماں کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”ارے نہیں داوی! ماں! ہم رات رہنے نہیں جا رہے۔ رات میں ماموں ہمیں واپس چھوڑ جائیں گے۔“ بشری جلدی سے اپنا ہینڈ بیگ چیک کرنے لگی۔

”مما! یوں سو پریشی۔“ وہ بے اختیار ماں سے لپٹ کر بولی۔

”میری جان! تھینکس۔۔۔ یو ٹو ویری پری ماں لو۔“ بشری بھی بیٹی کو بہا کر کرنے لگی۔

”مما! اپنا نہیں آئیں گے نانو کی طرف؟“ اسے ماں کی بات یاد آئی تو پوچھنے لگی۔

”بیٹا! آپ کے بابا کا موڈ ہوا تو آجائیں گے ورنہ ہمیں ماموں ڈراپ کر جائیں گے۔ تم نے ہوم ورک مکمل کر لیا تھا نا مشال؟“

”لیس مام! بس ٹیسٹ واپس آکر ایک بار دہرا کر لوں گی۔ میتھس کا ٹیسٹ ہے کل۔“ مشال سر ہلا کر بولی۔

”چلو! پھر تو ٹھیک ہے۔“ فون بجنے پر اس نے فون اٹھاتے ہوئے کہا۔ ذکیہ کا فون تھا۔

”عمران! ابھی آ رہا ہے تمہیں لینے کے لیے اس کا فون آیا تھا کہ امی! میں نکلنے لگا ہوں تو آپ بشری اپنی کال کو فون کر کے بتا دیں۔ تم تیار ہو گئی ہوناں بشری!“

”جی امی! میں بالکل تیار ہوں اور مشال بھی۔ مشال چلے گی نانو کی والوں کی طرف ہمارے ساتھ؟“ اسے جیسے یاد آیا۔

”ہاں! چلی چلے گی یاد دل کرے گا تو ماموں کے پاس ہی رک جائے گی۔“ ذکیہ بولیں۔

”چلیں! پھر میں آئی ہوں تو بات کرتے ہیں اللہ حافظ۔“ بشری نے فون بند کر کے آخری بار اپنا جائزہ لیتے ہوئے دوڑا اٹھایا۔

”ہمیں کہاں جانا ہے نانو کی طرف جا کر؟“ مشال ماں کی تیاری کو ٹھنکی باندھ کر دیکھے جا رہی تھی۔

”عمران ماموں کی رہنمائی دیکھتے۔ چلوگی ہمارے ساتھ؟“ بشری اس کے گال پر ہلکی سی چٹکی کاٹ کر بولی۔

”میں تو ضرور جاؤں گی۔“ وہ فوراً تیار ہو گئی۔

”اور ماموں کے پاس گھر میں نہیں رکوگی؟“ بشری نے کہا۔

”جی نہیں! میں دکن دیکھنے جاؤں گی۔ اب چلیں نا ممما!“ وہ بے چین ہو کر بولی۔

”ہاں! چلو ماموں آتے ہی ہوں گے۔“ وہ مشال کو ساتھ لے کر باہر نکلی۔

”ٹھیک ہے! فکر کی کوئی بات نہیں۔ دو گھنٹے تو ابھی ہیں نا۔ تم انہیں کتنا لوادو۔ میں سب انتظام کر لیتی ہوں۔“ نسیم کسی سے فون پر بڑے استہناک سے بات کر رہی تھیں۔

”اچھا۔ یہ تو اچھی بات ہے۔ تم لے آؤ انہیں۔ ہم انتظار کر رہے ہیں۔“ وہ برجوش لہجے میں بولیں۔
 ”ہاں ہاں! فکر ہی نہ کرو۔ اس بار جو کچھ تم بتا رہی ہو۔ تمہارے منہ میں کبھی شکر۔ کسی نہیں ہوگی دیکھنا! میری طرف سے کچھ بھی۔ بس تم سنجھے کی کرو اللہ حافظ۔“ نسیم نے برجوش انداز میں فون بند کر دیا۔
 اور کچھ بولتے ہوئے بشری کے تیار چلنے کو دیکھ کر لہجہ بھر کو جیسے گنگ سی ہو گئیں۔

”داؤ! ہم ماموں کی دلہن دیکھنے جا رہے ہیں۔ میں بھی جاؤں گی ماما اور نانو کے ساتھ۔ میں اچھی لگ رہی ہوں نا اس فراک میں داؤ!“ مشال فوراً ”داؤی کی گود میں بیٹھ کر لاؤ سے بولی۔

”داؤ کی جان پری لگ رہی ہے کہیں نظر نہ لگ جائے۔“ ”داؤی فوراً پوتی کا منہ چوم کر بولیں۔
 ”وہ ای! میں ذرا امی کی طرف جا رہی تھی۔ عمران مجھے لینے آ رہا ہے۔ عمران کے لیے کوئی لڑکی دیکھنے جا رہے ہیں ہم۔“ بشری نے سنبھلے ہوئے لہجے میں رک رک کر کہا ”کیونکہ نسیم کی کچھ دیر پہلے ہونے والی فون پر بات چیت اسے کچھ کھٹک سی گئی تھی۔

”کسی سے پوچھنے بیٹا نے یا اجازت لینے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی تم نے؟“ نسیم کیٹیلے لہجے میں اس پر سخت نظریں گاڑ کر بولیں۔
 ”وہ امی! میں نے عدیل کو بتا دیا تھا۔“

”تمہارے خیال میں اس گھر میں صرف عدیل رہتا ہے؟“ وہ کڑے لہجے میں بولیں۔

بشری کچھ لاجواب سی ہو کر رہ گئی مشال کبھی ہاں کو دیکھتی کبھی ”کبھی داؤی کو۔“

”داؤ آپ۔۔۔“ اس نے داؤی کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

”جاؤ! تم اندر جا کر کمرے میں کھیلو۔“ داؤی نے اسے جھڑک دیا۔

مشال کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔

”مشال! آپ روم میں چلو۔“ بشری اسے اشارہ کر کے بولی۔ وہ ست قدموں سے اندر چلی گئی اور دروازے کے پاس رک کر دیکھنے لگی۔

”امی! میں رات کو جلدی آ جاؤں گی۔ عمران ہی مجھے ڈراپ کر جائے گا۔“ وہ لہجے کو کچھ نرم کر کے بولی۔

”اب تم سے واپسی کی کون بات کر رہا ہے؟ میں تو ابھی یہ تمہارے جانے کی بات کر رہی ہوں۔ تم مجھے بتائے بغیر جا رہی تھیں۔ یہ حیثیت ہے تمہاری نظریں میری؟“ نسیم کرکٹ کر بولیں۔

”نہیں امی! یہ بات نہیں۔ میں نے عدیل۔“

”ایک عدیل ہی نہیں ملا؟ معصوم کاٹھ کا لالو، موم کی ناک جدھر چاہتی ہو کھمکتی ہو۔ ہم تو بھیا نہ تین میں نہ تیرہ میں۔ تم ہمیں کیوں نہ جوتے کی نوک پر رکھو گی۔“ حصم کے سر پر ہوساس نند جائے جنم میں۔“ نسیم تو بھڑک ہی اٹھیں۔

بشری گھبرا گئی۔ اسے ساس کے اتنے سخت رد عمل کی توقع نہیں تھی بلکہ اسے یقین تھا کہ عدیل پہلے سے فون کر کے ماں کو اس کے جانے کا بتا چکا ہو گا۔

”امی! یقین کریں میں نے عدیل سے پوچھا اور یہ بھی کہا کہ آپ سے اجازت لے لیتی ہوں تو وہ کہنے لگے کہ امی سے میں خود بات کر لیتا ہوں۔ تم چلی جاؤ۔“ اس نے اپنے دفاع کے لیے فرانسے سے جھوٹ گھڑا۔

”امی مٹی کی مادھو! اللہ میاں کی گائے جس کو نہ پٹا کسی شمار میں سمجھے نہ ہو کسی گنتی میں رکھے۔ اٹھے چھیل

جھیلے تیار ہوئے۔۔۔ کپڑے، جھیکے، چوڑیاں چڑھائیں۔ میک اپ تھوپا۔ ڈور منہ اٹھا کر چل پڑے۔ گھرنے پو عیا سرانے ہو گیا۔ جس کا نہ کوئی طور طریقہ نہ قانون۔“ نسیم نے جیسے آج ہی سارے بدلے لینے کی ٹھان لی تھی۔ بشری کو صاف نظر آ گیا اس کا گھر سے جانا مشکل ہی نہیں، ناممکن بھی ہے۔

”امی! میں جاؤں پھر بار لڑ؟ میں نے شفق کو فون کر کے بلوایا ہے۔ وہ آرہی ہے میرے ساتھ جانے کے لیے۔ اسے بھی کچھ کام کروانا ہے اپنی اسکن کا۔“ فوزیہ تیار چلیے میں عجلت بھرے انداز میں ماں کے پاس آ کر بیگ اندر بٹھرتے ڈالتے ہوئے بولی۔

”دو گھنٹے میں آرہے ہیں وہ لوگ۔ تمہیں اس سے پہلے گھر پہنچنا ہو گا۔“ نسیم لہجہ بدل کر بیٹی سے متفکر لہجے میں بولیں۔

”امی! فکر نہ کریں، مائی لک“ ”والی شفق کی دوست ہے۔ وہ پہلے میرا ہی فیصل کرے گی۔ شفق نے اس سے بات کر لی ہے۔“ فوزیہ ماں کو تسلی دیتے ہوئے بولی۔

”اور یہ جھاڑ جھنکار سے بال بھی سیٹ کر دینا، مگر نام کا خیال رکھنا۔“ ”ثریا انہیں دو گھنٹے میں لے کر پہنچ جائے گی۔ تم یوں کروناں اپنے کپڑے بھی ساتھ لے جاؤ۔ وہیں سے تیار ہو کر آ جانا۔“ نسیم کو خیال آیا۔

”ہاں! کپڑے تو میں نے رکھ لیے ہیں۔ وہیں سے تیار ہو آؤں گی۔ آپ مجھے بسے تو دے دیں جلدی سے۔“ وہ کچھ کوفت سے بولی۔ اس دوران میں اس نے بشری کی طرف ایک بار بھی نظر اٹھا کر دیکھنے کی زحمت کی نہ اسے درخور اعتنا ہی سمجھا۔

بشری کسی مجرم کی طرح سزا کی منتظر دونوں کی گفتگو ختم ہونے کے انتظار میں کھڑی تھی۔

نسیم نے صبح والے عدیل کے لیے نوٹوں میں سے چار ہزار نکال کر فوزیہ کو دیے۔

”کافی ہیں نا یہ؟“ نسیم بیٹی کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”امی! احتیاطاً پانچ ہی دے دیں۔ آج کل روز تو ہر چیز کا ریٹ بڑھا ہوتا ہے۔“

ماں نے سہلا کر ہزار روپیہ اور تھما دیا۔ تب ہی باہر مارن بجا۔

”عدیل اس وقت گھر آ گیا کیا؟“ نسیم کچھ تشویش سے بولیں۔

”وہ امی! عمران ہے۔ مجھے اور مشال کو لینے آیا ہے۔“

”تو جاؤ! کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہو میرا۔“ وہ کرختگی سے بولیں۔

”وہ امی۔۔۔ آپ کی اجازت ہے نا؟“

”جوتی اٹھا کر میرے سر پر مارو۔ میری کیا مجال تمہیں روک سکوں۔“ نسیم زور سے بولیں۔ ”میں بیوہ، میری بچی نسیم۔ تم میاں بیوی کے ٹکڑوں پر بڑے ہیں۔ اللہ نے خوشی کا موقع دکھایا۔ میری بچی کا رشتہ ہونے جا رہا ہے اور بھنڈن صاحبہ بن نخن کر بھیا کے لیے لڑکی پسند کرنے جا رہی ہیں۔ انہیں اس نسیم نند کے رشتے کی کیا پروا۔ دو گھنٹے بعد مہمان آنے والے ہیں۔ میں بڑھیا خود ہی اٹھوں گی اور چائے چڑھا لوں گی۔ وہ ہی خالی رکھ دوں گی ان کے گھر۔ اس کے بعد میری بچی کے نصیب رشتہ ہوتا ہے یا نہیں۔ تم جاؤ بی بی! تمہارے ہاتھ سے بھیا کا رشتہ نہ ٹٹل جائے۔“ نسیم پٹے کے پلو سے آنکھیں مسلنے لگیں۔



”کتنی باتیں سنائی ہیں مجھے عمران نے گھر آ کر۔ غریب دفتر سے جلدی اٹھ کر تمہیں لینے گیا۔ رستے میں زمانے بھر کی ٹینک و محل مٹی کھا تا گیا اور تم نے دروازے ہی سے اسے موڑ دیا۔ شاباش بھی! اچھا کیا بہت۔“ ذکیہ فون

پر غصے میں بشریٰ کو سنا رہی تھیں۔
 ”آپ بھی مجھے ہی سنائے سیم آئی نے جو کسر چھوڑ دی وہ آپ بھولی کر دیں۔ آج انہوں نے جو سلوک میرے ساتھ کیا ہے۔ اگر میں آجاتی آپ کی طرف تو امی! وہ مجھے ہمیشہ کے لیے آپ کے گھر بٹھا دیتیں۔ اتنے غصے اور طیغ میں میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔“ بشریٰ روہا سی ہو کر بولی۔
 ”بس یوں ہی چوبیس برس کر سسرال والوں کی جوتیاں سیدھی کرتی رہنا۔ مجھے کس شرمندگی سے لڑکی والوں کو بڑا کروانا پڑا۔ عمران کی باتیں سنیں۔ ماں کی عزت کی کوئی پروا نہیں تمہیں۔“
 ”امی! بس کریں میں پاگل ہو جاؤں گی۔ پہلے ساس صاحبہ نے بھگلو بھگلو کر جوتیاں ماریں مجھے اور اب آپ شروع ہو گئی ہیں۔ ابھی وہ عدیل صاحب آئیں گے تو امی ان کے کان بھریں گی اور وہ آکر مجھ پر چلانا شروع کر دیں گے۔ میں تو جیسے انسان ہی نہیں ہوں۔ نہ میری کوئی عزت نہ عزت نفس جس کا جو جی چاہتا ہے سنا ڈالتا ہے۔ آپ کو جلدی ہے تو عمران کو لے جائیں ساتھ اور اسی کو لڑکی پسند کرالیں۔ شادی بھی تو اسی کی ہوتی ہے۔ اسے ہی لڑکی پسند کروائیں۔ خدا حافظ۔“ اس نے روتے ہوئے فون بند کر دیا۔
 ”مما! دادو کہہ رہی ہیں پکن کون دیکھے گا آکر۔ مہمان آنے والے ہیں۔“ مشال اندر آکر ماں سے بولی۔
 ”وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے روتی رہی۔
 ”مما! آپ رورہی ہیں؟“ مشال سمجھے ہوئے لہجے میں بولی۔
 ”نہیں! قہقہے لگا رہی ہوں۔ اندھی ہو، نظر نہیں آتا تمہیں؟“ وہ الٹا اسے جھٹک کر بولی۔ مشال اور بھی سمجھتی۔
 ”مما۔۔۔ آپ مجھ سے غصہ ہیں؟“ وہ بڑی بڑی سنہری آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔
 ”مما کی جان! میں۔۔۔ آپ سے غصہ نہیں ہوں۔ اپنے نصیبوں کو رورہی ہوں۔ اپنی جان سے میں کیوں غصہ ہوں گی۔ مت رو میں آپ۔“ وہ فوراً ”ترب کر مشال کو اپنے ساتھ لگا کر بولی۔
 ”آپ بھی تو رورہی ہیں۔ دادو نے آپ کو ڈانٹا ہے نا اس لیے۔“ مشال پھوٹے پھوٹے ہاتھوں سے ماں کے آنسو صاف کرنے ہوئے بولی۔
 ”میں بیباک جوتیاں لگی کہ دادو نے آپ کو تانوں کی طرف نہیں جانے دیا۔“
 ”تمہارے پھر دل باپ پر کیا اثر ہوتا ہے۔ وہ پہلے کون سا راضی تھے کہ میں ادھر جاؤں۔ انہیں تو خوش ہی ہونا ہے کہ نہیں گئی۔ اس گھر کے لیے میں اپنی جان بھی دے دوں تو بھی انہیں احساس نہیں ہو گا۔ یہ ہی کہیں گے میری نیت میں کھوٹ ہے۔“
 ”کیا ہوا بھئی! یہ کیا ہو رہا ہے؟ بن بادل سا دن کیوں برس رہا ہے؟“ عدیل خوش گوار موڈ میں کمرے میں داخل ہوا۔ بشریٰ کو روتے دیکھ کر ہنس کر بولا۔
 ”ارے! تم تو واقعی رورہی ہو۔ کیا ہوا بشریٰ؟“ وہ پاس آکر اس کا ہاتھ تھام کر تشویش سے بولا۔
 ”بشریٰ نے اس کا ہاتھ جھٹکا اور باہر نکل گئی۔
 ”مشال جانو! ما کو کیا ہوا؟“ عدیل پریشان ہو کر بولا۔
 ”دادو نے ڈانٹا ہے۔“ مشال کچھ ڈر کر بولی۔
 ”وہ کیوں؟ لڑائی ہوئی ہے؟“ عدیل چونکا۔
 ”نہیں! مہمانے تو لڑائی نہیں کی۔ ہم تو تیار ہو کر تانوں کی طرف جا رہے تھے، ماموں کی دلہن دیکھنے۔ ماموں ہمیں لینے بھی آگئے تھے۔“

”پھر مجھے نہیں تم لوگ؟“
 ”دادو نے مما کو زور زور سے ڈانٹا اور کہا کہ بے شک چلی جاؤ۔ واپس بھی اپنی مرضی سے آنا اور پتا نہیں کیا۔“
 ”اب۔۔۔“ اور رک رک کر بولی۔
 ”عدیل تم صم سا ہو گیا۔“
 ”اب۔۔۔ اب ہم تانوں کی طرف نہیں جائیں گے کیا؟“ وہ باپ کا کندھا ہلا کر بولی۔
 ”بتاؤ کا ذرا آیا تھا؟“
 ”ہاں! مہمانوں پر بات کرتے ہوئے رونے لگیں کہ سب ان ہی کو ڈانٹ رہے ہیں۔ تانوں بھی اور دادو بھی۔ سب مما کو کیوں ڈانٹ رہے ہیں بیبا؟“ وہ باپ کی پریشان شکل دیکھ کر پوچھنے لگی۔
 ”نہیں بیبا! کوئی نہیں ڈانٹ رہا! نہیں۔“
 ”بیبا! آپ پریشان ہیں؟“
 ”نہیں میری جان! میں کیوں پریشان ہوں گا۔ پھوپھو کہاں ہے تمہاری؟“ وہ یوں ہی مسکرا کر بولا۔
 ”پتا نہیں! شاید اپنی کسی دوست کے ساتھ گئی ہیں۔ تیار ہونے کا کہہ رہی تھیں۔“
 ”عدیل تم صم سے انداز میں جھک کر جوتے اتارنے لگا۔



اس بار آنے والے مہمان واقعی مبارک ثابت ہوئے تھے۔
 انہوں نے فوزیہ کو پسند کر لیا۔
 کمال شاید فوزیہ کے خوب اچھے سے تیار ہونے کا تھا یا واقعی وہ انہیں اچھی لگی تھی۔ فوزیہ کی ہونے والی ساس اور بیبا ہی زندہ محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھیں۔
 ”یہ سنگن کے میسے ہیں، سن جی! انکار نہیں کیجئے گا۔“ انہوں نے دو ہزار روپیہ فوزیہ کے ہاتھ پر بخوشی رکھ دیا۔
 نسیم اور عدیل پر تو جیسے شادی مرگ طاری ہو گیا۔
 ”کہاں باجی! چھ سالوں سے فوزیہ کا رشتہ ہی نہیں ہو رہا تھا اور کہاں ایک دم سہم۔ نسیم کی سمجھ میں نہ آیا کہ فوراً کیا بولیں۔“
 ”نہیں سن جی! یہ ابھی رہنے دیں۔ ہم آئیں گے نا تو۔۔۔“ وہ بدقت کاغیٹی آواز میں بولیں۔
 ”آپ آئیں گی تو تب اپنی خوشی پوری کیجئے گا، لیکن ہمیں نہیں روکیں۔ ہمیں تو آپ کی بیٹی پیاری ہی اتنی لگی ہے کہ جی چاہتا ہے، ابھی اسے اپنے گھر لے جائیں ہمیشہ کے لیے۔“ فوزیہ کی ہونے والی ساس اسے ساتھ لپٹا کر بولیں۔ فوزیہ اور نسیم کا چہرہ خوشی سے دکنے لگا۔
 ”پھر آپ کب آرہی ہیں ہماری طرف؟“ انہوں نے نسیم سے پوچھا۔
 ”جب آپ کہیں۔ اس ویک اینڈ پر ٹھیک رہے گا عدیل۔۔۔ بشریٰ؟“
 ایک دم نسیم کو خیال آیا کہ بسو بیٹے کی شمولیت تو اس معاملے میں سب سے زیادہ ضروری ہے۔ جس کا نزو ٹھا چہو آج سب کو بہت کچھ کہہ رہا تھا۔ مگر پھلا ہو فوزیہ کی ساس کی کمزور نظر کا یا اسے فوزیہ کے آگے اور کچھ نظر ہی نہیں آیا کہ اس نے بشریٰ کے خفا چہرے کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔
 ”ٹھیک ہے امی! جیسے آپ کہیں۔“ عدیل فوراً بولا۔
 ”اٹا اللہ! سن جی! بہت سعادت مند بیٹا اور ہو ہے میری۔ میری تو دعا ہے اللہ سے سب کو ایسی سعادت مند

اولاد ہے۔ ایسی نیک طبیعت میری فوزیہ کی بھی ہے۔ سارا وقت یا تو گھر داری کرتی رہے یا پھر نماز، قرآن، تیر کوئی مشغل ہے ہی نہیں اس کا۔ نہ لی وی کے بے ہودہ ڈرامے نہ کوئی فیشن کی بیماری۔ میرا تو مجھو! سارا گھرا پختی نے سنبھال رکھا ہے۔ بھانج اور اس میں ایسا دوستانہ ہے۔ بس! کوئی غیر آئے تو وہ دیکھ کر مانے ہی نہ کہ یہ بھانج ہیں جیسے دو سہیلیاں ہوں یا دو بہنیں۔ ایسی بھلی مانس طبیعت ہے میری، ہو اور یہی کی۔" نسیم نے ایک سے دو شکار کے بلکہ تین شکار۔

بشری کا دل جیتنے کی ناکام کوشش کہ ابھی تو وہ فوری طور پر ساس کے اس دورے سے سخت بدل تھرا شوہر کی وجہ سے بہت سنبھلی ہوئی بیٹھی تھی اور فوزیہ اس کی دوست، سہیلی بہن۔

اس کا جی چاہا زور زور سے ہنسنے لگے۔ اس کی ساس جھکتی ہے کہ ساری دنیا کی آنکھیں خراب ہیں یا ان میں موتیا اترا ہوا ہے جو انہیں اس نند بھانج کے رشتے میں ایسا پارو رکھے۔

"ہونہ! دو علی عورت کے۔" بشری کے دل میں کھولن بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ساری طرف فوزیہ کی ہونے والا ساس تو جیسے فوزیہ پر اور بھی والہ و شیدا ہونے لگیں۔ پسٹ پسٹ کر اسے خوب پیار کرنے لگیں۔

"منافق عورتیں۔" وہ کڑھتی ہوئی اٹھ کر چائے کے برتن سمٹنے لگی۔ نسیم اور فوزیہ کی ساس کے درمیان اگلی تفصیلات طے ہونے لگیں۔

رشتہ کرانے والی کے چہرے پر بھی خوشی کے مارے جیسے ہزاروں کالمب جگمگا اٹھا تھا۔ اس کی سات سالوں محنت بر آنے لگی تھی۔ دونوں طرف سے خوب ملنے کی آس جو بندھ گئی تھی۔

"اور میرے بھائی کی خوشیاں کیسے اس عورت نے خاک میں ملا دیں۔ ہم لڑکی دیکھنے بھی نہ جاسکے۔ مطلبی، غرض بے حس لوگ۔" وہ لیکن میں برتن پھینچ کر رکھنے لگی۔ مثال ذرا ذرا دیر بعد کبھی آکر ماں کو دیکھ جاتی اور کبھی ڈرائنگ روم میں باپ کے پاس جا کر گود میں چڑھ جاتی۔

"دادی اور پھوپھی کا موڈ خوش گوار ہوتے ہی پاپا بھی کسے چکنے لگتے ہیں۔" وہ باپ کی خوشی میں کھکتی آواز پر شوق انداز میں سننے لگی اور کبھی کھلتی جھاکر باب کا چہرہ دیکھنے لگتی۔ اسے اپنے باپ کو دیکھنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"پاپا ایسے بات کرتے کتنے اچھے لگتے ہیں۔ ہنس بھی نہیں رہے اور لگ رہا ہے جیسے ابھی ہنس پر ہیں گے۔ اتنے خوش تو وہ صرف ماما کے ساتھ ہوتے ہیں جب دونوں رات کو ویک اینڈ پر فارغ ہو کر خوش گوار موڈ میں باہر کرتے ہیں مگر آج تو لگتا ہے دونوں میں خوب لڑائی ہوگی۔ ماما کا موڈ سخت آف ہے۔ وہ آسانی سے تو پاپا سے بات نہیں کریں گی لیکن پاپا کو بھی انہیں منانا آتا ہے۔ میں پاپا کا ساتھ دوں گی۔ ہم دونوں جلدی سے ماما کو راضی کر لیں گے۔" وہ باپ کے چہرے کو دیکھ کر سوچتی چلی گئی۔

"اب غصہ جانے دو بشری! یقین کرو۔ میں ان کو فون کر کے بتانے ہی والا تھا تمہارے جانے کے بارے میں کہ پاس نے اچانک اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہیں کھٹے بھر کی میٹنگ ہو گئی اور باہر نکلا ہوں تو آف ہونے ہی والا تھا۔ یقین کرو! میں تو تمہیں لینے کے لیے آنے والا تھا۔" عدیل مسلسل اس کی منتیں کیے جا رہا تھا۔

"مجھے نیند آ رہی ہے۔ پلیز! مجھے تنگ نہیں کریں۔ سونا ہے مجھے۔"

"اچھا! سو جانا مگر پہلے مجھ سے بات تو کرو۔" عدیل اس کے اوپر سے چادر کھینچ کر بولا۔

"بات کر تو رہی ہوں اور کیسے بات کروں۔" وہ پھر سے چادر کھینچ کر غصہ میں بولی۔

"اس طرح بات کرتے ہیں کیا؟"

"اور کس طرح بات کرتے ہیں؟ اب آپ بات کرنا سکھائیں گے مجھے؟ آپ کی والدہ صاحبہ نے جی بھر کر میرا کلاس لیا۔ اب آپ مجھے پڑھائیں۔ چھوڑیں مجھے۔" وہ پھر سے چادر کھینچنے لگی۔

"اچھا! اگر کل میں آفس سے آف کر لوں اور تمہیں صبح ہی آئی کی طرف لے چلوں پھر تو راضی ہو جاؤ گی نا؟" عدیل نے آخری حربہ آزمایا۔

"مجھے اب کہیں نہیں جانا۔ امی کی طرف تو اب کبھی نہیں۔ آپ کو چھٹی کرنی ہے تو سوار کریں مگر میری خاطر نہیں۔ میں کہیں نہیں جانے والی اور پلیز! اب مجھے سونے دیں۔ سارا دن نوکروں کی طرح کام کیا ہے میں نے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی، اگر مجھے اب تھوڑا آرام کر لینے دیں گے تو۔" بشری کے موڈ سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ جن کی صورت راضی نہیں ہوگی۔

"مما! پلیز! جان جائیں نا۔ دیکھیں تو بابا کتنے پریشان ہیں۔" مثال ماں سے بولی۔

"تم سوئیں نہیں ابھی تک؟ معلوم ہے نا! صبح اسکول جانا ہے۔" بشری اسے جھٹک کر بولی۔

"جب تک آپ مائیں گی نہیں، سوئیں گی نہ پاپا اور صبح نہ میں اسکول جاؤں گی نہ پاپا آفس جائیں گے۔ کیوں پاپا؟" مثال باپ کی شہرہ پا کر چکتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"آف کورس میری جان! عدیل اسے ساتھ لپٹا کر بولا۔

"تو پھر بہتر ہے میں اٹھ کر کہیں اور چلی جاتی ہوں۔ یہاں مجھے کوئی سونے نہیں دے گا۔" وہ تکیہ اٹھا کر جانے لگی۔

"تم جہاں جاؤ گی، ہم وہیں تمہارے پیچھے آجائیں گے۔ کیوں مٹی جان؟" عدیل اسے روک کر بولا۔

"عدیل! چھوڑیں نا مجھے۔" وہ زچ آکر بولی۔

"تبی آسانی سے تو چھوڑ نہیں سکتا آپ کو ڈارنگ! وہ چھوڑ کر بولا۔

"مثال ہے کچھ تو خیال کریں۔" وہ کچھ جھینپ کر شوہر کو گھور کر بولی۔

"مما! میں نے آئیز کلوز کر لی تھیں۔ پلیز! اب آپ ہنس دیں۔" مثال معصومیت سے دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بے ساختہ بولی تو عدیل اور بشری اپنی ہنسی روک نہیں سکے۔

"بھئی! جو کام ہم نہیں کر سکے، ہماری مثال نے کر دکھایا۔ مثال ڈیڑھ تھینکس۔" عدیل اسے پیار کر کے بولا۔

"پاپا! خالی تھینکس نہیں چلے گا۔" وہ دونوں کے درمیان بیٹھ کر اٹھلا کر بولی۔

"تو پھر کیا چلے گا جانو!"

"کل کی چھٹی اور مزے۔ ماما کو ڈیڑھ ساری شاپنگ۔ ماما اور کیا کنڈیشن لگاؤں جلدی سے بتادیں۔ اس وقت پیاسا ب کچھ مان لیں گے۔" وہ ماں سے رازداری سے بولی تو دونوں ہنسنے لگے۔

"آپ زیادہ ہی ممالو نہیں ہیں۔ ہمیں اپنی ٹرمز اور کنڈیشنز طے کرنی آتی ہیں۔" عدیل اس کے ریشمی بال بکھرا کر بولا۔

"آپ خوش نہیں ہوں ماما! ابھی مائیں نہیں۔ ہے نا ماما؟" وہ جلدی سے بولی تو بشری نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر کیسے مائیں گی آپ کی ماما؟" عدیل بشری کو شریر نظروں سے دیکھ کر بولا۔

"ہم تو جانتے ہیں یہ کیسے مائیں گی۔"

بشری نے عدیل کو نذر سے چٹکی کالی۔ اور مثال کو کھینچتے ہوئے لے جانے لگی۔

"کچھ ہا نہیں کہ صبح اسکول بھی جانا ہے۔ دیر سے سوؤ گی تو اٹھو گی کیسے صبح؟"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی ویب سائٹ

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

مہمانوں کیوں ٹھیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو امیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ایچ آر ایف ماسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہر ای بک کو الٹی، نیا، مل کوالٹی، کبیرینڈ، کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ✧ ابن صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے ہمیں اور جاننے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”آپ سچ کہہ رہی ہیں امی۔“ عدیل ابھی آفس سے آیا تھا۔ بیک رکھا ہی تھا کہ ماں کی بات سن کر بے یقینی سے دیکھنے لگا۔

”لو تو اتنی بڑی بات میں کیا جھوٹ بولوں گی۔ بشری بیٹی! آکر ذرا بتاؤ تو عدیل کو کہ آیا تھا۔ ابھی فوزیہ کی ساہ فون؟“

بشری مسکراتے ہوئے کچن سے نکل کر آئی۔

”جی امی ٹھیک کہہ رہی ہیں عدیل۔ آئی تو اتنی بے قرار ہیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ آج ہی بارات کر آجائیں۔ امی نے جب انہیں فون کر کے بتایا کہ ہمیں آپ کا بیٹا بہت اچھا لگا ہے اور واقعی ظہیر میں ایسی کوئی بات ہے جی نہیں کہ بندہ انکار کر سکتا۔ فیملی بھی اچھی ہے، جناب بھی ٹھیک ہے اس کی پھر اپنی فوزیہ کا رشتہ اتنی چاہ سے مانگ رہے ہیں تو اور کیا چاہیے۔ آپ بتائیں کیا کہتے ہیں؟“ بشری سانس کے پاس جا کر رشتا نش لہجے میں بتانے لگی۔

عدیل، پچھ متذہب سا ہوا۔

”کیوں عدیل! چپ کیوں ہو گئے؟“ نسیم بیٹے کو دیکھ کر کچھ پریشان ہو کر بولیں۔

”نہیں امی! ایسی بات نہیں۔ اگر آپ کو یہ رشتہ پسند ہے۔۔۔“

”تجھے پسند نہیں کیا؟ لڑکے کے بارے میں ساری معلومات بھی تو تو نے ہی کرائی ہیں۔“ نسیم پریشان سی ہو گئیں۔

”نہیں امی! وہ سب ٹھیک ہے، لیکن خالی نکاح کرنا۔ میرا مطلب تھا ہماری تیاری ہے تو سہی۔۔۔ تو کیوں نہ انہیں کہیں کہ مہینے دو مہینے میں شادی رکھ لیتے ہیں۔“ عدیل بیوی کی طرف دیکھ کر بولا۔ بشری کی منشا بھی یہ ہی تھی کہ رخصتی بھی ہو جائے۔

”میں نے بھی یہ ہی بات کی تھی تو نسیم بہن کہنے لگیں کہ انہیں گھر میں کنسٹرکشن کچھ کا کام کروانا ہے۔ اس میں کافی ٹائم لگے گا اور انہوں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ ان کی نندا اپنی بیٹی دینا چاہ رہی ہے اپنے بیٹے کو تو اس صحیح صحیح سے بچنے کے لیے وہ نکاح کرنا چاہ رہی ہیں۔“ نسیم نے تفصیل سے بتایا۔

”تو بس ٹھیک ہے پھر آپ انہیں کہہ دیں اور بیٹھ کر نکاح کی کوئی تاریخ نطے کر لیتے ہیں۔“ عدیل سہلا کر بولا۔

”لا بشری! فون دے۔ میں انہیں بتا دوں۔ سب صبری سے انتظار کر رہی ہوں گی۔“ نسیم فوراً ہی بولیں۔ بشری نے اٹھ کر سانس کو فون دیا۔ وہ نمبر ملا کر بات کرنے لگیں۔ بشری اور عدیل بھی وہیں بیٹھے رہے۔



فوزیہ دلہن بنی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ اگرچہ اس کے نقوش بہت عام سے تھے مگر دلہنائے کا روپ تو عام سے چہرے کو بھی خاص بنا دیتا ہے نکاح ہوتے ہی سب ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے۔ یوں بھی نیا لوگ نہیں تھے۔ صرف سترہ لوگ لڑکے والوں کی طرف سے اور ان کے بھی قریبی عزیز ہی مدعو تھے۔

ظہیر کو فوزیہ کے ساتھ لا کر بٹھا دیا گیا۔ سب دونوں کو دیکھنے لگے۔ بشری، ظہیر کو دیکھتے ہوئے کچھ ٹھنک سی گئی۔

(باقی آتا)

ہلکی تھکی سسکی

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشری ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران، بشری کا بھائی ہے۔ مثال، ذکیہ بیگم کی نواسی ہے اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ فوزیہ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصیبتاً بیٹا بہو سے لگاوت رکھتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشری کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ذکیہ بیگم اپنے بیٹے عمران کے لیے بھی لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔ پانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بالاخر فوزیہ کا ایک جگہ نکاح طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشری دو لہا نظیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

دوسری قسط

اسے لگا اس نے ظہیر کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ کہیں بہت قریب سے... کہاں اسے بہت سوچنے پر بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔
نکاح ہو چکا تھا۔ اب اسٹیج پر قریبی عزیزوں کے ساتھ تصویریں بنوائی جا رہی تھیں۔ بشری کی طبیعت کچھ بوجھل سی تھی شاید تھکاوٹ کی وجہ سے یا کچھ اور۔
وہ سب سے ہٹ کر ایک طرف آکر بیٹھ گئی۔



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی ویب سائٹ

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریجن
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر پو پو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریجن
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے نجی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے
 ↩ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں
 ↩ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM
 Online Library for Pakistan
 Like us on Facebook [fb.com/paksociety](https://www.facebook.com/paksociety)
 twitter.com/paksociety1

مثال سب کے درمیان خوش خوش پھر رہی تھی۔

بشری اسے دیکھتے ہوئے خود بخود مسکرانے لگی۔ اس کی ساری تھکن جیسے اترنے لگی۔ اسی وقت عدیل نے بھی اسے دیکھا۔ وہ بشری کو یوں بیٹھے دیکھ کر کچھ متفکر سا ہوا۔ بشری ابھی تو فوزیہ کے ساتھ بیٹھی تصویر بنا رہی تھی اور اب یوں سب سے الگ تھلگ!

وہ دوسرے ہی لمحے اس کے پاس آکر فکر مند لہجے میں اس سے پوچھنے لگا۔
”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا بشری؟“

”ہاں ٹھیک ہوں۔ آپ کیوں آگئے وہاں سے۔ امی خفا ہوں گی۔ سب کے درمیان جا کر بیٹھیں۔ اچھا نہیں لگتا ہم دونوں ہی اس طرح الگ تھلگ ہو کر بیٹھ جائیں۔“ بشری کو فوراً ”نیم بیگم متلاشی نظریں پریشان کرنے لگیں۔ وہ یقیناً ”بشری اور عدیل ہی کو متلاش کر رہی تھیں۔
”فکر نہیں کرو میں ابھی وہیں سے تو آ رہا ہوں۔ تم مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہیں۔“
”ہاں! بس ایسے ہی طبیعت بوجھل سی ہو رہی تھی شاید تمہارے دل کی وجہ سے وہ سرد ہا کر تھکے تھکے لہجے میں بولی۔

”تو تم جا کر آرام کرو۔ فکشن تو تقریباً ختم ہی ہو گیا ہے۔“ عدیل تشویش سے بولا۔ اسے بھی بشری کا رنگ کچھ زرد سا لگ رہا تھا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہیں عدیل! امی کا پتا ہے نا آپ کو۔ ابھی ہم دونوں کو غائب دیکھیں گی تو مہمانوں کا لحاظ کیے بغیر مجھے بولنا شروع ہو جائیں گی۔ پلیز جا میں آپ وہاں بیٹھیں سب کے درمیان“ بشری کچھ گھبراہٹ سے بولی نیم اب واقعی متلاشی نظروں سے دونوں کو ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں۔
عدیل نے بھی ہاں کی طرف دیکھا تو گہرا سانس لے کر کھڑا ہو گیا۔

”میں تو یہی کہہ رہا تھا امی سے کہ اچھا بھلا خرچ ہو گیا۔ اس سے تو اچھا تھا ساتھ ہی رخصتی کر دیتے۔ کیا فائدہ اتنا پیسہ لگا کر بھی شادی کی ساری رسومات اسی طرح سربر کھڑی ہیں۔“ عدیل کو واقعی کوفت ہو رہی تھی۔ نیم بیگم نے دل کھول کر اس موقع پر خرچ کیا تھا۔ کچھ ہی حال فوزیہ کا تھا۔
بشری نے عدیل کے کہنے پر اپنے لیے نئے کپڑے نہیں بنوائے تھے۔ اس بار خرچ کو کنٹرول کرنا اس کے لیے بہت مشکل ہو رہا تھا۔

”مثال سے بھی کہیں۔ اب کچھ دیر کو آرام سے بیٹھ جائے۔ مسلسل پھرے جا رہی ہے تھک کر خدا نخواستہ کہیں بیمار نہ پڑ جائے۔“ عدیل کو جاتے دیکھ کر بشری پیچھے سے بولی۔
عدیل کچھ جواب دیے بغیر چلا گیا۔

بشری ہولے ہولے اپنی کپٹی دبانے لگی پھر سے اس کی نظریں ظمیر کے چہرے پر رک گئیں اور دوسرے لمحے وہ چونک کر رہ گئی۔

اسے یاد آ گیا تھا کہ اس نے ظمیر کو کہاں دیکھا تھا۔

نہ صرف دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ بشری کا مختصر سنی تعلق بھی رہ چکا تھا۔

وہ ایک دم سے ٹھنک کر رہ گئی تھی مگر اب اس کو یہ سب یاد آنا بے محل اور بے فائدہ تھا۔ کاش اسے ذرا پہلے یاد آجاتا۔

وہ ایک تک ظمیر کو دیکھے جا رہی تھی۔



عاصمہ تینوں بچوں کو ہوم ورک کروا رہی تھی۔ چھوٹی دندہ پاس ہی پر ام میں بیٹھی غول غاں کر رہی تھی جب فاروقی صاحب عفان کے ساتھ گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے تمنا تے چہرے کے ساتھ کچھ تحائف لیے اندر داخل ہوئے۔

عفان نے ہاتھ میں پکڑی مٹھائی اور دوسرے ہاتھ ایک طرف مینہ رکھے۔
”آگے اباجی! عاصمہ مسکرا کر کھڑی ہو گئی۔

”آگے۔۔۔ ایک لمبے سفر سے واپس۔“ اظہار مسکراتے ہوئے مگر مغموم سے لہجے میں فاروق صاحب نے کہا۔
چہرے پر مسکراہٹ کے باوجود ہلکی ہلکی آواز میں ہلکے ہلکے میں ہلکورے لے رہی تھی۔
عفان بھی باپ کا ساتھ دینے کو ذرا سا مسکرایا۔

”تو اچھا ہے نا اباجی! آزاد ہو گئے خواجواہ کے آزار سے۔ اب اپنی مرضی سے اٹھیں گے۔ جی چاہا تو سوتے رہیں گے رات دیر تک اپنی پسند کے ٹاک شوزدیکھیں گے آزادی تو پھر آزادی ہوتی ہے۔“ عاصمہ نے ان کو ہلانے کی کوشش کی۔

”ہاں! یہ تو ہے۔“

”عما! دادا ابو کیا جج کر کے آئے ہیں؟“ منجھلی اریشہ نے دادا کے گلے میں پڑے پھولوں کے ہار دیکھ کر اشتیاق سے پوچھا۔

”اُن شاء اللہ میری جان! وہ بھی کرنے جائیں گے۔ ابھی تو سمجھو دنیا کے جج سے فارغ ہوئے ہیں۔“ فاروق صاحب اریشہ کو پیار کر کے بولے۔

”سب لوگ اباجی کی تعریفیں کر رہے تھے۔ اباجی کی ایمان داری اصول پسندی اور سب سے برہہ کر وقت کی پابندی۔ اباجی! آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔ آپ کی شاندار سرور سز کا سب نہ صرف اعتراف کر رہے تھے بلکہ یہ دیکھیں جو سب نے تحائف دیے اور تعریفی اسناد بھی۔“ عفان نے باپ کو فخریہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
”دادا ابا! ان گفٹ ہی کس میں کیا ہے؟“ گیارہ سالہ دائق نے آگے برہہ کر میز پر پڑے تحفوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ دفتر کے کچھ دوستوں نے اپنے طور پر دیے ہیں اور کچھ سب نے مل کر۔“ فاروق صاحب کا لہجہ اب تھکا تھکا سا تھا۔

”عاصمہ! جلدی سے چائے لے آؤ بھی۔ اباجی تھک گئے ہیں۔ چائے پی کر کچھ دیر آرام کر لیں گے۔“
”نہیں بیٹی! چائے رہنے دو۔ ابھی کافی کچھ کھا کر آرہے ہیں۔ میں کچھ دیر آرام کروں گا۔“ فاروق صاحب اٹھ کر جانے لگے۔

”دادا ابو! میں آپ کا سر دباؤں؟“ اربہ دادا کا ہاتھ پکڑ کر معصومیت سے بولی۔

”دادا کی جان! آپ پڑھو اگر ہمارے سر میں درد ہو تو ہم اپنی گڑیا کو خود سے آواز دے لیں گے۔“ وہ اسے جھک کر پیار کرنے لگے۔

اربہ مسکرا کر پھر سے بیٹھ کر اپنا ہوم ورک کرنے لگی۔

”اباجی! کھانے میں کیا لیں گے؟ آج رات کو۔ کیا بنا لوں؟“ عاصمہ پیچھے سے بولی۔

”عفان سے پوچھ لو۔ مجھے تو شاید ہی بھوک لگے۔“ فاروق صاحب کہہ کر باہر نکل گئے۔ دونوں کچھ دیر خاموش رہ گئے۔

”یہ اباجی کچھ زیادہ ہی اواس نہیں ہو رہے آج؟“ عاصمہ آہستگی سے بولی۔
 ”ظاہر ہے آہستہ آہستہ سالوں کی رو میں ایک دم سے ختم ہو گئی۔ اواس تو ہوں گے ہی۔ خیر ہو جائیں گے آہستہ آہستہ عادی۔ تم مجھے تو ایک کپ چائے کا بنا دو۔“ عفان دلائق کی کاپیاں چیک کرنے لگا۔
 ”عفان! اباجی کو پینشن کتنی ملا کرے گی؟“ عاصمہ جاتے ہوئے رک کر پوچھنے لگی۔
 عفان فوری طور پر کچھ بول نہیں سکا۔

”وہ ان کی تنخواہ سے اچھا خاصا گھر کا خرچ نکالتا تھا۔ تینوں بچوں کو اتنے اچھے سکولوں میں داخل کر رکھا ہے ہم نے ورنہ اکیلے آپ کی تنخواہ میں کہاں گزارہ ہو گا۔“ وہ اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔
 ”پتا نہیں مجھے ٹھیک سے اندازہ نہیں ہے۔“ عفان جانا نہیں چاہ رہا تھا عاصمہ کو کچھ ایسا ہی لگا۔
 ”پھر بھی کچھ تو اندازہ ہو گا۔“ وہ اصرار سے بولی۔
 ”یار! جاؤ تم چائے لے کر آؤ میرے لیے۔ سر میں درد ہے اب تم تحقیق شروع کرو۔“ عفان کچھ اکتا کر بولا تو عاصمہ مزید اصرار نہیں کر سکی۔

”ہاں بھئی! کیسی جا رہی ہے اسٹڈیز آپ لوگوں کی۔“ عفان تینوں کی کاپیاں چیک کرنے لگا۔
 ”کہہ تو عاصمہ ٹھیک رہی ہے اباجی کی نوکری ختم ہونے سے فرق تو بہت پڑے گا۔“
 کاپیاں چیک کرتے ہوئے عفان رک کر سوچنے لگا۔



بشری کمرے میں آکر بیٹھی ہی تھی کہ ذکیہ بھی آگئیں۔ ابھی ابھی لڑکے والے رخصت ہو کر گئے تھے۔ فوزیہ اپنے کمرے میں کپڑے تبدیل کر رہی تھی۔ مثال اس کے ساتھ تھی۔ بشری تھوڑی کمر نکالنے کے خیال سے کمرے میں آگئی۔
 ”لو دیکھو یوں تو بڑی سیانی بنتی ہیں یہ نسیم بیگم اور رشتہ کہاں جوڑا بیٹی کا۔“ ذکیہ بیڈ کے اوپر چر رہی تھی کہ ہولے ہولے اپنے پاؤں اپنے ہاتھوں سے دباتے ہوئے نخوت سے بولیں۔
 بشری نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا۔

”تو امی کو بھی یاد آ گیا۔“ اس نے دل میں سوچا۔
 ”تمہیں کچھ یاد نہیں آیا بشری! وہ بشری کو خاموش بیٹھ دیکھ کر بولیں۔
 ”کیا امی؟“ وہ انجان بننے ہوئے سرسری لہجے میں بولی۔
 ذکیہ لمحہ بھر کو خاموش ہو گئیں جیسے بولنے کے لیے الفاظ کا انتخاب کر رہی ہوں۔
 ”ذی! ایک بات کہوں۔“ بشری نے ان کی خاموشی کو غنیمت جانتے ہوئے آہستہ آواز میں کہا۔
 ”کون سی بات؟“ ذکیہ کچھ چونکیں۔

”اب تو نکال ہو گیا ہے نا۔“ بشری ہولے سے بولی۔ ”اچھا نہیں لگے گا اگر یہ سب۔ میرا مطلب ہے عدیل کی امی یا فوزیہ کو پتا چلے گا یوں بھی وہ تو ایک سرسری معاملہ تھا کون سا کوئی ایسا رشتہ جزا تھا ہمارا۔۔۔ پھر شاید عدیل کو بھی یہ بات اچھی نہ لگے۔“ بشری زک زک کر بولی جیسے خود کو بھی سمجھا رہی ہو۔

”اتنے سال گزر گئے۔ میں تو یہ حیران ہوں ظہیر۔ اس وقت بھی اس کی عمر کوئی ایسی کم تو نہ تھی۔ کون سا میں بائیس کا تھا اس وقت بھی تیس پینتیس کا تو ہو گا اب تو۔“ سوچتے ہوئے ذکیہ اپنی انگلیوں پر گننے لگیں۔
 بشری نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ جانتی تھی۔ ماں کو اب روگنا یا خاموش کرانا آسان نہیں ہو گا۔

”لو آٹھ سالوں میں تیس کا بھی رہا ہو کم سے کم تو اب اڑتیس آنتالیس کا سمجھو۔ یوں تو یہ فوزیہ بی بی بھی کم سن نہیں۔ کب سے نسیم بیگم اس کا رشتہ تلاش رہی تھیں اور دیکھو جوڑ کا ملا بھی تو کون؟“ وہ ٹھٹھا سا لگا کر ہنسیں۔
 بشری نے ناگواری سے ماں کو دیکھا مگر ذکیہ کا دھیان تو اس کی طرف تھا ہی نہیں۔

”جب تمہارے لیے یہ ظہیر کی ماں ہماری دلیزانی جو تینوں سے گھس رہی تھی اس وقت بھی مجھے یہ لوگ کچھ اتنا بھائے نہیں تھے پھر بھی اچھا گھر بار اور خاندان دیکھ کر میں نے ہامی بھری تھی مگر چند ہی دنوں میں جو انہوں نے پر رزے نکالے یاد ہے نہیں وہ سب بشری۔“
 ذکیہ جیسے صورت حال کا پورا تجزیہ کرنے پر تلی ہوئی تھیں مزا سالا کر بولیں۔
 ”امی! خدا کے لیے چپ کر جائیں۔ گھر میں اس وقت مہمان اکٹھے ہیں جو کسی نے کچھ سن لیا تو۔“ بشری اہل کر بولی۔

”تو سن لے ایسا کون سا میں کوئی من گھڑت افسانہ سنا رہی ہوں۔“ ذکیہ نڈر ہو کر بولیں۔
 بشری تلملا کر رہ گئی۔

”آج امی کوئی نہ کوئی تماشہ کروا کے جائیں گی۔“ وہ بول بھی نہ سکی۔
 ”آئے دن ان کا فرمائشی پروگرام چلنے لگا تھا اور دیکھو مزے کی بات ظہیر کی ماں یوں تو خاصی بھولی بھالی خود کو ظاہر کر رہی تھی نسیم بہن کے سامنے مگر مجھے دیکھتے ہی جیسے اس پر پانی سا پڑ گیا۔ وائیں بائیں دیکھنے لگی جیسے بھانگے کو راستہ ڈھونڈ رہی ہو۔“ خود ہی ہنسنے لگیں۔

”اور بشری! میں جو نسیم سے کچھ بول دیتی۔“
 ”امی! اس کر دین خدا کے لیے۔ یوں بھی یہاں صرف رشتہ جڑنے والا سرسری معاملہ نہیں۔ باقاعدہ نکاح ہوا ہے اب اگر اس بات کی بھٹک امی کو یا عدیل کو ہو گئی یا فوزیہ کو پتا چل گیا۔ ظہیر اس کی فیملی کو تو کیا کسی نے برا سمجھتا۔ النامیری شامت آجائے گی کہ سیری پہلے بھی کہیں تنگنی ہوئی تھی اور ہم نے چھاپا یا۔“ بشری نے ماں کو سنگین حالات کا احساس دلانا چاہا۔

”نے لو! مگنی کہاں تھی وہ۔ خالی منہ زبانی کی بات تھی اور بس۔ میں پہلے ہی ان کی بدنیتی کو جان گئی تھی تو۔۔۔“
 ”امی! چائے پیئیں گی آپ؟“ بشری کپٹی دباتی کھڑی ہو گئی یوں تو ذکیہ بیگم کو چپ کرانا مشکل تھا۔ بشری نے اٹھ کر چلے جانے میں ہی عافیت سمجھی۔
 ”تم لیٹی رہو۔ تمہاری طبیعت کون سی اچھی ہے بلکہ میں تو کہتی ہوں عدیل کے ساتھ جا کر ڈاکٹر کو دکھا آؤ یا میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔“

”نہیں! ٹھیک ہوں میں۔ یوں بھی ابھی گھر میں مہمان ہیں۔ امی بولیں گی کہ کیسے کمرے میں گھس کر بیٹھ گئی۔ میں کچھ بول ڈرا باہر جا کر۔“

”بشری دیکھنے بھانے کا۔ نوکرانی تو نہیں ہو تم ان کی۔“ ذکیہ پھر اپنی ناگواری چھپانہ سکیں تو بولنے لگیں۔
 ”امی! اپنے گھر میں کام کرنے سے کہنی نوکر نہیں بن جاتا۔“ بشری کو مار کی بات اچھی نہیں لگی تو فوراً بول اٹھی۔

”پھر عدیل میرے ساتھ اتنے اچھے ہیں۔ میرا اتنا خیال رکھتے ہیں، کبھی انہوں نے میری کسی خواہش کو رد نہیں کیا تو اگر میں ان کی ہاں بہن کا خیال رکھتی ہوں یا گھر کے کام کر سکتی ہوں تو کیا فرق پڑتا ہے ای! بشری محل سے ماں کو سمجھانے والے انداز میں بولی اگرچہ جانتی تھی ذکیہ سے اس موضوع پر بات کرنا فضول ہے۔“

”تمہاری الٹی منطق۔ وہ ماں بیٹی تمہیں جو بیٹی پر رکھیں اور تم ان کی دلدادہ رہو۔“ وہ اسے اور اشتعال دلاتے ہوئیں۔

بشری تاسف سے ماں کو دیکھتی باہر جانے لگی۔

”ہاں امی! وہ جو لڑکی آپ کو پسند آتی تھی۔ شام میں مجھے دکھا رہی تھیں عمران کے لیے۔ کچھ اتنا پتلا لیا آپ نے اس کا۔“ بشری کو جاتے جاتے یاد آیا تو رک کر پوچھنے لگی۔

”وہ انہوں نے کون سا بہرہ دیا؟ ظہیر کی خالہ زاد ہے۔“ میں نے تو اس دو نمبر خاندان میں کوئی رشتہ نہیں جوڑنا لڑکی تو خاصی تیز طرار تھی میرے اتنا پتلا پوچھنے رہی جھٹ سے سمجھ گئی۔ شرما شرما کر ادائیں دکھانے لگی۔ میں تو اٹھ کر آئی۔ ”ذکیہ نے تفصیلاً جواب دیا تو بشری گہرا سانس لے کر رہ گئی۔“

”اس طرح تو امی! عمران کا رشتہ ڈھونڈنا اور بھی مشکل ہو تا جائے گا۔ آخر کوئی نہ کوئی تو پسند کرنا ہوگی نا!۔“

”کوئی نہ کوئی کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ کسی کو بھی ہو بنا کر لے آؤں جو دل کو آٹھوں کو بھائے گی اس کے بارے میں سوچیں گے تم ذرا فارغ ہو لو تو میرے ساتھ چلنا۔ اس بار روانے جس لڑکی کا بتایا ہے وہ اچھے لوگ لگ رہے ہیں لڑکی بھی بہت خوب صورت ہے۔“

”آپ نے دیکھی لڑکی؟“ بشری نے کچھ اچھے سے پوچھا۔

”نہیں! تمہارے بغیر تو نہیں دیکھ سکتی تھی نا۔ تصور دکھائی تھی ہوانے۔ اچھی خاصی خوش شکل لڑکی ہے اور تو اور عمران کا بھی بول نک سا گیا تصویر دیکھ کر۔“ وہ خوش ہو کر بولیں۔

”چلیں یہ تو اچھا ہو گیا میں فارغ ہوتی ہوں تو پھر چکر لگا آئیں گے اور ان لوگوں سے کہیں گے کہ زیادہ اہتمام نہ کریں۔ اچھا نہیں لگتا کہ صرف جا کر دیکھنا ہوتا ہے لڑکی کو اور اتنی بدارت کرائیں۔“

”لو یہ تو دنیا کا دستور ہے وہ الگ کرتے ہیں یاد نہیں تمہاری بار مجھے بھی ہر بار یونی میز بھر کر سجانا پڑتی تھی میں نے تو کبھی ناک منہ نہ چڑھایا اور نہ کسی لڑکے والے نے منع کیا تو پھر ہم کیوں کریں ایسا۔“

بشری تاسف بھری نظروں سے ماں کو دیکھ کر خاموشی سے باہر نکل گئی۔



فاروق صاحب ٹیرس پر بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے ان کے کمرے میں کتاب کی بڑی بڑی دو الماریاں تھیں گورنمنٹ سروں میں رہنے کے باوجود انہیں کتاب بنی کا خصوصی شوق تھا۔

”اباجی! کھانا تو کھالیں اگر۔ کانی ٹائم ہو گیا ہے اب تو۔“ عاصمہ اندر آ کر نرمی سے مسکرا کر بولی۔

انہوں نے مسکرا کر کتاب بند کرتے ہوئے عینک اتاری۔

”آج تو جیسے ہر ذمہ داری سے آزاد ہو کر ہلکا پھلکا ہو گیا ہوں میں اور دل چاہ رہا ہے کسی بھی روٹین کی پابندی نہ کی جائے۔“ وہ خوشی بھرے لہجے میں بولے۔

”اباجی! کھانا تو آپ کو کھانا ہی پڑے گا کیونکہ عفتان کو آپ جانتے ہیں وہ آپ کے بغیر ایک لقمہ نہیں لیں گے اور بچے بھی انتظار میں بیٹھے ہیں اب آپ آہی جائیں۔“ عاصمہ ان کے ہاتھ سے کتاب لے کر الماری میں رکھتے

ہوئے بولی۔

”عاصمہ بیٹی! اسے الماری میں نہیں رکھو۔ میرے بیڈ کے سرہانے رکھو، بہت دلچسپ کتاب ہے رات میں یہی پڑھوں گا۔“ وہ اسے نوک کر بولے۔

”میں سوچ رہا تھا۔ گاؤں کا ایک چکر لگا آؤں۔“

”وہ کس لیے۔ ابھی تو موسم خاصا سرد ہے۔“ عاصمہ بولی۔

وہ جیسے وجہ بتانے کے لیے کچھ سوچنے لگے۔

”مجھے اسلم بھائی کا فون آیا تھا۔ ہماری زرعی زمین پچھلے دو سالوں سے سیم تھور کا شکار ہو کر رہ گئی ہے بلکہ بے کار رہی سمجھو۔ چاہ رہا تھا میں ایک چکر لگا لوں گاؤں کا سڑک کے نزدیک ہونے کی وجہ سے اس زمین کے اچھے دام مل سکتے ہیں۔“ وہ سوچ سوچ کر بولے۔

”تو آپ زمین بیچ دیں گے؟“ عاصمہ کچھ حیرانی سے بولی۔ فاروق صاحب کو اپنی اس آبائی زمین سے بہت پیار تھا۔

”بیٹا! گورنمنٹ سروں میں رہتے ہوئے کوشش کے باوجود میں تم لوگوں کے لیے اپنا گھر نہیں بنا سکا۔ اب عفتان کی جاب بھی کچھ اتنی شان دار نہیں کہ وہ یہ کام کر لے پھر ماشاء اللہ سے بچوں کے اخراجات ہیں اور منگانی دن بدن کم ہونے کے بجائے بڑھتی جا رہی ہے۔ ایسے میں گھر کہاں چلے گا اور یہ کرائے کا گھر جیسے ٹیم مارن بھاگی چلی آتی ہے۔“

وہ رک رک کر گہری آواز میں بول رہے تھے۔

عاصمہ کو شک ہو جیسے انہوں نے عاصمہ اور عفتان کی بیہوشی والی بات سن لی ہو۔

”یوں بھی وہ بچہ زمین تین چار سالوں سے ہمیں کچھ نہیں دے رہی بلکہ مجھے اسلم بھائی کہہ رہے تھے کہ کوئی خانہ بدوش کنبہ اس پر خیمے گاڑے پچھلے دو ماہ سے بیٹھا ہے یہ نہ ہو کہ قبضہ ہی ہو جائے۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

اپنے گھر کی حسرت تو کوئی عاصمہ کے دل سے پوچھتا۔

عفتان تو اتنے سالوں سے اسے سوائے اگلے سال اگلے سال کے دلا سے کے اور کچھ نہیں دے سکا تھا مگر اباجی جتنے مزاج اور طبیعت کے اچھے تھے۔ دل کے بھی اتنے ہی اچھے تھے بلکہ عاصمہ کے مزاج اور خواہش کو جتنا وہ سمجھتے تھے اتنا تو عفتان بھی نہ سمجھ سکا تھا۔

”پھر تو اباجی! آپ کو وہ زمین نکال ہی دینی چاہیے یہ نہ ہو کوئی قبضہ گروپ قابض ہو کر بیٹھ جائے تو پھر مسئلہ ہو جائے۔“ وہ خوش ہو کر بولی۔

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ وہ سر ہڈا کر بولے۔

”اور ادھر بھی کسی ڈیلر سے کہہ چھوڑیں۔ کوئی اچھا سا گھر مناسب دام میں نظر میں رکھے۔“ عاصمہ زیادہ دیر اپنے دل کی بے چینی کو چھپا نہیں سکی تھی بول پڑی۔

”جانتا ہوں۔ میری بیٹی کو اپنے گھر کی کتنی خواہش ہے بلکہ مجھے تو دکھ ہوتا ہے کہ ہم تمہیں اپنی چھت بھی نہ دے سکے۔ ہر لڑکی کے دل کی خوشی ہوتی ہے اور تم اتنے سالوں میں بھی اس سے محروم رہی ہو۔“

”او انہوں اباجی! میں خوش ہوں بہت۔ آپ بہت اچھے ہیں عفتان اتنا خیال رکھتے ہیں۔ اللہ نے اتنے پیارے پیارے بچے دیے ہیں اور ایک آدھ کی تو ہر ایک کی زندگی میں ہوتی ہی ہے نا۔ ان شاء اللہ وہ بھی دور ہو جائے گی آپ پریشان نہیں ہوں۔“ وہ باپ جیسی شفقت رکھنے والے فاروق صاحب کو دیکھتے ہوئے نرمی سے بولی۔

”اللہ تمہیں خوش رکھے میری بچی! میں دو تین دن میں گاؤں جا رہا ہوں وہاں جو بھی صورت حال ہوگی دیکھ کر

عفان کو بلالوں کا اگر زمین کے اچھے دام مل رہے ہوں تو پھر ہم پر نہیں کریں گے اور واپس آتے ہی ان شاء اللہ گھر لے لیں گے۔ صبح ہی الیاس ایجنٹ سے گھر کے لیے بھی بولتا ہوں۔ وہ جلدی جلدی بولے جیسے انہیں یہ سب کہنے کے لیے اپنی ریشاڑ منٹ کے ون کا ہی انتظار تھا۔ عاصمہ کا دل لمحہ بھر کو خوف زدہ سا ہوا۔

”ابا جی یہ سب کچھ اتنی جلدی جلدی کرنا چاہ رہے ہیں۔ کیسے خدا نخواستہ وہ ہم سے بچھڑنے والے تو نہیں۔ اللہ نہ کرے۔“ وہ خود ہی دہلتی باہر نکل گئی۔



”امی! مجھے تو حنا بہت پسند آئی ہے۔ اور عمران کے ساتھ چنچے گی بھی خوب۔“ بشری عمران کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

ذکیہ تیز نظروں سے بشری کو دیکھنے لگیں۔

”کیا ہوا امی ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں؟“ بشری کچھ ڈر کر بولی۔

”عمران تم سے کتنی محبت کرتا ہے۔ جانتی ہونا بشری؟“

”امی! بشری ریشان ہو گئی۔“

”قدردیکھا تھا تم نے اس حنا بیگم کا۔“

”امی! اتنا بھی چھوٹا نہیں تھا۔“ بشری بے لہجے میں بولی جبکہ عمران کا یہ سنتے ہی موڈ آف سا ہو گیا تھا۔ اس نے ناگواری سے منہ پی وی کی طرف پھیر لیا تھا۔

”دیکھو بشری! اب تم ڈنڈی مار رہی ہو۔ وہ بیٹی سی چھوٹی سی لڑکی بھلا کیا چنچے گی اپنے عمران کے ساتھ۔ کساں میرا گھرو عمران اور کساں وہ۔ بس رہنے دو۔ یوں تعریفیں کر کے میرا جی نہیں جلاؤ۔“

ذکیہ بیگم نے گویا بات ہی ختم کر دی۔

بشری کو ایک دم سے ڈھیر سا رانغصہ آ گیا۔

”اب ایسی بھی کیا خود غرضی اگر ان کی اپنی بیٹی کا اللہ نے اچھی جگہ رشتہ کر دیا ہے تو وہ کسی اور کی بیٹی کا ہونے ہی نہیں دیں گی۔“

”امی! اگر آپ اس طرح لڑکیاں تریکٹ کرتی رہیں پھر تو خدا نخواستہ عمران کی شادی کیسے ہوگی۔ میرا مطلب ہے۔“

”تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ میں اپنے بچے کا گھر نہیں بسانا چاہتی۔“ وہ فوراً بولیں۔

”خدا کے لیے امی! اب میری بات کا الٹا سیدھا مطلب مت نکالے گا ورنہ تین سال سے ہم لڑکیاں دیکھ رہے ہیں اور سچی بات ہے مجھے تو اب آئے روز گھر گھر جا کر یوں لڑکیاں دیکھنا بہت برا لگ رہا ہے۔“

”تو ٹھیک ہے تم اگلی بار مت جانا۔ یہ بڑھیا جو ہے خوار ہونے کے لیے۔ گھٹنے گھسانے کے لیے۔“ ذکیہ برابان کر بولیں۔

بشری بے بسی سے عمران کو دیکھ کر رہ گئی۔

”عمران! میں تمہارے لیے چائے لاؤں۔“ وہ اٹھ کر جانے لگی تو اسے بے اختیار چکر سا آ گیا۔ اس نے سنبھلنے کے لیے بیوار کا سہارا لیا۔

”کیا بات ہے بشری! ٹھیک تو ہونا تم؟“ ذکیہ دیکھ رہی تھیں۔ فوراً سے بولیں۔

”ٹھیک ہوں امی! ویسے ہی چکر سا آ گیا تھا آپ پیسے کیسے چائے؟“

”تم رنے دو میں آواز دیتی ہوں پروین کو وہ بنا دے گی۔“ ذکیہ نے اسے بیٹھنے کو کہا۔

”اور تم گئیں نہیں ڈاکٹر کو دکھانے۔ میں نے تمہیں اس روز بھی کما تھا۔“

”امی! میں ٹھیک ہوں۔ یونہی دیکھ نہیں ہے اور یہ مثال کہاں ہے عمران؟“

”کمرے میں۔ تم کھیل رہی تھی کمپیوٹر میں۔“

”میں پروین کو چائے کا کمرہ کر آتی ہوں۔ خود سے تو اس پروین کو ہوش نہیں کہ آکر چائے پانی کا پوچھ لے کسی سے۔“ ذکیہ بولتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

بشری عمران کو دیکھنے لگی۔

”عمران! تم امی کو سمجھاؤ نا۔“ عمران کے متوجہ نہ ہونے پر اسے کنار پا۔

”کیا۔ کیا سمجھاؤں؟“ عمران چونک کر بولا۔

”پتا نہیں امی کسی ایک ذرا سی بات پر بھی کم ہوا مائز نہیں کر رہیں ایسے تو نہیں ہوتا نا کہ آدمی کو سب کچھ ہی مکمل اور بے عیب ملے۔“ بشری سمجھانے والے انداز میں بولی۔

”مگر آبی! اب امی بھی تو غلط نہیں ہیں نا!“ عمران کچھ ناگواری سے بولا۔

”کیا مطلب؟“

”آپ ساتھ گئی تھیں۔ معلوم تو ہے آپ کو کہ لڑکی کا قد چھوٹا ہے تو پھر بھی۔“ وہ حنا کر بولا تو بشری کو بہت برا لگا اور وہ فوراً کہہ بھی نہ سکی کہ اگر یہ سب مین میخ تمہاری بہن میں نکالی جاتی تو۔

”ایسا چھوٹا قد نہیں تھا حنا کا۔“ وہ ذرا دیر بعد پھر سے ہمت نہ ہارتے ہوئے بولی۔

”آبی! میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں مگر مجھ سے گھٹنی لڑکیاں نہیں برداشت ہوتیں۔ ریلی یوں جیسے زمین پر کچھ تلاش کر رہی ہوں ابھی جھک کر ڈھونڈنے لگیں اور پھر میرے ساتھ۔ آپ نے میری ہائیٹ کو دیکھا ہے نا۔ سوری امی کا انڈیکسٹن صحیح سا ہے۔“

عمران نے صفحہ ہی ایسٹ دیا۔ بشری اپنے غصے کو دبا کر بیٹھ گئی۔

”مثال کو بلاؤ اور مجھے گھر چھوڑ آؤ۔“ وہ کچھ دیر بعد بیزارگی سے بولی۔

”راست کو چلی جائیے گا کھانا کھا کر۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔

”نہیں! میں گھر میں کہہ کر آئی تھی۔ شام میں آجاؤں گی۔ خواہ مخواہ امی ناراض ہوں گی۔ میں دیکھتی ہوں مثال کو۔“ وہ اٹھ کر چلی گئی۔



”عفان! مجھے یقین نہیں آ رہا تم سے۔“ عاصمہ خوشی سے بے قابو ہوتے لہجے میں بولی۔

”بھئی ابھی تم اتنی خوش نہیں ہو ابھی تو مجھے گاؤں جانے دو پھر وہاں جا کر پتا چلے گا کہ کتنے میں بھاؤ طے ہوا ہے زمین کا۔ کہیں اباجی یوں ہی کوڑیوں کے مول تو نہیں پھینک رہے سب کچھ جبکہ وہ زمین سڑک کے کنارے ہے اب تو۔“ عفان اپنا ضروری سامان سونٹ کیس میں رکھتے ہوئے بولا۔

”نہیں! اباجی ایسے نا تجربہ کار تو نہیں اور پھر زمین داری کا جتنا تجربہ انہیں ہے۔ اتنا تو آپ کو بھی نہیں۔“ عاصمہ وثوق سے بولی۔

”چلو دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔“ عفان موضوع سمیٹتے ہوئے بولا۔

”ویسے بالی داوے ہماری بیگم صاحبہ اتنی خوش کیوں ہیں اس زمین کے بکنے پر۔ پوچھ سکتا ہوں۔“ عفان اسے

شوخ نظروں سے دیکھ کر بولا۔

”خیر یہ تو آپ جانتے ہیں۔ انجان بن رہے ہیں تو الگ بات ہے۔“ وہ بھی کچھ شوخی سے بولی۔

”عاصمہ! میں بہت شرمندہ ہوں تم سے۔“ عفتان ایک دم سنجیدہ ہو کر بولا۔ عاصمہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔

”کہا ہو گیا ہے عفتان! سفر پر جاتے ہوئے ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں اور خدا نخواستہ آپ مجھ سے کیوں شرمندہ ہونے لگے۔“ وہ عفتان کا ہاتھ تھام کر فکر مند سی بولی۔ دونوں میں شادی کے اتنے سالوں بعد بسا در محبت کوئی جتانے والی چیز نہیں رہ گئی تھی مگر پھر بھی دونوں کے دل ایک ہی انداز میں سوچتے ایک ہی انداز میں دھڑکتے تھے اور دونوں کو اس کی خبر بھی تھی۔

”تمہیں شادی کے بارہ سالوں میں بھی اپنی چھت نہیں لے کر رہے سکا۔“ عفتان گہری آواز میں بولا۔

”عفتان پلیز۔ ایسی باتیں نہیں کریں۔ گھر تو وہ ہوتا ہے جس میں لوگ محبت سے پیار سے رہیں خواہ وہ اپنا ہو یا کرائے کا۔ اتنے سالوں میں آپ نے اباجی نے مجھے جتنی محبت پیار توجہ دی یقین چائیں۔ اس دوران میں بار گھریلے مجھے کبھی اس محرومی کا احساس نہیں ہوا۔ ہم سب اکٹھے ہیں ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ ایک دوسرے کے احساسات کو سمجھتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر گھر کو جوڑنے والے اور کیا جذبات ہوتے ہیں۔“ وہ جذباتی لہجے میں بولی۔ عفتان اسے تشکر بھری نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔

”آپ نے ڈیلر سے گھر دیکھ رکھنے کے لیے کہہ دیا ہے نا؟“ اسے پھر سے یاد آیا تو مشتاق لہجے میں پوچھنے لگی۔

”ہاں آئیے کچھ رقم ہاتھ میں تو آجائے پھر گھر بھی دیکھ لیں گے۔ پیسے جیب میں ہوں گے تو گھر تو ہم مہینہ بھر میں خرید لیں گے ان شاء اللہ!“ عفتان اسے پیار بھری نظروں سے دیکھ کر بولا۔

”یہاں ہے عفتان مجھے پرانے گھر پرانی کوٹھیاں جن کے برآمدوں کے باہر بیلیں ہوں یا اونچے اونچے درخت بہت اچھے لگتے ہیں۔“ وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔

”رہانے گھر۔ ہم کیا پرانا گھر خریدیں گے۔ اور بھی عورتوں کو تو چمکتی ٹانگوں اور پھسلتے پتھروں والے نئے گھر اچھے لگتے ہیں تمہاری الٹی منطق ہے۔“ وہ ہنس کر بولا۔

”یہاں ہے عفتان! پرانے گھر دیکھ کر پتا چلتا ہے اس گھر کے مکین اس سے کتنی محبت کرتے ہیں کہ وہ اسے بیچنے کا ارادہ نہیں رکھتے اور ان کے گھر کے پتے بھی بار بار نہیں بدلتے۔“ وہ آنکھوں میں آنی نمی کو صاف چھپا کر بولی۔

عفتان اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”اور ابھی تم کہہ رہی تھیں کہ کراسے کے گھر بدلنے سے تمہیں کچھ فرق نہیں پڑتا۔“ وہ اس کے کندھوں پر ہاتھ جما کر بولا۔

”آپ کو میری نہیں ہو رہی اباجی انتظار کر رہے ہوں گے۔“ وہ کچھ جھینپ کر بولی۔ وہ اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔

”بچوں کا بہت خیال رکھنا عاصمہ!“ وہ اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”آپ صرف تین دن کے لیے جا رہے ہیں خدا نخواستہ سال بھر کے لیے تو نہیں۔“ وہ جتا کر بولی۔

”کیوں تمہیں اچھا نہیں لگ رہا کہ ہم اتنے عرصے کے بعد یوں فرصت سے ایک دوسرے کے اتنے پاس کھڑے ہیں۔“ وہ اسی طرح بہت مشتاق نظروں سے اسے دیکھتا جا رہا تھا۔

”ماشاء اللہ کیا فرصت ہے جناب کو سفر روانہ ہونا ہے۔ بھول رہے ہیں۔“ عاصمہ چھیڑ کر بولی۔

”ہاں یار! نکلتا ہوں اب ورنہ راستے میں رات ہو جائے گی کافی۔ اباجی نے تاکید سے کہا تھا کہ دن کی روشنی میں گاؤں آجاؤں تو اچھا ہے۔“ عفتان کو بھی دیر ہو جانے کا احساس ہوا تو گہرا سانس لے کر سوٹ کیس اٹھا کر باہر کی

طرف چل پڑا۔
عاصمہ بھی اس کے ساتھ باہر کی طرف بڑھ گئی۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ عاصمہ دروازے سے باہر در تک انہیں جاتا دیکھتی رہی۔

”فوزیہ! ایسے کیوں بڑی ہو اور یہ تصویریں یوں کیوں پھینک رکھی ہیں سنبھال کر انہیں البم میں لگا دینا تھا نا۔“ نسیم کمرے میں آئیں تو فوزیہ کو بیڈ پر آڑے تر پچھلے لیٹے دیکھ کر کچھ حنفی سے بولیں۔

نکاح کی تصویریں بستر پر ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ وہ ایک ایک کر کے تصویریں اکٹھا کرنے لگیں۔

فوزیہ اسی طرح بے حس پڑی رہی۔

”کیا ہوا ایسے کیوں لٹی ہو؟“ نسیم کچھ تشویش سے بولیں۔

”سو نہی! فوزیہ بے دلی سے بولی۔“

نسیم کچھ چاٹتی نظروں سے بیٹی کو دیکھنے لگیں اور پھر تصویریں ایک ایک کر کے دیکھنے لگیں۔

”میری بیٹی حور لگ رہی ہے۔“ وہ پیار سے تصویریں دیکھ کر بولیں۔

”حور کی نقل میں لنگور۔“ فوزیہ اور پچی آواز میں بڑبڑائی۔

نسیم بیگم بری طرح سے چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ ایسے کیوں بول رہی ہو۔“ وہ کچھ ناراضی سے بولیں! چھی بھلی تو ہیں۔ ماشاء اللہ ظہیر اچھا تو لگ رہا ہے اتنا۔“

”اڈکل ظہیر بولیں تو زیادہ صحیح رہے گا۔“ فوزیہ بھرائے ہوئے لہجے میں جیسے پھٹ کر بولی۔

نسیم بیگم جیسے بری طرح سے چونکیں۔

”کیا ایک رہی ہو۔“ غصے میں یہی نقل سکا منہ سے۔

”میں نہیں۔ وہ ارم کہہ کر گئی ہے۔ خوب میرا ریکارڈ لگا رہی تھی اور مذاق بھی۔“

”دماغ خراب ہو گیا ہے اس ارم کی پچی کا۔ خود کا تین جگہ رشتہ ٹوٹ چکا ہے ہو ہو کس۔ ایسی حور تھی تو اس کے نصیب میں تو یہ ماڈل بھی نہ ہوا۔ اے فوزیہ تو ایسے کچے کانوں کی کب سے ہونے لگی! جو جس نے کہا مان کر دل برا کر کے بیٹھ گئی۔ پاگل ہوئی ہے کیا۔ میری طرف دیکھ ذرا۔“ نسیم اس کی دلجوئی کرنے کو آخر میں ذرا نرم لہجے میں بولیں۔

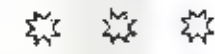
”امی! اس وقت مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔ بس آپ جائیں۔“ فوزیہ ہاں کا ہاتھ جھٹک کر بولی۔

نسیم کا جی تو چاہا کھینچ کر اسے ایک پھیڑ لگا میں۔ خدا خدا کر کے تو بیٹی کو رخصت کرنے کی کوئی صورت بنی تھی اور یہ ناشکری؟

”پاگل ہو گئی ہے کیا اور تو اتنا بھی نہیں سمجھتی کبخت! وہ جلتی ہے تجھ سے اور وہ رشتے والی نسرین بتا رہی تھی مجھے کہ اس نے تو ارم کی ماں کو صاف جواب دے دیا ہے کہ اب وہ ارم کے لیے کوئی رشتہ نہیں لائے گی۔ سارے میں تو مشہور ہو گئی ہے! اس کی تین بار ممکن ٹوٹ چکی ہے اب وہ دل کے پھپھو لے یہ تصویریں دیکھ کر نہیں پھوڑے گی تو اور کیا کرے گی اور تو اس کی باتوں میں آگئی ہے۔“ نسیم بولتے ہی بیٹی کو ہسلانے لگیں فوزیہ اس بار کچھ نہ بولی۔ یوں جیسے مان کی بات اس کے دل کو لگی ہو۔

اس نے سیدھے ہو کر ماں کو دیکھا۔

تصویریں اس کے آگے کرتے پھر سے دکھاتے ہوئے نسیم کی آنکھوں میں فخر سا تھا۔
 ”دیکھ تو کسے چاند سورج کی جوڑی ہے جو دیکھے گا کج بخت حذر میں سے جل مرے گا بڑی ہی ناشکری ہے فوزیہ تو۔“ نسیم بیٹی کو سمجھاتے ہوئے اس کے جذباتی پن کو نشانہ بنا رہی تھیں۔
 کن اکیلوں سے تصویروں کو دیکھتی فوزیہ کو بھی ظہیر اتنی عمر کا تو نہیں لگا جتنا کج بخت یہ ارم بول رہی تھی۔
 ”انہیں ترتیب سے الہم میں رکھ اور اب کوئی ضرت نہیں ان حسد کی باری سپیلیوں کو دکھانے کی۔ ایسا مہنگا جوڑا۔ اتنا اچھا سونے کا بھاری سیٹ نکاح میں اتنا کچھ لے آئے سسرال والے تو کیا شادی میں کم کریں گے اب نہ کوئی الٹی سیدھی بات سوچنا۔ میں دیکھوں جا کر بچکن میں بشری نے کھانا بنا لیا یا نواب زادی پینگ توڑ رہی ہے۔“ وہ کہتے ہوئے باہر نکل گئیں فوزیہ پر سے پار سے تصویریں الہم میں لگانے لگی اور رک رک کر بار بار ظہیر کی تصویروں کی طرف بھی دیکھتی جاتی تھی خود بخود اس کے دل میں انوکھے جذبے بیدار ہونے لگے تھے۔



”ارے صحیح کہہ رہے ہیں آپ! بشری بے یقینی سے عدیل کی طرف دیکھنے لگی۔
 ”لو اب اس میں جھوٹ کیا ہو گا بھلا۔“ وہ دل نشیں مسکراہٹ سے بولا۔
 ”کتنے دنوں کے لیے جا میں گئے؟“ بشری خوش ہو کر بولی۔

”ایک ہفتے کے لیے۔“ عدیل مسکرا کر بولا۔

”ریٹا! مجھے ابھی بھی یقین نہیں آ رہا عدیل! وہ بے تحاشا خوش تھی۔

”یار! لگی بندھی رو زمین سے دل بیزار ہو گیا تھا۔ بس کافی دنوں سے دل چاہ رہا تھا کہ کہیں اونٹنک پر چلا جائے۔ مثال کے ایکزام بھی ہو گئے ہیں فوزیہ کا مسئلہ بھی حل سمجھو دو تین ماہ میں اس کی شادی ہو جائے گی تو پھر ہمارا نکلتا بہت مشکل ہو جائے گا گھر سے۔“

”آپ کتنے اچھے ہیں عدیل!“ وہ بہت خوش تھی۔ اتنے عرصے کے بعد وہ دونوں اکٹھے کہیں آؤٹ اسٹیشن جا رہے تھے۔

”ای ماں جا میں گی؟“ اسے دوسرا ستایا۔

”میں نے ان سے بات کر لی ہے۔“

”کیا۔۔۔ واقعی؟“ عدیل تو اسے آج حیران ہی کیے جا رہا تھا۔

”ہاں یار! میں نے یہی سوچا تھا کہ میں تمہیں سربراہ بعد میں دوں گا اور اس سربراہ کا مزہ بھی تب ہی آتا جب اسی سے میں اجازت لے چکا ہوں اور نہ ان کے انکار پر تو کوئی فائدہ نہیں تھا تمہیں بتانے کا۔ خواجواہ ہم دونوں میں جھگڑا ہو جائے۔“ عدیل اسے تفصیل بتانے لگا۔

”ارے واہ! آپ تو بہت عقل مند ہو گئے ہیں۔“ وہ خوش ہو کر بولی۔

”دیکھ لو پھر بھی تم کہتی ہو کہ مجھے تمہارا خیال نہیں۔“

”عدیل! کبھی مجھے ڈر لگتا ہے۔“ وہ رک کر بولی۔

”اب کس بات سے ڈر لگتا ہے میں تو سمجھ رہا تھا آج کل تم سے زیادہ خوش اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔“

”کیا مطلب۔۔۔ وہ کس لیے؟“ بشری نا سمجھی سے بولی۔

”بھئی فوزیہ کا رشتہ ہو جانے سے تم بھئی خوش ہو آتی تو شاید فوزیہ بھی نہیں ہوگی۔“ وہ اسے چھیڑ کر بولا۔

”آپ جو مرضی آج بول لیں میرا لڑنے کا کوئی موڈ نہیں ہے۔“ عدیل اس کی بات پر ہنس پڑا۔

بشری محبت پاش نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ اتنے دنوں بعد دونوں اتنے خوشگوار موڈ میں یوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

درمیان میں سوئی مثال نے باپ کے قہقہے کی آواز پر زرا سی آنکھیں کھول کر دونوں کو دیکھا۔ انہیں خوش دیکھ کر پھر سے آنکھیں موندتے ہوئے عدیل کی کمر کے گرد اپنے بازو لپیٹ دیے۔

وہ بھی اسے جھک کر پیار کرنے لگا۔

”اور مثال کتنا خوش ہوگی جب صبح صبح اسے پتا چلے گا کہ ہم اسلام آباد اور مری جا رہے ہیں۔“ بشری بیٹی کو دیکھ کر بولی۔

”اور تم مجھ سے شرط لگا لو یہ داوی اماں ابھی بھی جاگ رہی ہے۔“

”جی نہیں مثال سو رہی ہے۔“ بشری اسے سوتے دیکھ کر بولی۔

”مثال جاگ رہی ہے جانو! آپ جاگ رہی ہونا!“

”نہیں بابا۔۔۔ میں سو رہی ہوں۔“ وہ اسی طرح آنکھیں بند کے بولی تو دونوں ہنس پڑنے۔

”اور پلیز تم کل تک ساری پیکنگ کر لیتا پرسوں اپنی مارتنگ ہمیں نکلتا ہے مطلب رات کو جلدی سونا ہے۔“ عدیل اسے تاکید کرتے بولا۔

”عدیل! مجھے اپنی اور مثال کی تھوڑی بہت شاپنگ تو کرنا ہوگی۔ ادھر تو آج کل سنو فال ہو رہی ہے نا۔“

”میں شام میں آؤں گا آس سے تو لے چلوں گا شاپنگ کے لیے۔ تم باقی کی پیکنگ کر لیتا۔“

”ہاں! وہ میں کر لوں گی اس کی آپ فکر نہ کریں۔“

”بشری! وہ عمران کے رشتے کا کیا بنا بھی۔ تم تو لڑکی کو پسند کر آئی تھیں نا۔“

”ہوں کچھ بھی نہیں ای اور عمران کو لڑکی کا قد چھوٹا لگا۔“ بشری کچھ افسردگی سے بولی۔

”اور مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔ پتا نہیں کیوں پہلے لوگ مجھے رنجیکٹ کرتے تھے تو ابی بہت دکھی ہوتی تھیں مگر اب بیٹے کے لیے وہ دوسرا معیار اپنائے ہوئے ہیں۔ بہت دل برا ہوا میرا اس بار شاید اس لیے کہ میں خود ایک بیٹی کی ماں ہوں۔“ وہ مثال کو پیار کرتے ہوئے افسردگی سے بولی۔

”ہماری مثال کی قسمت تو ان شاء اللہ اتنی خوب صورت ہوگی کہ لوگ مثال دیں گے کہ ان کی بیٹیوں کی قسمت بھی مثال جیسی ہو۔“ عدیل فخر سے بولا تو بشری نے آہستگی سے آئین کہتے ہوئے ایک بار پھر گہری نیند سوتی مثال کو پیار کیا۔

دونوں اس کی نیند خراب نہ ہونے کے خیال سے آہستہ آواز میں باتیں کرنے لگے۔



”مبارک ہو عاصمہ! زمین کا سوا ہوا گیا ہے اور ہمیں کل پیمنٹ ہو جائے گی۔“ عفان نے فون پر عاصمہ کو خوش خبری سنائی تو اسے جیسے اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آیا۔

”آپ سچ کہہ رہے ہیں عفان؟“

”لو اباجی سے خود بات کر لو۔ تمہیں یقین آجائے گا پھر تو۔“

عفان نے فون اباجی کو تھما دیا۔

اور عاصمہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سارے خوشی کے اس سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔

اباجی نے خود ہی اسے سب کچھ بتا کر فون بند کر دیا۔

اور وہ کتنی دیر تک ایسے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔

”اب ہمارا اپنا ایک ذاتی گھر ہو گا۔ میرا اپنا گھر۔ میرے بچوں کا گھر۔ گھر کے باہر میں خوب صورت سی نیم پیٹ لگواؤں گی جس پر اباجی کا اور عثمان کا نام لکھا ہو گا اور نیچے چھوٹا سا واٹن بھی لکھا ہو گا۔“

سوچتے ہوئے اس کی آنکھوں میں خواہ مخواہ آنسو آئے طے جارہے تھے۔ وہ بار بار آنکھیں صاف کر رہی تھی۔

”مما! کیوں رو رہی ہیں آپ؟“ واٹن ابھی کرکٹ کھیل کر آیا تھا ناں کو رو تے دیکھ کر پریشان سا ہو گیا۔

”میری جان لمبے تو خوشی کے آنسو ہیں۔“ وہ بے اختیار واٹن کو ساتھ لپٹا کر بولی۔

”کیا مطلب؟“ وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔

”تمہارے دادا کی زمین تھی نا۔ اس کا سودا ہو گیا ہے۔“ وہ خوشی سے کانپتی آواز میں بولی۔

”تو پھر کیا ملا؟“ وہ ابھی بھی کچھ نہیں سمجھ سکا تھا۔

”میری جان! اب ہم اپنا گھر لیں گے۔ اپنا خوب صورت سا گھر جس میں تم لوگوں کا الگ سے کمرہ ہو گا اور کھیلنے کے لیے کھلا مچن اور سہل اور بہت سے پھول پودے اور درخت، ہم مل کر لگائیں گے۔“ وہ پھر سے رونے لگی تھی۔

”تو ممما! آپ رو کیوں رہی ہیں؟“ واٹن ابھی بھی پریشان تھا۔

”بالکل بھی نہیں۔ میں تو ہنس رہی ہوں۔“ وہ روتے ہوئے ہنسنے لگی۔



”امی میں عدیل کے ساتھ ذرا شاپنگ کے لیے جا رہی تھی۔“ بشری تیار حلیے میں بولتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوئی اور بے اختیار ٹھنک کر رک گئی۔

سامنے فوزیہ کی ساس زیادہ بہت بے تکلف انداز میں صوفے پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھیں اور نسیم بیگم سے خوش گوار موڈ میں باتیں کر رہی تھیں۔

بشری کو اس لمحے شاپنگ پر جانے کا معاملہ کھٹائی میں پڑتا نظر آنے لگا۔ اس نے ست لہجے میں سلام کیا اور صوفے کے کنارے ٹک کر بیٹھ گئی۔ زیادہ اس کا خوب تنقیدی نظروں سے جائزہ لے رہی تھیں جن میں طنز اور تضحیک کا عنصر زیادہ نمایاں تھا۔ بشری کو خواہ مخواہ اپنی ہنگ کا احساس ہونے لگا۔

”کچھ چائے وغیرہ لے آؤ پہلے زیادہ بہن کے لیے پھر چلی جانا۔“ نسیم بیگم نے حتی الامکان لہجے کو میٹھا بنانے کی کوشش میں کامیاب رہیں۔

”کسی خاص شاپنگ کے لیے جا رہی ہے بہن! آپ کی بہو؟“ زیادہ نے بطور خاص بہن پر زور دے کر پوچھا۔

”ہاں وہ صبح عدیل اور بشری اسلام آباد اور مری جا رہے ہیں ناعدیل کو اسلام آباد میں آفس کا کوئی کام تھا تو سوچا بیوی بچوں کو ساتھ لے جائے۔“

نسیم نے وضاحت سے جواب دیا اگرچہ بشری کو یہ اچھا نہیں لگا کہ اتنی تفصیل سے محترمہ کو آگاہ کیا جائے۔

”بچوں کو۔ کتنے نیچے ہیں خیر سے عدیل میاں کے؟“ زیادہ ہونٹوں کو گول کر کے بولیں۔

”کتنی فسادی عورت ہے؟“ بشری دل میں تلملائی۔

”کہاں بہن! ایک بچی ہے۔ آٹھ سالوں میں، سو بیگم نے ایک پوتی لے کر ہری جھنڈی دکھادی ہے۔“ نسیم بیگم کی دکھتی رنگ پر اس عورت نے کس ہوشیاری سے ہاتھ رکھا تھا۔

”کیوں خدا خواہستہ کوئی مسئلہ ہے؟“ وہ بھولپن سے پوچھنے لگیں۔

”اللہ جانے۔ علاج تو بہت کرائے مگر ڈاکٹر زکتے ہیں دونوں ٹھیک ہیں۔ بس اللہ کی طرف سے دیر ہے۔“ نسیم

بیگم نے سر آہ بھر کر نظریں بشری پر جمائیں۔

”بچ بچ۔ پھر تو صاف جا دو لوٹنے کا معاملہ لگتا ہے۔“ زیادہ لہجے میں مقدور بھر پور رویہ سموکھ کر بولیں۔

”اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہم تو سمجھیں نا امید ہو چلے اب تو۔“ نسیم بیگم کچھ بے زاری سے بولی تھیں۔ بشری کو بہت برا لگا۔

”میں جاؤں پھر امی؟“ وہ اور نہیں بیٹھ سکی۔

”کہا ناں کچھ کھانے پینے کو تولے آؤ پھر چلی جانا واپسی تو تم لوگوں کی یوں بھی رات سے پہلے کہاں ہو گی؟“ نسیم اب کے لحاظ مروت ہٹا کر بولیں۔

”جی میں لاتی ہوں۔“ وہ مرے ہوئے لہجے میں کہہ کر جانے لگی۔

”بھئی! برا نہیں ماننا۔ ساس بھی ماں کے برابر ہوتی ہے۔ اس کا کہا تو یوں بھی حق جانو کہ وہ تمہارے شوہر کی ماں ہوتی ہے۔ شوہر جسے خدا نے بھی مجازی خدا کہا ہے۔ خدا کے بعد اگر جسے سجدے کا حکم دیا جاسکتا تھا۔ اس عورت کی اطاعت اور فرماں برداری میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھنی چاہیے۔

بہن! میں ذرا پرانے خیالات کی ہوں۔ جی تو ذکر میں نے اپنی ساس کی خدمت کی تھی۔ بستر لٹا کر اسے چھ سال سمجھو پاتھوں پر اٹھائے رکھا تھا۔ میں نے تو خواہ مخواہ آج کل کی لڑکیوں کو ساس سے ایسے اکھڑے لہجے میں بات کرتے دیکھی ہوں تو بہت دل دکھ سا جاتا ہے۔“ وہ بولے بغیر نہ نہیں سکی تھیں۔

بشری کا جی چاہا اس فراڈ عورت کو یہیں کھڑے کھڑے چھ آٹھ اچھی اچھی سنائے جو کس صفائی سے دوسروں کو بے وقوف بنا رہی تھی۔

”نہیں بہن! آپ کچھ غلط نہیں۔ اصل میں تو آج کل ماؤں کی تربیت ہی کچھ ایسی ہے۔ بیٹیوں کو اگلے گھروں کے بارے میں تو کچھ بتاتی نہیں، صرف ادب تمیز اپنے ماں باپ کے لیے ہوتی ہے ان لڑکیوں کی نظر میں۔ خیر ہمیں تو عادت ہو گئی ہے اب سب کچھ برداشت کرنے کی۔“

نسیم بیگم یوں ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں جیسے پتا نہیں ہو کے ہاتھوں کتنے جبر سہ چکی ہیں۔

”میری فوزیہ کی گھٹی میں اللہ کے فضل سے ایسا ادب تمیز لحاظ بھرا ہے۔ میں تو میں محلے کی کوئی خالہ جان بھی آجائے تو اس کے آگے بھی ایسے کچھی جالی ہے۔ بہت ہی عاجزی ہے میری فوزیہ کی طبیعت میں۔“

اب بشری سے مزید رکنا محال ہو گیا۔ وہ کچھ بھی کہے بغیر خاموشی سے باہر نکل آئی۔

”ویسے بہن! برا نہیں ماننا۔ شادی کے آٹھ سال بعد بھلا کیا تک بنتی ہے، ہنی مون پہ جانے کی۔“ بشری کے قدم اس عورت کی بات پر وہیں رک گئے۔

”ہنی مون؟“ بے چاری نسیم بشری کی نظریں کتنی بھی تیز طرار تھیں مگر زیادہ کے آگے اس وقت وہ بھی پانی بھرتی نظر آئیں۔

”اور نہیں تو کیا؟“

”میں سمجھی نہیں۔ وہ تو عدیل کو دفتر کا کام تھا تو۔“ نسیم بیگم نے پھر سے وہ سبق دہرائنا چاہا۔

”اے بہن! بہت ہی سادہ ہیں آپ تو، سچ جھوٹ کو نہیں پرکھ سکیں۔“

نسیم بیگم کچھ بول ہی نہ سکیں۔

”سب ڈراما سے دفتر کے کام کا، مجھ سے لکھو الو۔ دونوں نے مل کر گھونٹنے پھرنے کا پروگرام پہلے سے بنا رکھا تھا۔ دفتر ہی کام کا بہانہ بنا کر تمہیں بس بے وقوف بنا رہے ہو اور کچھ بھی نہیں۔“

”بھی جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے اس رشتے داری کو قائم ہوئے اور۔۔۔ فسادی عورت۔ فوزیہ بی بی! تم اپنی

”خیر مناؤ۔“ بشری مڑ کر جانے لگی۔
 ”اور وہ کبھی بہن! اکل کو تم نے بیٹی بیاہنی ہے پھر اس کے لیے کتنے اخراجات ہوتے ہیں، ہو پٹنایوں سیرپاٹوں پر
 رقیں اڑاتے رہے تو آخر میں تمہیں ہی پریشان ہونا پڑے گا۔“ وہ تو جیسے آج بشری اور عدیل کا سیرپاٹا منسوخ
 کرا کے ہی جانے والی تھیں۔

”اور صاف کہوں بہن!“ تم نے اپنی ہوا اور بیٹے کو بہت چھوٹ دے رکھی ہے۔ تمہارا عدیل تو اس بشری کی
 منگی میں ہے، اکل کو فوزیہ بیٹی اپنے گھر چلی جائے گی تو سوچو یہ بشری کیا تمہیں عزت دے گی اس گھر میں؟“
 ”ہاں! یہ تو میں بھی جب سوچتی ہوں تو کچھ منہ کو آنے لگتا ہے۔ کیا کروں آخر میں تو اپنا راج چاٹ گھریا سب
 کچھ ان غیر لڑکیوں کو سونپنا ہی پڑتا ہے، نسیم بیگم گلو گیر آواز میں بولیں۔“
 ”طریقے اور ہوشیاری سے چلو تو بہت کچھ اپنے پاس رکھ کر انہیں قابو میں رکھا جاسکتا ہے۔“

”کیسے زاہدہ بہن! نسیم بیگم ہوشیار ہو کر بولیں۔“
 ”بہت سادہ ہیں نسیم بہن آپ۔ سنئے۔“ وہ آہستہ آواز میں نسیم بیگم سے کچھ کہنے لگیں تو بشری غصے میں پیر پختی
 وہاں سے چلی گئی۔

فوزیہ کو اپنی ساس کو چائے دینے کا کہہ کر وہ عدیل کے ساتھ خود ہی گھر سے نکل آئی۔



”بھاڑ میں چائے منگوس عورت۔ میں کیوں اس کی خاطر دارت کروں۔ ایسی مکار عورتیں کسی عزت کے لائق
 نہیں ہوتیں۔“ وہ گاڑی میں بیٹھ کر بھی کڑھتی رہی۔

”مما! آپ کو غصہ آ رہا ہے۔“ مثال پیچھے سے اس پر جھک کر بولی۔ بشری نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
 ”بھئی سوری! میں تو ناٹم پر نکل آیا تھا اُنس سے مگر رتے میں اتا ر ش تھا اور تمہارے سامنے میں تو اندر ہی
 نہیں آیا کہ مزید لیٹ نہ ہو جائیں پھر بھی تمہارا موڈ آف ہے۔“ وہ صفائی دیتے ہوئے بولا۔
 ”نہیں! موڈ کب آف ہے۔ وہ فوزیہ کی ساس آگئی تھیں۔“ اس سے بتانا ہی بڑا۔
 ”کیا۔ اور تم نے مجھے بتایا بھی نہیں۔“ عدیل ایک دم پریشان سا ہو گیا۔ ”امی ناراض ہوں گی کہ میں ان سے
 ملے بغیر یا ہر ہی سے تمہیں لے کر چلا آیا۔“

”نہیں ہوں گی۔ امی کو بتا آئی تھی۔“ بشری جلدی سے بولی کہ کہیں عدیل واپسی کے لیے گاڑی نہ موڑ لے۔
 ”اور یوں بھی وہ تھوڑی دیر کے لیے آئی تھیں۔ زیادہ بیٹھیں گی نہیں۔“ بشری عدیل کے سنجیدہ چہرے کو دیکھ کر
 پھر سے بولی۔

”یار! تمہیں مجھے اندر تو آنے دینا تھا۔ کوئی مسئلہ نہ ہو جائے۔“ عدیل کو نئی فکر ستانے لگی۔
 ”کچھ نہیں ہوتا، میں مل تو آئی تھی ان سے اور انہیں بتا بھی آئی تھی کہ ہم جا رہے ہیں اور ہمیں دیر بھی
 ہو چکی ہے۔“ بشری ازل میں پچھتا رہی تھی کہ عدیل کو کیوں بتایا۔

”عدیل! صبح ہم کتنے بچے نکلیں، جانے کے لیے۔“ اس نے عدیل کا دھیان بٹانا چاہا۔ وہ کچھ دیر بول ہی نہیں
 سکا۔

”یوں کریں لعنت بھیجیں شاپنگ ریگھر واپس چلتے ہیں۔ پہلے آپ اچھی طرح ان خاتون سے مل لیں۔ کورنش
 بجالا میں۔ پھر اگر ناٹم بچا تو شاپنگ کے لیے نکل چلیں گے۔ یوں بھی شاپنگ کچھ اتنی ضروری نہیں ہے۔ چلیں
 واپس۔“ بشری کو بھی ایک دم سے غصہ آ گیا۔

”ہم واپس جا رہے ہیں گھر مانا؟“ مثال فوراً ”ہے جین، ہو کر بولی۔“
 ”تم جب کر کے بیٹھو۔“ بشری نے اسے بھی جھڑک دیا۔
 ”سہم تم کو آرام سے بیٹھ گئی۔“
 ”اس کو خواہ مخواہ کیوں جھڑک رہی ہو۔“ عدیل خنگلی سے بولا۔

”اب واپس چلیں بس۔“ وہ ٹھیلے پن سے بولی پہلے اس عورت نے کہو اس کر کے موڈ خراب کیا اور اب یہ
 عدیل۔ اسے جیسے روٹنا ہی آنے لگا تھا۔

”اچھا خواہ مخواہ موڈ خراب کرنے کی ضرورت نہیں۔ کوئی نہیں واپس جا رہا۔ میں گھر جا کر امی سے بات کر لوں
 گا۔ یوں بھی ہم نے کون سی لمبی چوڑی شاپنگ کرنی ہے۔ وقت پر گھر پہنچ جائیں گے۔ موڈ ٹھیک کرنا اپنا
 پلینز۔“ عدیل اس کے پھولے ہوئے چہرے کو دیکھ کر قدرے نرمی سے بولا۔
 ”ٹھیک ہے میزا موڈ مگر عدیل! بہتر ہے ہم گھر واپس چلیں۔“
 وہ پھر بولی۔ عدیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔



”امی! یوں سمجھیں ہماری کوئی نیکی کام آگئی جو اللہ نے ہمیں ظہیر اور اس کی ماں سے بچا لیا۔“
 واپسی پر عدیل کے نہ ماننے کے باوجود بشری اصرار کر کے ذکیہ سے ملنے کے لیے آگئی تھی۔

”عدیل سفر پر جانے سے پہلے میں کم از کم امی سے کھڑے کھڑے تو مل لوں۔ یقین کریں زیادہ ٹائم نہیں لگاؤں
 گی۔“ اس نے بد وقت عدیل کو منہ ہی لیا تھا اور یہ عدیل کی خولی تھی۔ بشری کی کوئی بات مانتا نہیں تھا۔

”ہاں اور نہیں تو کیا۔ میں نے تو جب ابو اور دھڑ سے کچھ ایسی ایسی باتیں ان ماں بیٹے کے بارے میں سنیں تب
 ہی میں کھٹک گئی تھی۔ اگرچہ تین مہینے کی پکا پکا ہی سہی رشتہ قائم رہا تھا تمہارا اور ظہیر کا۔“ ذکیہ سر ہلا کر بولیں۔

”اور کمال دیکھیں۔ میں ظہیر کو اور اس کی ماں کو فوزیہ کے رشتہ کے دوران بچان ہی نہیں سکی۔“
 ”اور امی! یہ زاہدہ آئی بہت تیز ہیں۔ انہیں سب یاد آچکا ہے۔“ صاف لگ رہا ہے اس وقت رشتہ نہ ہو سکنے
 کا بدلہ لے رہی ہیں امی کے کان بھر بھر کر۔“

”بھربھلے جتنے مرضی آخر کو کیا ہاتھ آئے گا۔ وہ اگر سیر ہیں محترمہ تو ان کی ہونے والی ہو سوا سیر ہے۔ دیکھنا کہ کیا
 کیا تماشے نہیں ہوں گے۔ ذرا فوزیہ کو اس کے گھر پہنچ تو لینے دو۔“ ذکیہ ٹھٹھا لگا کر بولیں۔

”ہاں امی! یہ منظر تو واقعی دیکھنے والا ہو گا اور وہ جو شام کو امی کے کان بھر رہی تھیں کہ تمہارا بیٹا تو اس چلتے بشری
 کی منگی میں ہے۔ دیکھوں گی شادی کے بعد اپنے بیٹے کو کیسے قابو میں رکھیں گی خاتون۔“ بشری بھی مزالے کر
 بولی۔ اسی وقت عدیل دیر ہو جانے کے خیال سے اسے بلا نے کے لیے چلا آیا۔

”عدیل کو تو بتا نہیں چلا کہ تمہارا اور ظہیر کا پہلے رشتہ طے ہو گیا تھا۔“ ذکیہ بیگم کو کچھ یاد آیا تو پوچھنے لگیں۔
 ”تو یہ کریں امی! میں نے اپنی شامت لالی ہے۔ لاکھ عدیل مجھ پر جان چھڑکتے ہوں مگر اس طرح کی بات اگر
 انہیں بتا چل جائے۔ یہ مرد بہت شکی مزاج ہوتے ہیں باقی کی خالی تصویر کے خاکے میں خود سے رنگ بھر لیتے ہیں۔
 میں تو۔“ وہ بولتے ہوئے مڑی اور پھر ٹھنک کر رہ گئی۔ اس کے سامنے عدیل کھڑا اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا
 تھا۔

بشری عجلت میں ماں کو خدا حافظ کے بغیر ہی گھر سے نکل گئی۔



”لیکن عفتان! آپ تو کہہ رہے تھے نکل آجائیں گے۔ آج کا بھی سارا دن گزر گیا۔ آپ کا انتظار کرتے۔ اب تورات ہو گئی ہے۔“ عاصمہ متفکر سی فون پر عفتان سے بات کر رہی تھی۔

”ہاں کہا تو تھا مگر کھو! ان کاموں میں دیر سویر تو ہوتی جاتی ہے۔ ابھی تو شاید کل کا دن بھی لگ جائے۔“ عفتان سنے جو اسید دیا۔

”یہ نہ کہیں خدا کے لیے! میں کیسی تھک گئی ہوں۔ گھر بچوں کو سنبھالتے سنبھالتے۔“ عاصمہ بے حد تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔

”مگر یہ بھی تو دیکھو نا زندگی بھر کا آرام بھی تو تمہیں ہی ملنے والا ہے۔ دو تین ملازم بھی رکھ لینا۔ شان دار سا گھر گاڑی۔“ عفتان اسے لالچ دینے کو بولا۔

”خیر اب ایسا بھی نہیں زندگی بھر خود ہی کام کیا ہے اپنے گھر اور بچوں کا۔ کام کرنا تو مجھے کبھی بھی نہیں دکھا مگر عفتان! یوں اکیلا رہنا بہت تکلیف دہ ہے۔ آپ اور اباجی کے بغیر رہنا۔“ عاصمہ افسردگی سے بولی۔

”یوں لگتا ہے جیسے سارا گھر خالی ہو۔ بچے بھی اتنے چپ ہیں نہ شرارتیں نہ ضدیں۔ وہ آپ دونوں کے سامنے ہی تنگ کرتے تھے مجھے۔“

”پھر تو اچھی بات ہے۔ تم مزے میں ہو۔ نہ ہماری ٹینشن نہ بچوں کی پریشانی یا راز مزے کرو۔“ وہ اسے چھیڑ کر بولا۔

”خدا کے لیے عفتان! میں اب رو پڑوں گی۔“ وہ رو بانسی ہو کر بولی۔

”اچھا بابا! کل آجائیں گے ہم۔ شام سے پہلے گھر ہوں گے۔ تم پریشان نہیں ہو اور سنو! رات میں گھر کے لاک ڈرو اور اچھی طرح بند کر کے سویا کرو۔“ عفتان نے تاکید کیا۔

”کرتی ہوں۔ ہر بار یہ ہی نصیحت کرتے ہیں۔ آپ سے زیادہ مجھے اس بات کا خیال رہتا ہے پھر بچے بھی تو ہیں ماما! وہ دروازہ بند کریں۔ ماما چھت کا دروازہ لاک کیا۔ باہر کی گھڑکیاں بند کریں۔ تینوں کی طبیعت آپ پہ گئی ہے۔ احتیاط ہی احتیاط۔“ وہ چ کر بولی۔

”تو تیار! اچھی بات ہے نا احتیاط تو۔“

”عفتان! وہ ایجنٹ ہے نا جسے آپ گھر دیکھ رکھنے کا کہہ گئے تھے وہ آج آیا تھا۔ کہہ رہا تھا اس نے بہت زبردست تین گھر دیکھے ہیں ہمارے لیے۔“ وہ ذرا پر جوش ہو کر بتانے لگی۔

”یار! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ بس ہم آتے ہیں تو ان شاء اللہ پہلا کام یہ ہی کریں گے۔ تم بھی بس تیاری رکھو۔ سوئی سوئی پیکنگ شروع کرو وہم نے تو بنا بنا یا گھر لیتا ہے۔ ٹرک کروا کے سامان لدا دیا اور بس شفٹ ہو گئے۔“

”ان شاء اللہ میں جتنی بے چینی ہے چینی سے اس گھڑی کا انتظار کر رہی ہوں کوئی میرے دل سے پوچھے۔ بچے بھی بار بار پوچھتے ہیں۔ ماما! گھر میں کب جائیں گے۔“ وہ اشتیاق سے بتانے لگی۔

”ان شاء اللہ بہت جلد۔ اب تم آرام کرو کل ہم نکلنے سے پہلے تمہیں فون کر دیں گے۔“ عفتان نے فون بند کرنا چاہا۔

”عفتان! اباجی سے تو آپ نے بات کرائی نہیں میری۔“

”وہ سو گئے ہیں۔ تھک جاتے ہیں۔ دن بھر نہ جانے کہاں کہاں سے بچپن کے یاد دہشت ان سے ملنے آتے ہیں تو انہیں آرام کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔“

”وہ اپنی میڈیسن تو لے رہے ہیں نا باقاعدگی سے۔“ وہ فکر مندی سے پوچھنے لگی۔ ”اباجی دو لینے کے معاملے

میں بہت لا پرواہ ہیں آپ تو خیال کرتے ہیں نا!“

”دعا کٹر صاحب! بالکل خیال کرتا ہوں اور پابندی سے انہیں قائم پر دے رہا ہوں۔ تم فکر نہیں کرو۔“ عفتان نے اسے تسلی دی۔ ”اب تم سو جاؤ۔ صبح بچوں کو اسکول بھجوانا ہو گا تم نے۔“ عفتان نے اسے یاد دلایا۔ ”میں بھی کافی تھک گیا ہوں۔ آرام کروں گا۔ یہاں تو یوں بھی صبح منہ اندھیرے ہی ہو جاتی ہے سب اٹھ جاتے ہیں۔“

”دچلیں پھر آپ اپنا خیال رکھیے گا اور پلیز کل ضرور آجائیں۔ بہت اداس ہو گئی ہوں میں آپ کے بغیر کبھی اتنے دن اکیلے رہی بھی نہیں۔“ عاصمہ پھر بے قراری سے بولی۔

”میں کب۔ رہا ہوں تمہارے بغیر۔ بہت عجیب سا لگ رہا ہے جیسے خالی خالی سا ہو گیا ہوں۔“ عفتان نے آہستگی سے کہا تو عاصمہ کو بہت خوشی سی محسوس ہوئی جدائی کا دکھ ان کا دل بھی تو سہرا رہا ہے۔ اس کڑی دھوپ میں صرف میں تو نہیں جل رہی۔ اس کی ساری اداسی ساری تھکن جیسے غائب ہو گئی اس نے مسکراتے ہوئے فون بند کرتے ہی وردہ کو گور میں اٹھالیا اور عفتان کو سوچ کر مسکرانے لگی۔



”ظہیر کے ساتھ۔ تمہارا کیا تعلق تھا؟“

بشری کو قطعاً توقع نہیں تھی کہ عدیل کے خراب موڈ کا نتیجہ گھر جاتے ہی یہ جملہ نکلے گا۔

فوری طور پر تو وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکی بس یوں ہی خالی خالی نظروں سے اسے دیکھے گئی۔ اس نے تو گھر آ کر نسیم بیگم کے طعنوں تشنیوں کی بھی پروا نہیں کی تھی جو ان کے گھر آتے ہی بولنا شروع ہو گئی تھیں۔

اور یہ پہلی بار تھا کہ عدیل مل سے کوئی بھی بات کیے بغیر فونز کے خراب موڈ کا سبب جانے بغیر خاموشی سے اپنے بیڈ روم میں چلا آیا تھا۔

”بیوی نے اپنا دم چھٹا بنا لیا ہے امی! جتنا مرضی آپ جیتی چلاتی رہیں وہ حضرت کب سن رہے ہیں۔ ان کے کانوں میں آپ کی کوئی آواز نہیں پڑ رہی۔“

فونز نے دونوں کو آگے پیچھے کرے میں جاتے دیکھ کر جلتی ریتل کا کام کیا تھا۔ نسیم بیگم کے بولنے میں اور بھی تیزی آگئی۔ مگر اب وہاں سننے کے لیے کوئی نہیں تھا۔ بشری نے فون چہرے کے ساتھ کچھ بولنے کی کوشش کی۔

”خبردار! ایک لفظ جھوٹ تمہارے منہ سے نہیں نکلنا چاہیے بشری! ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ تم میری کون ہو اور۔۔۔ میں تمہارا کون؟“

انتا سخت رویہ۔ ایسے ظالم رد عمل کی توقع کم از کم بشری کو عدیل سے نہیں تھی۔ اس کا حلق جیسے کانٹوں سے بھر گیا۔ وہ کوشش کے باوجود کچھ بول نہیں پائی۔ آنکھوں میں ایک دم ہی ڈھیر سا راپانی اکٹھا ہو گیا۔

”میری سامنے کوئی ڈراما کرنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے یہ آنسو اس وقت۔۔۔ اس وقت مجھ پر کچھ اثر نہیں کریں گے انڈر اسٹینڈ!“ وہ پھر سے گرج کر بولا تو بشری نے تیزی سے آنسو صاف کر کے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر زبان تو اس کی جیسے جکڑی گئی تھی۔

”کیا تعلق تھا تمہارا اور ظہیر کا؟“ اس نے اپنا سوال دہرایا۔

”کوئی تعلق۔۔۔ کوئی تعلق نہیں تھا۔۔۔ ہمارا اور خدا نخواستہ کیوں ہونے لگا۔“ اس نے گلے میں پھنسی ہوئی آواز نکالی مگر پھر بھی جسم ہکا ہکا کانب رہا تھا اور آواز کی کپکپاہٹ تو اور بھی نمایاں تھی۔

”کیوں اتنا برا شخص ہے وہ کہ تمہیں اس سے تعلق رکھنے پر بھی شرم آنے لگی؟“ عدیل طنز سے بولا اور ان آٹھ سالوں میں وہ پہلی بار نسیم بیگم کا بیٹا لگا تھا۔ وہ اس سے ڈری بھی پہلی بار ہی تھی اس طرح۔

سیدھا کر کے لیٹ گیا۔ بشری ابے بس نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

وہ کچھ دیر یوں ہی بیٹھی رہی۔

ان کی شاپنگ بھی یوں ہی بڑی تھی کچھ مثال کے کپڑے بھی رکھنے والے تھے۔ اب پتا نہیں صبح انہوں نے جانا تھا یا نہیں۔ وہ بیٹھی لب چبائی رہی۔ اتنی ہمت ہی نہیں ہو سکی کہ دو جو آنکھوں پر بازو رکھے یوں اجنبی بنا لیا ہے اس سے پوچھ ہی لے۔

”سو جاؤ گیوں میرے سر پر سوار ہو کر کیا بیٹھ گئی ہو۔ نہیں نیند آرہی تو باہر چلی جاؤ اور لاسٹ آف کرو۔“ وہ کروٹ لیتے ہوئے کرتلی سے بولا تو وہ آہستگی سے اٹھی اور لاسٹ آف کر کے اس کے برابر آکر لیٹ گئی۔

کتنی دیر تک اسے نیند نہیں آئی کہ اس جرم کی سزا جو نہ اس سے سرزد ہو انہ جس کے وقوع ہونے میں ہی اس کا کوئی ہاتھ تھا۔ اس کے سر پر لگا دیا گیا تھا۔

وہ آنکھوں میں آئی نمی کو غسل کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

”ارے مگر آپ نے تو بتایا ہی نہیں کہ آپ اتنی جلدی آجائیں گے۔ اباجی کہاں ہیں۔ اکیلے آئے ہیں کیا؟“

عاصمہ دروازہ کھول کر کچھ پریشان سی عفتان کے ساتھ آتے ہوئے بولی۔

”بہت ایمر جنسی میں آیا ہوں۔ سب کچھ ریڈی تھا صرف اباجی کے اور دوسری پارٹی کے سائے تھے۔ وکیل پیواری گواہ سب موجود اور اباجی کے اور بیٹل ڈاکو منٹس ندرہ۔“ عفتان جھلائے ہوئے انداز میں کہتا سیدھا اباجی کے کمرے میں بنی الماری کی طرف بڑھا۔

”افوہ! سانس تو لے لیں۔ میں پانی لے کر آتی ہوں آپ کے لیے۔ سفر سے آئے ہیں بیٹھ تو جائیں۔“ عاصمہ

جلدی سے پانی لاتے ہوئے بولی۔

”ایمان سے ایک ہفتہ غارت ہو گیا۔ اب تمہیں پتا ہے مزید چھٹی بھی نہیں مل سکتی اور کل میری آخری چھٹی ہے۔ اباجی بھی حد کرتے ہیں سب سے ضروری کاغذ ہی لے جانا بھول گئے۔ اب گاؤں کوئی ساتھ کی گلی میں تو ہے

نہیں۔“ عفتان پانی کا پورا گلاس چڑھا کر جھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

”اچھا چلیں، ہو جا آئے۔ اب ان کی عمر ایسی ہے۔ کہاں سب کچھ یاد رہتا ہے۔ آپ تسلی سے کاغذ نکالیں۔

میں کھانا بنا رہی ہوں کھا کر جائیں گے اب آپ۔“ وہ کپن کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

”نہیں یا رابست دیر ہو جائے گی۔“ عفتان الماری سے مختلف خائیں نکالتے ہوئے بولا۔

”کوئی دیر نہیں، کوئی ذرا دیر میں بچے بھی آنے والے ہیں۔ اتنے اداس ہو رہے ہیں آپ کے بغیر مل کر جائے گا۔“

”لول گئے۔ یہ پیپر تھے۔ ذرا سے کام کے لیے اتنی دور آنا پڑا۔“ وہ فائل میں سے پیپر نکالتے ہوئے باقی کی

چیزیں احتیاط سے الماری میں رکھنے لگا۔

”کیا پکار رہی ہو آج عاصمہ؟“ وہ فارغ ہو کر کپن ہی میں آ گیا۔

”گو بھی گوشت ہے آپ کی پسند کا۔ میں نے سوچا آج تو آپ نے آجانا ہے تو۔“ عاصمہ پھکی سی مسکراہٹ سے بولی۔

”ہاں دیکھو ابھی نکلوں گا تو واپسی ظاہر ہے۔ ادھر بھی ساری قانونی کارروائی میں بہت تو لگے گا۔ مجھے تو لگتا ہے

آج بھی واپسی مشکل ہے۔“ وہ دہیں کرسی پر بیٹھ گیا۔ عاصمہ جلدی جلدی سالن بھوننے لگی۔ فریج سے آٹا نکال

کوتی، بس نہیں میں نے ہمیشہ اپنی بس۔“

”بس کرو یہ جھوٹ بچ ملانا۔ سو جاؤ۔ میرے سر میں پہلے ہی بہت درد ہو رہا ہے۔“ وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر تکی

”عدیل! جس طرح آپ کا پردہ پوزل آیا تھا میرے لیے اسی طرح آپ سے پہلے ظہیر کا بھی آیا تھا اور کچھ دن بات کچی کچی چلتی رہی تھی۔“ اسے احساس ہوا کہ اب اگر اس نے سنبھل کر ٹھیک ٹھیک جواب نہ دیے تو پھر عمر بھر خود کو کوستی رہے گی اس لیے اب کے قدرے مضبوط لہجے میں بولی۔

”کچی کچی۔ یا کچی۔“ وہ جتا کر بولا۔

”ایسا کچھ ہوتا تو ہم کیوں آپ سے کچھ چھپاتے۔“ وہ بھی ڈٹ کر بولی۔

”ہم۔“ وہ زور دے کر بولا۔

”تم جب یہ سب جانتی تھیں تو جب فوزیہ کے لیے ظہیر کا رشتہ آیا اس وقت تم نے یہ بات کیوں نہیں کی۔“

”عدیل! وہ تڑپ کر رہ گئی۔

”تمہارے دل میں چور تھا نا۔“

”عدیل!“ اسے خود بھی پتا نہیں چلا کہ اس کی آواز یا ہر تک گئی۔

”سچی بات پر اتنا اویلا؟“ وہ بھی مزے سے بولا۔

وہ جیسے ایک دم نڈھال سی ہو گئی۔

”ذرا سی معمولی بات کو آپ نے کیا رنگ دے ڈالا ہے۔“ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

”مجھ پر تو شاید آپ کو یقین نہیں۔ مگر اللہ کی قسم یہ تو آپ کو یقین آئے گا نا۔ میں کبھی قسم نہیں کھاتی۔ مگر

آج اللہ کی قسم کھا کر کہہ رہی ہوں اور عدیل! آپ کو یقین کرنا پڑے گا۔ مجھے بالکل بھی ظہیر یاد نہیں تھا۔ اس کا چہرہ

نہ پر پوزل والی بات عین نکاح والے دن مجھے احساس ہوا کہ میں ظہیر سے پہلے بھی مل چکی ہوں۔ مطلب دیکھ چکی

ہوں۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”تم لوگوں نے یہ رشتہ کیوں چھوڑا تھا۔“ بہت دیر کی خاموشی کے بعد وہ اس پر نظر جما کر بولا۔ بشری فوری طور پر

کوئی جواب نہ دے سکی۔

”تم لوگوں نے رشتہ چھوڑا تھا یا انہوں نے جواب دیا تھا؟“ وہ پھر سے بولا۔

”ہم۔ ہم نے جواب دیا تھا۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”کیوں؟“ وہ پھر سے دہرا کر بولا۔

”ہمیں پتا چلا تھا کہ وہ۔۔۔ یہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔“ وہ سر جھکا اعتراف کر کے بولی۔ عدیل اسے کھا جانے والی

نظروں سے دکھتا رہا۔

”میری، بس نے کبھی تمہارے ساتھ اتنا برا تو نہیں کیا کہ تم اس طرح بدلہ لیتیں۔“ وہ سخت آواز میں بولا۔

”نہیں۔ خدا کے لیے میں پتا چکی ہوں۔ مجھے یاد نہیں تھا۔“

”تو اپنی اہل جان سے پوچھ لیتیں۔ انہیں تو اس صدی کے شروع میں ہونے والے چھوٹے بڑے سب واقعے

یاد ہوتے ہیں۔“ وہ طنز سے بولا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

وہ جیسے نڈھال ہو کر سر تھام کر بیٹھ گیا۔ وہ بھی اس کے پاس بیٹھ گئی اور آہستگی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر

کچھ بولنے لگی تھی کہ اس نے زور سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”عدیل پلیز۔ یہ تو قسمت کے کھیل ہوتے ہیں۔ اس وقت یہ رشتہ میرے نصیب میں نہیں تھا۔ خدا گواہ

ہے۔ اگر مجھے یاد آجاتا تو میں ضرور آپ کو بتاتی اور فوزیہ سے مجھے خدا انخواستہ کوئی دشمنی کیوں ہونے لگے گی۔ میری

کوئی، بس نہیں میں نے ہمیشہ اپنی بس۔“

”بس کرو یہ جھوٹ بچ ملانا۔ سو جاؤ۔ میرے سر میں پہلے ہی بہت درد ہو رہا ہے۔“ وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر تکی

کر رکھا اور دوسری طرف تو اچھو لے پر رکھا۔

”آپ کو شش تو کیجئے گا واپسی کی۔“

”یار! میں تو خورنگ آگیا ہوں۔ ابا جی بھی بے زار ہوئے پڑے ہیں۔ اب ایک اور دن کی مشکل تو ہے۔“

عفان سلا کاٹنے لگا۔

”عفان! کتنے میں سووا ہوا ہے۔ یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں۔“ بہت دنوں سے دل میں مچلتا سوال آخر اس کے لبوں پر آئی گیا۔

”اچھا میں نے تمہیں نہیں بتایا۔“ وہ کچھ حیران سا ہوا۔

”کسب؟ میں تو منتظر ہوں کہ آپ بتائیں گے۔“ وہ حنا کر بولی۔

”تمہارے خوابوں میں مجھو سارے رنگ بھرنے والے ہیں۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”اب بتا بھی دیں مجھ سے اور صبر نہیں ہوتا۔“ وہ بے صبری سے بولی۔

”اچھا تو کیس کرو! کتنے میں زمین نکل ہوگی۔“

”عفان... میں نے کبھی کسی چیز کا بھی سووا نہیں کیا۔ یقین کریں مجھے بالکل آئیڈیا نہیں۔ اب خود سے بتادیں نا!“ وہ بہت منت سے بولی۔

”بہت بھولی ہیں بھئی ہماری بیگم۔“ وہ مسکرا کر بولا ”ڈیڑھ کروڑ میں دن ہوا ہے اور تارے؟ اچھی کہہ لو یا بری بات یہ ہے کہ وہ لوگ پیمینٹ کیش کی شکل میں کر رہے ہیں حالانکہ میں اس چیز کے حق میں نہیں تھا۔ وہ چیک بنا دیتے یا ڈرافٹ مگر ابا جی نہیں مانے کہ اس میں فراڈ کا چانس ہو سکتا ہے مگر اس میں رسک بھی بہت ہے اور فائدہ بھی کہ آتے ہی گھر کا سودا کر لیں گے۔“

”یہ تو اچھی بات ہے۔ آپ کے پاس ڈگریٹم ہوتا تو آپ ظفر بھائی کے ساتھ جا کر ایک دو گھر ہی دیکھ آتے۔“ اس نے پھرتی سے روٹی توڑے سے اتار کر عفان کے آگے کھانا لگا دیا۔

”نہیں یار۔۔۔ بالکل بھی ٹائم نہیں۔ اب جو بھی ہو گا واپسی پر ان اشاء اللہ۔“ وہ جلدی جلدی کھانا کھانے لگا۔

عاصمہ روٹیاں پکا کر اس سے پاس ہی بیٹھ گئی اور اس سے باتیں کرنے لگی۔

عاصمہ روٹیاں پکا کر اس سے پاس ہی بیٹھ گئی اور اس سے باتیں کرنے لگی۔

عاصمہ روٹیاں پکا کر اس سے پاس ہی بیٹھ گئی اور اس سے باتیں کرنے لگی۔

”اب کیا باقی کار سہ اسی طرح کئے گا؟“ عدیل کو سنجیدگی سے گاڑی چلا تے دیکھ کر بشری بولی ہی پڑی مثال دونوں کو وقتاً فوقتاً دیکھ رہی تھی۔

ممایا کی لڑائی ہوئی ہے۔ وہ قیاس تو کر چکی تھی مگر دونوں کے خراب موڈ کو دیکھ کر پوچھنے کا حوصلہ نہیں ہوا تھا۔

”کیوں کیا ہوا ہے؟“ عدیل اسی سنجیدگی سے بولا۔

بشری شکر کر رہی تھی کہ صبح اٹھ کر عدیل نے پروگرام ملتوی نہیں کیا۔ صرف اتنا ہوا کہ وہ لوگ پروگرام سے ایک گھنٹہ لیٹ گھر سے نکلے۔ نسیم بیگم اور فوزیہ کے موڈ اسی طرح برہم تھے۔

عدیل کچھ دیر کے لیے ماں کے کمرے میں گیا تھا۔ انہیں دفتر کے کام کی مجبوری کا کہہ کر شاید ان کا موڈ کچھ تارمل کر آیا تھا کیونکہ بشری جب مثال کو لے کر ملنے گئی تو نسیم بیگم نے کچھ خاص سخت رویہ اختیار نہیں کیا۔ اگرچہ فوزیہ نے اس کے سلام کا جواب دیا نہ مثال کے گلے ملنے پر اسے پیار کیا۔

وہ مثال کو لے کر خاموشی سے نکل آئی۔

”آپ کوئی بات نہیں کریں گے؟“ وہ پھر سے بولی۔

”تم کرو میں سن رہا ہوں۔“ وہ پھر سے اسی لہجے میں بولا۔

”عدیل! اس سارے قصے میں میرا کیا قصور ہے؟ میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”بشری! وہ چیپٹو میں نے کلوڑ کر دیا ہے۔ اب اس پر کوئی بات نہیں ہوگی اور ہاں!“ وہ رک کر مثال کو دیکھنے لگا جو اپنی گزیا سے باتیں کر رہی تھی۔

”تم ای یا فوزیہ سے بھی کوئی ذکر نہیں کرو گی کہ پہلے تمہارا۔“

”میں جانتی ہوں عدیل! لیکن وہ زائدہ آئی۔ اگر انہوں نے خود سے کچھ بتا دیا۔ کل بھی وہ ای سے ایسی باتیں کر رہی تھیں جس سے امی کا دل میری طرف سے کھٹا کر سکیں بہت غلط غلط باتیں گئیں انہوں نے لیکن میں خاموش رہی۔“

”تمہیں آئندہ بھی خاموش رہنا ہو گا تمہارا تو کچا پکا معاملہ تھا۔ ٹوٹا اور بات آئی گئی ہو گئی۔“ وہ حنا کر بولا۔

”لیکن میزری بہن کا نکاح ہوا ہے۔ تم سمجھ رہی ہونا اس بات کو؟“

”میں جانتی ہوں عدیل! اور خدا نہ کرے کہ اب کچھ ایسا ہو جو اس رشتے کو خراب کرے۔ آپ فکر نہیں کریں، میں پوری کوشش کروں گی کہ کم از کم میری طرف سے کچھ نہ ہو۔ آپ مینشن نہیں لیں۔ مجھے یقین ہے زائدہ آئی بھی اس معاملے کو بگاڑنا نہیں چاہیں گی۔“ وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔

”ہوں! ایسا ہی ہو اللہ کرے۔“ وہ گہرا سانس لے کر بولا۔

”مما! اگر آپ دونوں کی صلح ہو گئی تو پکیز کوئی اور اچھی بات کر لیں۔“ مثال آگے کو جھک کر بولی تو دونوں ہنس پڑے۔

☆ ☆ ☆

انہیں اسلام آباد میں بہت اچھا ہوٹل ملا تھا۔ انہیں تین دن یہاں ٹھہرنا اور تین دن مری میں۔ پہلا دن تو یوں ہی گھومتے ہوئے گزر گیا۔ بشری کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اتنے سالوں بعد دونوں کو یوں اکٹھے ساتھ رہنے اور گھومنے پھرنے کا موقع ملا تھا۔

عدیل کا موڈ بھی بہت خوش گوار تھا۔ وہ اس رات والی تلخی کو قطعاً بھلا چکا تھا اور بشری کا بھی اسے یاد کرانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

”عدیل! آج تھوڑی شاپنگ کر لیں ای اور فوزیہ کے لیے۔ میں چاہ رہی ہوں کہ ہم فوزیہ کے جینز کے لیے کچھ زبردست سے آئٹم خرید لیں۔ جو اس کو بہت پسند آئیں۔“ وہ شوہر کی دل جوئی کو بولی اور یہ سچ بھی تھا کہ اسے بہر حال فوزیہ کی شادی کی خوشی تھی۔

دونوں کے تعلقات شادی کے بعد سے اب تک کچھ اتنے خوش گوار بھی نہیں رہے تھے۔ فوزیہ بشری کو کچھ خاص پسند نہیں کرتی تھی۔ وہی نند بھانج والی چپقلش پہلے دن سے جاری تھی۔ جس میں کبھی کی آجاتی اور کبھی شدت۔ فوزیہ اگر اچھی نند نہیں تھی تو بشری بھی ذرا الگ تھلگ سی رہتی تھی۔ پھر بھی دونوں میں روبرو لڑائی والی بات کبھی نہیں ہوئی تھی۔

بشری دلی میں خوش تھی کہ کم از کم فوزیہ کی رخصتی کا امکان پیدا ہو ہی چکا تھا تو وہ خوش خوش اپنے گھر جائے۔ یہ تو اچھی بات ہے۔ ای نے بھی مجھ سے کہا تھا۔ لیکن میں نے کہا تھا کہ ہم اتنی زیادہ شاپنگ نہیں کر سکتے۔

ظاہر ہے گاڑی میں سب کچھ کہاں آسکتا ہے۔“ عدیل بولا۔
”رکھ لیں گے پیچھے ڈنگی بھی تو ہے۔“ بشریٰ مصروری۔

اور اس نے واقعی فوزیہ کے جینز کے لیے بہت زبردست کرا کر اور کچھ قیمتی کپڑے بھی خرید لیے۔ مثال کی پسند کے کھلونے اور کچھ دوسری چیزیں خریدیں، بل ان کامری جانے کا ارادہ تھا۔
جیسے ہی وہ ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوئے۔ بشریٰ سنبھلتے سنبھلتے بھی بری طرح سے چکرا کر بیڈ پر گری۔
عدیل اور مثال اسے پکارتے رہ گئے۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

”مما! بابا اور دادا کل آجائیں گے نا؟“ اریبہ اور واثق اس کے ساتھ مل کر دھلے ہوئے کپڑے رسی سے اتار کر اندر لائے تھے۔ وہ انہیں بیٹھ کر رہنے لگی۔
”ان شاء اللہ بٹا! ابھی بابا کا فون آیا تھا۔ سب کام ہو گئے۔ امید ہے وہ کل صبح ہی نکل پڑیں گے۔ تم بس دعا کرنا وہ ساتھ خیریت کے گھر آجائیں۔“
عاصمہ بہت خوش تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو عفان کا فون آیا تھا کہ ساری ڈیل بخیریت ہو گئی ہے۔ رقم انہیں مل گئی ہے۔

بابا جی نے بھی عاصمہ سے بات کرتے ہوئے اسے دل سے مبارک باد دی تھی۔ ان کی آواز سے کچھ کمزور لگی تھی مگر خوشی وہ بہت تھی۔

عاصمہ ان سے زیادہ خوش تھی کہ انہوں نے جاتے ہوئے اس سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کیا تھا۔
وہ اسے اس کی چھت دلائے جارہے تھے۔

اس نے جب رندھی آواز میں بابا جی کا شکریہ ادا کیا تو وہ برا مان گئے۔
”نہیں شکریہ تو ہمیں تمہارا ادا کرنا چاہیے۔ اتنے سال تم نے زبان پر کوئی لگہ، شکوہ لائے بغیر گزار دیا۔ اب ہماری باری ہے تمہارا اور بچوں کا حق ادا کرنے کی۔“
وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

”مما! میری فریڈ ہے رملہ! اس نے اپنا گھر لیا ہے۔ اتنا شان دار ہے اس کے گھر میں لان بھی ہے اور سونمنگ پول بھی۔“ اریبہ اسے بتانے لگی۔
”اب ہم اتنا ہی بڑا گھر نہیں لیں گے۔ سارے پیسے گھر لینے میں تو نہیں لگا دینے نا۔ ہے نا ممما!“ واثق عقل مندی سے بولا۔

”جی ممما کی جان! اب دیکھو یہ فیصلہ تو تمہارے بابا اور دادا ہی کریں گے کہ ہمیں کتنے میں گھر لینا ہے اور باقی رقم کا کیا کرنا ہے۔“ یہ بات تو اس نے سوچی بھی نہیں تھی۔ نہ عفان سے پوچھی تھی۔
اس نے اختیار اپنے کم سن بیٹے پر پیار آیا۔ دور کی کوڑی لایا تھا۔
”اچھا مگر گھر میں لان تو ہونا چاہیے نا اور درخت بھی جس پر جھولا لگائیں گے۔“ اریبہ ٹھنک کر بولی۔
”ان شاء اللہ ضرور چھوٹے موٹے لان والا گھر ہی لیں گے۔“ عاصمہ سے پیار کر کے بولی۔

”مبارک ہو عدیل صاحب! آپ کی سزا یکس ہو سکتی ہے۔“ ڈاکٹر بشریٰ کوچیک کرنے کے بعد یقینی لہجے میں مسکراتے ہوئے بولی تو دونوں بے یقینی سے اسے دیکھنے لگے۔

”مے کیا دیکھ رہے ہیں آپ۔ کیا آپ کو یقین نہیں آ رہا؟“ ڈاکٹر بھی دونوں کے تاثرات دیکھ کر مسکرائی۔
”ڈاکٹر صاحبہ۔ ہم تو بالکل ناامید ہو چکے تھے۔“ عدیل کپکپاتی آواز میں بولا۔

”اونسوں۔ ناامیدی تو کفر ہے عدیل صاحب اور آپ کی تو ماشاء اللہ سے ایک بیٹی بھی ہے پہلے سے۔ اکثر کہتے ہیں دیر ہو جاتی ہے۔ باقی تو اللہ کے کام ہیں۔ بہر حال آپ کو مبارک ہو۔ ابھی انہیں کسی میڈیسن کی ضرورت نہیں، انہیں کمزوری ہے۔ پھل، دودھ اور جوس دیں۔ پندرہ دن بعد دوبارہ چیک کرا میں تو انہیں کچھ میڈیسن اشارت کرائی جائیں گی۔“ وہ انہیں دیکھ کر بولی۔

”مگر ڈاکٹر صاحبہ کل تو ہم مری جا رہے تھے۔“ بشریٰ کو یاد آیا۔
”اب آپ کو گھر جا کر کچھ دن صرف ریسٹ کرنا ہے۔ کیونکہ آپ کافی عرصہ بعد دوبارہ پریگنٹ ہوئی ہیں۔ اس لیے احتیاط ضروری ہے۔“ ڈاکٹر نے فوراً کہا تو دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔
”لیکن ہمیں گھر جانے کے لیے بھی تو سفر کرنا پڑے گا ڈاکٹر صاحبہ!“ عدیل نے توقف سے کہا۔

”وہ آپ کریں مگر احتیاط سے۔ جو باتیں میں نے کہی ہیں ان پر عمل کریں۔ انہیں ہر قسم کی ٹینشن سے دور رکھیں۔ خوش رہیں اور اچھی صحت مند خوراک دیں اور کچھ دن بیڈ ریسٹ آؤ گے!“
”جی ڈاکٹر صاحبہ! بہت شکریہ۔“ دونوں خوش خوش باہر آ گئے۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا عدیل! بشریٰ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
”تو مجھے کون سا یقین آ رہا ہے۔ بشریٰ! اتنے سالوں بعد۔ اتنے علاج کرائے، ہم نے اور اب دیکھو بغیر کسی گمان خیال کے۔“

”اللہ بہت مہربان ہے۔“ بشریٰ رندھی سے بولی۔
”بہت مہربان۔ بہت زیادہ۔ ہم ہی اسے بھول جاتے ہیں۔ مثال کو بتادیں ہوٹل جا کر؟“ وہ شرارت سے بولا۔
”اونسوں۔ بالکل نہیں! ابھی اسے ان باتوں کی کیا سمجھ۔“ اس نے گھورا۔
”اچھا بھئی۔ امی کو تو جلدی سے فون کر کے یہ خوش خبری سناؤں۔ وہ موبائل پر نمبر ملانے لگا۔
بشریٰ مسروری سے دیکھنے لگی۔ اسے فوزیہ کی سانس کے طعنے یاد آنے لگے تو اس نے سر جھٹک دیا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

شانہ برکے ہیں

خوبصورت مردانہ	☆ تیلیاں، پھول اور خوشبو	راحت جنیں	قیمت: 250 روپے
خوبصورت چہلی	☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں	فائزہ افتخار	قیمت: 600 روپے
مشہور جلد	☆ محبت پیاں نہیں	لہنی جدون	قیمت: 250 روپے

سکوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

رات بہت اندھیری تھی۔ ایک تو بار بار لائٹ جا رہی تھی۔ دوسرے سردی بھی بہت تھی۔ آدمی رات کے بعد جولاٹ گئی تو پھر آنا ہی بھول گئی۔
عاصمہ کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر بچوں کے کمرے میں ڈیمر جنسی لائٹ جلائی اور پھر صحن کی طرف آگئی۔

آسمان کا رنگ عجیب ٹیلا سا ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی آندھی رکی ہوئی ہو۔
”بھلا اس موسم میں کب آندھیاں آتی ہیں۔“

وہ خود ہی دل میں ہنسی مگر اس ہنسی میں عجیب سی بے چینی تھی۔

”شاید میں بھی اتنے دن اکیلی جو نہیں رہی اس لیے دل کھرا رہا ہے۔“ وہ خود ہی تاویل گھڑنے لگی۔
زور زور سے شامیں شامیں ہوا چلنے لگی۔ ہمسائے کے گھر میں لگے اونچے درخت کے پتے زور زور سے شور مچانے لگے۔

سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ اس نے شال اپنے کندھوں کے گرد لپیٹی۔

”تیا نہیں گاؤں میں موسم کیسا ہو گا۔ عفاں تو کہہ رہے تھے وہ صبح نماز پڑھنے کے بعد نکل آئیں گے۔ اگر بارش ہو گئی تو کہیں انہیں دیر سے نکلنا نہ پڑے۔ سیا اللہ! موسم بالکل ٹھیک رہے۔ کچھ بھی نہ ہو اب تو سوہ دونوں صبح جلدی آجائیں تو میرا جی ٹھہرے۔ کیسی فضا میں اداسی سی ہے۔ بچوں نے کھانا ٹھیک سے کھایا نہ میں نے دل ہی نہیں کر رہا تھا۔“

وہ انگلیوں پر ان کے جانے کے دن گننے لگی۔

”نکل جب آئیں گے تو بس شام میں ہی گھر دیکھنے چلیں گے۔ یہ کرائے کا ٹوٹا پھوٹا گھر جس پر مالک مکان ایک روپیہ مرمت کے نام پر لگانے کو تیار نہیں۔ اب یہاں اور رہنے کو جی نہیں کرتا۔ اللہ کرے ہمارا بھی نیا لاش پتہ کرنی ٹاٹوں والا گھر ہو جسے میں سجاؤں سنواروں اور خوب صاف تھرا رکھوں۔
وہ دل میں بہت سارے منصوبے بنانے لگی۔

”اور وہ جو میں نے چھوٹی کمیٹی ڈال رکھی ہے اس سے اپنے بیڈروم کا نیا فرنیچر لاؤں گی اور ساتھ میں میچنگ پردے بھی اور۔“

یہاں تک ہی سوچ پائی تھی کہ پھر گھبرا کر بے کل سی اٹھ کھڑی ہوئی اور اندر بچوں کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ سزا دیر میں بارش ہونے لگی۔

عاصمہ کو جانے کب آڑے ترچھے ہو کر بیٹھے بیٹھے نیند سی آگئی۔ وہ گہری نیند سو گئی۔ صبح آنکھ بھی دیر سے کھلی۔
ستم پشتر بچوں کو تیار کر کے اسکول بھیجا تھا۔ پھر موبائل پر فون کیا مگر فون بند تھا۔

”سربراہ تو دینا چاہتے ہوں گے۔“ وہ مسکرا کر جلدی جلدی صفائی میں جت گئی۔ کچھ دیر میں فون کی گھنٹی بجی۔
اس نے تیزی سے کال ریسیو کی اور کال ریسیور کرنے کے بعد اسے لگا گردش وقت اور دنیا سب کچھ ہم کر رہ گیا۔

کاش اس نے یہ کال کبھی ریسیو نہ کی ہوتی۔

وہ کسی پتھر کے بت کی طرح ساکت تھی۔ سیل فون اس کے ہاتھ سے پھسل کر کسب زمین پر گرا۔ سیل کی بیٹری سم سب نکل کر فرش پر بٹھر گئی۔ مگر وہ تو جیسے ہوش و خرد سے بے گانہ ہو چکی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی ویب سائٹ

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے ہم حاصل کیوں نہیں :-

- ✧ ہرائی ٹیک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤن لوڈنگ سے پہلے ای ٹیک کا پرنٹ پر یو ایچ
- ✧ ہر یوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہرائی ٹیک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، ہارل کوالٹی، کمپریڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤن لوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤن لوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤن لوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤن لوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



رخسانہ نگارِ عدیل



عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشری ان کی بسو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی عمران بشری کا بھائی ہے۔ سال بچا بیگم کی تو اسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشری اور نسیم بیگم میں دو اپنی ساس بسو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصطفیٰ بیٹا بسو سے نکاح دکھائی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشری کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ بیگم اپنے بیٹے عمران کے لیے بھی لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔ پانچ سال کی سلسل کو ششوں کے بعد بشری کی نند فوزیہ کا ہونا ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح واسلے روز بشری اور نسیم کو مل کر جو تک جاتی ہے۔ عدیل سے شادی سے قبل ظمیر کا بشری کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح واسلے دن زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشری اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو بتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کرتا ہے۔ بشری اور عدیل ایک بہتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشری کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عامرہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحبہ ہر کاری تو کرسی سے رنار ہوئے ہیں۔ گریجویٹ اور گاؤں کی نڈن فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کوڑھیں تھمن کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہیں۔ عامرہ کو فون کے ذریعے کوئی اطلاع ملی ہے جسے سن کر وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔

تیسری قسط



”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں زائدہ بہن!“ نسیم بیگم کے توجیسے ہاتھوں کے طوطے ہی اڑ گئے۔
کتنی دیر تو وہ کچھ بول ہی نہیں سکی تھیں جو اس جیسے گم سے ہو کر رہ گئے تھے۔
یہ جملہ توبہ وقت ان کے منہ سے اس وقت نکلا جب زیدہ نے پھر سے اپنی بات دہرائی تھی۔
نسیم بیگم کو خود بھی اپنی آواز کی کیکپا ہٹ واضح طور پر محسوس ہوئی تھی۔

دوسری طرف سچے سنورے میلے میں ہلکا سا میک اپ کیے مووٹر کا سوٹ پہنے فوزیہ چائے کے ساتھ ڈھیروں
لوازمات کی ٹرائی لیے چلی آ رہی تھی۔ اس کی کانپتی آواز سن کر جیسے وہیں گری گئی۔

”نسیم بہن! اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہیں آپ۔ خدا نخواستہ میں نے کچھ ایسی غلط بات تو نہیں بول دی۔“ فوزیہ
نے نسیم کی اڑی رنگت دیکھی تو گویا انہیں دلاسا دینے کو کہا۔

ان کا کہنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اس طرح کی معمولی اور عام باتیں عموماً کرتی ہی رہتی ہیں۔
”میں اصل میں... میں سمجھ نہیں سکی کہ آپ کس لیے مطلب... کیوں یہ بات کر رہی ہیں۔“ نسیم بیگم بیٹے
میں بھیگتی تھی یا اس آہ میں جکڑ کر بے ربطگی سے بولیں۔ ایسا جملہ جس کا کوئی بھی مطلب نہیں تھا۔

”کیوں... بھی ظاہر ہے اب ہم رشتہ دار ہیں۔ دکھ کی سکھ کی ہر بات تو ہم ایک دوسرے سے ہی کریں گے۔
اب خدا نخواستہ یہ بات میں جا کر اپنے محلے داروں سے یا تمہارے رشتہ داروں سے تو نہیں کر سکتی۔“ زائدہ بیگم

نے اپنائیت کا فلسفہ پیش کر دیا۔
اور نسیم بیگم نے کچھ ایسی بے چارگی سے انہیں دیکھا جیسے کٹنے کو تیار بکری قصائی کی چھری کے نیچے پڑی ہو اور وہ
قصائی اس سے سار حتانے والی اپنائیت کی کوئی بات کرے۔

”مجھ سے تو ظہیر نے کہا تھا۔ امی جا کر کرنے والی تو بات ہی نہیں آپ خالہ جان کو بس فون کر دیں۔ عدیل بھائی
کے ہاتھوں خود ہی رقم بھجوادیں گی۔“ زائدہ نے گویا ایک پھلجھڑی چھوڑی۔

اب کے نسیم بیگم کو بے چارگی اور بے بسی کے بجائے شدید غصہ کسی ابا ل کی طرح اپنی شریانوں میں دوڑتا
محسوس ہوا۔

”فون کی بھی کیا ضرورت تھی بہن؟ کسی راہ چلتے ہر کارے سے کھلوا بھیجتیں۔ ہم تو گویا رقم ہتھیلی پر لیے
دروازے میں کھڑے تھے کسی کے ہاتھ روانہ کر دیتے۔“ وہ زیادہ دیر تک خوف، مروت اور لحاظ کا بوجھ اٹھا نہیں
سکیں۔ ترخ کر بول ہی اٹھیں۔

زائدہ نے نسیم کے بدلے انداز پر زور سا ٹھنک کر انہیں دیکھا۔
”ہاں تو اپنے ہی اپنوں کے کام آتے ہیں۔ ایسا ہی تو ہوتا ہے۔“ وہ پھر بھی ڈھٹائی سے بولیں۔

اور نسیم بیگم کا جی چاہا اس عورت کو گری سمیت اٹھا کر گلی کیا بلکہ مین روڈ پر ڈال آئیں۔ زمانے بھر کی ٹرنک
اس عورت کا قیمتی تاجانی تو بھی انہیں ٹھنڈ نہ پڑتی۔

”ایسا نہیں ہوتا بہن، معاف کرنا۔“ اب کے انہوں نے لحاظ، مروت، خوش اخلاقی سب کو اٹھا کر طاق پر رکھا
اور بے لحاظ لہجے میں بولیں۔ زائدہ تو لہجہ بھر کو کچھ بول نہ سکیں بس نسیم کے چہرے کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔

”میں سمجھی نہیں آپ کیا کہنا چاہتی ہو نسیم بہن؟“ اب کے لہجے میں زمانے بھر کی معصومیت اور شرافت
زری سے بولیں مگر نسیم بیگم دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر چکی تھیں۔

”ایسی کوئی مشکل بات نہیں بولی میں نے آپ کی طرح۔“ وہی کٹھور لہجہ اور بدلی ہوئی نظریں۔
”یعنی میں کیا سمجھوں۔ اس بات کا مطلب؟“ زائدہ کے لہجے میں اب کے کچھ دھمکی سی تھی۔

نسیم بیگم کی نظریں ایک دم سامنے دروازے کے باہر تیار میلے میں کھڑی فوزیہ پر پڑیں جو ٹرائی کے ساتھ یوں

بے بسی کی تصویر بن کھڑی تھی کہ نسیم بیگم اگلا جملہ ہی بولنا بھول گئیں۔
ان کی نظریں کے سامنے وہ منظر اگیا جب فوزیہ، ظہیر کی دلہن بنی نکاح نامے پر دستخط کر رہی تھی۔

بے اختیار ان کا جی چاہا، دھاڑیں مار کر رونے لگیں یا کہیں سے گزرے وقت کی لگا میں ان کے ہاتھ آجائیں تو
وہ اس ظالم وقت کو واپس لے آئیں۔ مگر اب جیسے ان کے ہاتھوں میں کچھ تھا ہی نہیں۔ گزرے وقت کی لگا میں
نہ آنے والے وقت کی شقاوت۔

انہیں بہت بڑا اور صاف صاف نظر آنے لگا تھا۔
”اتنی بڑی رقم... بیس لاکھ کم تو نہیں ہوتے بہن اور ہم تو سفید پوش لوگ ہیں جن کا اللہ نے بھرم رکھا ہوا
ہے۔ میں بیوہ عورت جو کچھ بھی ہے میرا بیٹا۔ اللہ اس کی لمبی عمر کرے، بال بچے دار ہے، ہم ماں بیٹی کا بوجھ بھی
اسی نے اٹھا رکھا ہے تو ایسے میں یہ رقم ہم... میں تو بالکل بھی انتظام نہیں کر سکتی۔“

نسیم بیگم کو پتا بھی نہیں چلا۔ کب ان کی آواز آنسوؤں میں بھیگتی چلی گئی۔ لاکھ ضبط کرنے کی کوشش کی کہ خود کو
کنزور ظاہر نہیں کرنا مگر بے بسی بے کسی کی انتہا تھی۔ آنسو بہنے لگے۔

زائدہ بیگم نے ایک ملامتی نظراس آنسو بہاتی ماں پر ڈالی۔
”سنا ہے بہن! بلکہ جیتی ہے یہ جب جیتی نہیں آپ جیتی ہے کہ ہمارے معاشرے میں بیٹیوں کی مائیں ان کے پیدا
ہوتے ہی جوڑ توڑ شروع کر دیتی ہیں۔ جوڑا، کپڑا، بستر، برتن، روپیہ پیسہ، سونا چاندی جو جڑ سکے خود میں نے مین
بیٹیاں ایسے ہی بیا ہی ہیں۔“ زائدہ تو جیسے بجلی کے ریڈیو کی طرح چل پڑیں۔

”وہ بات ٹھیک ہے مگر اتنی رقم... نسیم بیگم نے جب اپنے آنسو بے اثر دیکھے تو زور سے آنکھیں رگڑ کر ویل
سے بات کرنے کی کوشش کی۔

”خود میں نے... تیسری والی بیٹی بیا ہی... بیا ہی کیا بات ہی طے کی تھی کہ داماد بے روزگار بیٹھ گیا گھر میں...
اپنا زیور بیچ کر پہلے اسے کاروبار کرایا جب اس کا کاروبار ختم گیا تو پھر بیٹی کو اس کے گھر رخصت کیا اور یہ نہیں کہ نوید کو
گھر والوں سے توڑ لیا۔ خیر سے ابھی تک میری تینوں بیٹیاں اپنی ساس نندوں کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ بہن! میری
تریت ایسی نہیں کہ بچیاں جاتے ہی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ سے بنا کر بیٹھنے لگیں تو جیسے جلال میں آگئیں
فوزیہ وہ تو جیسے کھڑے کھڑے تھک گئی۔

اندر آ کر آہستگی سے سلام کر کے چائے کی ٹرائی ان کے آگے کھسکا کہاں کی طرف دیکھنے لگی۔ ماں نے بھی
آنکھوں سے فی الحال ٹلنے کا اشارہ دیا۔

”چولہے پر دودھ رکھا ہے ایلنے کو دیکھ کر آتی ہوں۔“ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ اگرچہ زائدہ کو یہ بات بھی
بری لگی تھی مگر فی الحال وہ اس سے بڑی اور اہم بات سے دودھ ہاتھ کر رہی تھی سو جانے دیا۔

”آپ کی سب باتیں ٹھیک سولہ آنے بہن... مگر میں... ہم اتنی بڑی رقم یہ تو ہمارے لیے ناممکن ہے۔“
رک رک کر نسیم بیگم نے دو ٹوک انداز میں نہ سہی، معذرت خواہانہ انداز میں کہہ ہی ڈالا کیونکہ وہ جانتی تھیں
عدیل تو یہ سن کر ہی بھڑک اٹھے گا۔

زائدہ کو جیسے کسی نے کھینچ کر پتھر مار دیا ہو۔
ترپ کر نسیم کی طرف دیکھا۔

”آپ جانتی ہو نسیم بہن! جو کہہ رہی ہو آپ؟“ وہ صاف دھمکانے والے انداز میں بولیں۔
”میں نے سوچ سمجھ کر ہی آپ سے یہ بات کی ہے بہن!“ نسیم زری سے بولیں۔

”اور میں نے تو جیسے یوں ہی بول دیا سب۔“ وہ تپ کر بولیں۔

مگر عاصمہ تو جیسے ہوش و خرد سے بیگانہ تھی۔
 اس کے دل و دماغ میں وہ رات کا آخری پھر پھر سا گیا تھا۔
 فاروق اور عفان کے آنے میں کتنے گھنٹے ہیں وہ بار بار وقتوں سے انگلیوں کی پوروں پر گھنٹے لگتی۔
 ”مما۔۔۔ ماما دیکھیں نا۔ باپ اور دادا سب کہہ رہے ہیں وہ ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔“ والی
 جوان کاسب سے سمجھ دار بیٹا تھا اس وقت جیسے کچھ بھی نہیں سمجھ پارہا تھا۔ کبھی پتھر کابٹ بنا ماں کی طرف دیکھا اور
 کبھی روتے دھوتے ہجوم کی طرف۔
 اور اس کی نگاہیں ان دم مرہ جسموں پر آکر پتھرا جاتیں جو کل تک ان کاسب کچھ تھے۔ ان کی آس۔ ان کی امید۔
 ان کا انتظار۔

ارد گرد کے ہمسایوں اور کچھ دور پرے کے رشتہ داروں نے رسمی انداز میں پولیس کی کارروائی پنپائی اور دونوں
 کو آخری سفر پر روانہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔
 عاصمہ کی بیگانگی ہنوز قائم تھی۔

”اسے رونا چاہیے۔۔۔ ان دونوں کے ہمیشہ کے لیے چلے جانے کی خبر اسے ہونا چاہیے ہاجرہ خالی اسے رلا نہیں
 مالک مکان کا بیٹا ہمہ روانہ نظروں سے اے دیکھ رہا تھا جو چارپائی کی پٹی سے گال نکالے بے سدھ تھی۔
 چھوٹی بورہ تو ساتھ والی ہمسائی کی گود میں تھی۔
 تینوں بڑے بچے ماں کے ساتھ لگے بیٹھے تھے۔

آخری وقت آگیا۔ عاصمہ کی آنکھوں میں آنسو نہیں آسکے۔
 کچھ دیر کے لیے عاصمہ کے آگے دونوں کے چہروں سے کفن ہٹا کر دکھائے گئے کہ شاید اس پر کچھ اثر ہو سکے مگر
 وہ اسی طرح بے حس حرکت بیٹھی رہی۔

جیسے ہی دونوں کو کلمہ پڑھتے ہوئے لے جایا جانے لگا تو ساتھ کی ہمسائی نے زور زور سے عاصمہ کو جھنجھوڑا لاپ۔
 ”عفان بھائی جا رہے ہیں۔ خالوجی کے ساتھ عاصمہ! تمہیں اور بچوں کو اکیلا چھوڑ کر۔ عاصمہ کی کھوان
 دونوں کی سنگدلی۔۔۔ انہوں نے تمہارا اور بچوں کا ذرا خیال نہیں کیا۔“
 اور عاصمہ کو جیسے کسی نے پتھر کھینچ مارا۔

وہ دھاڑیں مار کر ان کے مرہ جسموں سے لپٹ کر ایسے روئی کہ پتھروں کے بھی آنسو نکل پڑے۔ کم از کم اس
 نے یہ نہیں سوچا تھا۔
 وہ تو بڑی صابر ہنسا کر ہمت مطمئن رہنے والی روح تھی۔
 اس سے یہ کڑا امتحان کیوں لیا گیا۔

عفان اور فاروق کو لے گئے اور عاصمہ کی زندگی ان چار بچوں کے ہوتے ہوئے بھی جیسے بالکل خالی ہو گئی۔
 چٹیل ویران صحرا کی طرح۔



”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ اسی؟ دماغ تو نہیں خراب ہو گیا ان لوگوں کا۔“ عدیل تو سنتے ہی جیسے ہتھ سے اکھڑ گیا۔
 نسیم بیگم تو ان چند گھنٹوں میں بچ کر رہ گئی تھیں۔
 نم آنکھوں میں زبانی بھری لا چاری سو کر بیٹے کو دیکھنے لگیں۔
 وہ زبان جو ہر وقت کسی نہ کسی بات پہ کوئی نہ کوئی تبصرہ ضرور کرتی تھی اب جیسے گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔

بولے جا رہا تھا۔

اس کا غصہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔

بشری خود پریشان نظروں سے سانس اور شوہر کو دیکھتے ہوئے اپنے ڈوبتے دل کو جیسے سنبھال رہی تھی۔

ابھی تو سفر کی تھکان نہیں اتری تھی کہ یہ اتفاقاً؟

پھر اسے تو امید تھی کہ گھر جلتے ہی شاندار استقبال ہو گا۔ اتنی اچھی خبر سننے کے بعد فوزیہ اور امی کا مودہ بہت

اچھا ہو گا۔

”مگر یہاں تو جیسے کسی کو وہ ”برہکتنگ نیوز۔“ یاد بھی نہیں رہی تھی۔ فوزیہ کو نے میں بکھرے بالوں کے ساتھ گھر

صم بیٹھی تھی۔

”آپ کو ان سے بات کرنی چاہیے تھی۔ صاف منع کر دینا چاہیے تھا۔ منہ پر انکار کر دیتیں بلکہ انہیں شائیں

کہ انہوں نے ایسی بات کی بھی کیسے حد ہو گئی ڈھشالی کی اور بے شرمی کی۔“ وہ اب مٹھیاں پیچھے کمرے میں بے

چین ساٹنے لگا تھا۔

”یہاں! میری ڈفل نہیں مل رہی جو آپ نے مجھے اسلام آباد سے لے کر دی تھی۔“ مثال اپنی پریشانی شہر کرنے کو

آنکھوں میں آنسو لیے باپ کے پاس آئی۔

”جاؤ یہاں سے وہیں ہوگی دیکھو جا کر۔“ عدیل زور سے اس کا ہاتھ جھٹک کر غصے سے بولا۔

بشری کے دل پر جیسے ہاتھ ساڑا۔

”یہاں! مثال آنکھوں میں آنسو لے آئی۔

”بیٹا! وہیں ہوگی گاڑی میں یا پھر سامان میں جا کر دیکھو۔ بشری تم جاؤ جا کر اسے ڈفل ڈھونڈو۔“ اسے مڑ کر

کہتے ہوئے عدیل کی نظر بشری کے ٹھکے ہوئے چہرے پر پڑی تو اس سے کچھ بھولا ہوا یاد آیا۔

”اور تم جا کر اندر کمرے میں آرام کرو۔ اتنے لمبے سفر سے تھک کر آئی ہو۔“ عدیل فکر مندی سے بولا۔

”فوزیہ! تم بشری کو جو سو دن نیپالی لے تو تھوڑا رست کر لے۔“ وہ مڑ کر حکم سے بولا تو فوزیہ جیسے ششدر رہی وہ

گئی۔

اس غم کی گھڑی میں جب فوزیہ کی زندگی داؤ پر لگی تھی۔ بھلائی اسے ایسی خدمت گاری کا حکم دے سکتا ہے

فوزیہ نے کتنی سوچا نہیں تھکے تڑپ کے وہ گئی۔

کچھ ایسی ہی کیفیت تھی کہ کسی بھی تھی۔

مگر بے بسی ایسی تھی کہ پلٹ کر نہ تو وہاں جا سکتی تھی نہ غصے کا اظہار کر سکتی تھیں۔

”ہاں فوزیہ! جاؤ بیٹا! بشری کو آرام کرنا چاہیے تم اسے جو سو دن بنا دو یا جو یہ کھانا لے لے کہ اگر ہو کہ کسی کو

تو کھانا گرم کرو۔ مثال سے بھی بوجھ لیا تھا۔“

جاننے والے فوزیہ کی دل چاہی کر رہی تھی اسے اس آفت سے بچنے کے لیے کھانا لے کر لے کر آتا تھا۔

کو کہا جاتا تھا یہاں بھی صاحب کی خدمت کے مشورے سے ہی جا رہے تھے۔

وہ پھر کتنی اٹھ کر چلی گئی۔

”میرا! چلیں نا۔ میری نظر اٹھنے چلائی تو کونوں سے۔“ مثال میں کو یو تھی بیٹھے دیکھ کر چل کر رہی۔

”بشری! جاؤ لے جاؤ اسے فارگ سیک۔“ عدیل جیسے رنج آ کر بولا تو بشری مثال کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر لے گئی۔

”پھر اب؟“ نسیم بگم لے بیٹھے کے چہرے پر یوں نظریں گاڑ کر پوچھا جیسے اس کے پاس جاؤ کا چرچا ہے۔

کے ساتھ لڑا کر کے...

مگر وہ کونسی تھی ہے؟...

شہر میں ہی ہو سکتی تھی...

کھانے پر بیٹھنے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

کھانا کھانے...

ظالموں نے صرف ان کی جانیں نہیں لی تھیں۔ ان کی عمر بھر کی کمائی ان کے خواب ان کی خواہشیں ان کے بچوں کے مستقبل، ان کی چھت سب کچھ چھین لیا تھا۔ وہ روٹی فریاد کرتی، چیختی چلاتی اب کچھ بھی واپس نہیں سکتا تھا۔

عاصمہ کی آنکھیں رو رو کر سوکھ چکی تھیں۔ وہ تو جیسے خود میں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک بھائی تھا بیوی بچوں سمیت ملک سے باہر۔ اتنے سالوں میں اس نے کبھی پلٹ کر خیر نہ لی اب بھی اس کو کسی نے اطلاع بھیجی یا نہیں۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ تو اب بھری دنیا میں اکیلی ہی تھی۔

دن میں ہمسائیاں آتی جاتی راتیں۔ بچوں کو اور اس کو زبردستی کچھ کھلا پلا جاتیں مگر رات۔ کالی لمبی سیاہ رات کسی سیاہ ناگ کی طرح پھن پھیلانے یوں اس کی طرف دیکھتی کہ وہ دو باروں میں سمٹتی جاتی۔ ”مما! بھوک لگی ہے۔“ چھوٹی اریشہ جانے کس وقت آکر اس کے کھنٹے سے چٹنی تھی۔

عاصمہ نے چونک کر خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ تو بالکل فراموش کر چکی تھی کہ اس کے ساتھ جڑی چار جانیں اور بھی تو ہیں۔ اس کی طرح برباد ہوئی ہیں ان کی زندگی اپنے سب سے قیمتی اور پیارے رشتوں سے محروم ہو چکی ہے۔ ”مما! مجھے بھی بھوک لگی ہے۔“ اریبہ بھی دوسری طرف آکر بیٹھ گئی۔

واثق ان سے رے بالکل خاموش کسی سمجھ دار بچے کی طرح بیٹھا تھا مگر اس کے چہرے سے لگ رہا تھا۔ اسے بھی بھوک لگی ہے لیکن اسے اپنی خواہش پر بند باندھنا آگیا ہے۔ ”ابھی سے۔“ نہیں نہیں۔ ابھی میرے بچے کی عمر ہی کیا ہے۔ فقط گیارہ سال یا پانچ ماہ ستر دن۔ اتنی عمر میں اسے غم کی بھٹی میں جھونک دوں۔ ضبط اور صبر کے امتحان میں ڈال دوں۔ نہیں نہیں۔“

وہ تڑپ کر اٹھی تھی۔ اسے اریبہ اور اریشہ کی بھوک نے نہیں تڑپایا تھا واثق کی چپ نے جیسے کرنٹ سا لگا دیا تھا۔ ”واثق میری جان! اسے کیوں بیٹھے ہو؟“ وہ بے اختیار اسے ساتھ لپٹا کر تڑپ کر بولی۔

”تمہیں بھوک نہیں لگی؟“ وہ اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر بولی۔ ”نہیں ممما۔ مجھے بھوک نہیں۔ میں ان دونوں کے لیے چکن سے کچھ لے کر آتا ہوں۔ آپ پریشان نہیں ہوں۔“ وہ یکدم جیسے جوان ہو گیا۔ گیارہ سال کے بچے سے بیس سال کے جوان کی طرح۔

”واثق! وہ اسے دیکھے جا رہی تھی۔“ ”مما! وہاں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے بولا۔ اور وہ جیسے کسی فرد کے سہارے کی تلاش میں تھی اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ”مما! جیجی یہ دونوں بھی رونے لگی ہیں۔ آپ کو اب حوصلہ کرنا ہوگا۔ آپ کو سب کچھ سنبھالنا ہوگا ممما! وہ واقعی بہت بڑا ہو گیا تھا۔

اس حادثے نے واثق کے بچپن کو نکل لیا تھا اور عاصمہ جیسی مضبوط عورت کو کمزور اور ڈرپوک بنا دیا تھا۔ ”واثق! میں بہت کمزور ہو گئی ہوں۔ تمہارے پاپا اور دادا نے بے وفائی کی ہمارے ساتھ۔ ہمیں اکیلا چھوڑ گئے۔ میں کیا کروں میں کچھ نہیں کر سکتی۔“ وہ بچوں بلک بلک کر رو رہی تھی جیسے واثق کوئی دانا بزرگ ہو۔ واثق ہاں کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گیا۔

”مما! یہ سب تو اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ آپ خود ہمیں سمجھایا کرتی تھیں نا کہ کچھ بھی خود بخود نہیں ہوتا۔ سب کچھ اللہ کے حکم پر ہوتا ہے۔“

”واثق! وہ رونا دھونا بھول کر ایک چھوٹے سے بچے کے منہ سے اتنی بڑی بات، اتنی سامنے کی بات، جو خود اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، سن کر حق دق سی رہ گئی۔ اس سے جیسے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ وہ آہستگی سے اپنے آنسو خود اپنے ہاتھوں سے صاف کرنے لگی۔

”مما۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ہم ہر روز دوسروں کے گھروں سے پک کر آنے والا کھانا کھائیں۔“ واثق نے اسے دو سرا جھٹکا لگایا تھا۔ ”واثق! وہ اسے بس دیکھے جا رہی تھی۔ ”مما! آج چوتھا دن ہے اور کتنے دن ہم دوسروں کے اوپر بوجھ بنے رہیں گے؟“ وہ اب بہت نرمی سے ماں کے بل سلجھا رہا تھا۔

”مما! مجھے شرم آتی ہے جب ساتھ والی آنٹی ہمیں اپنے گھر سے تھوڑا تھوڑا کھانا لاکر دیتی ہیں۔“ ”میں نے تو آج صرف ادھی روٹی کھائی۔“ اریبہ آگے آکر بولی۔ ”میں نے بھی۔“ اریبہ بھی ساتھ آئی تھی۔

”اور میں۔۔۔ ممما! صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ مجھ سے کھایا جاتا ہی نہیں۔ ممما! اچھا نہیں لگتا۔ نوالے حلق میں پھنستے ہیں۔“ واثق اسے حیران کیے جا رہا تھا۔ یقیناً اس نے بہت دھیان سے بچوں کی پرورش کی تھی۔

مکان کی بنیادیں بہت دھیان سے اٹھائی جاتی ہیں۔ اس میں روڑے پتھر، اینٹیں مسینٹ گار اسب کچھ ڈالا جاتا ہے۔ کچھ ٹھیک سے اندازہ نہیں ہوتا کہ مکان کیسا بنے گا لیکن اگر بنیاد مضبوط ہو تو۔ پھر مکان جیسا بھی ہو، اسے کوئی آسانی سے گرا نہیں سکتا اور عاصمہ کو بھی آج اندازہ ہوا اعفان اور فاروق صاحب اسے اکیلا چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔

وہ واثق کی بنیادوں میں اپنی مضبوطی، اپنی غیرت اور خودداری چھوڑ گئے تھے تو پھر وہ اکیلی کیسے تھی۔ ”تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ تم نے کچھ نہیں کھایا صبح سے۔“ وہ بولی تو بالکل پہلے جیسی عاصمہ تھی۔ صرف بچوں کی فکر کرنے والی۔ اپنی ذمہ داریاں پوری تن دہی سے ادا کرنے والی۔

وہ ایک دم سے کھڑی ہو گئی۔ ”اچھا کیا کھاؤ گے تم لوگ۔ کیا بناؤں میں تمہارے لیے؟“ وہ پہلے کی طرح بالکل نارمل انداز میں بہت فکر مندی سے پوچھ رہی تھی۔ واثق نے دونوں ہنسیوں کی طرف دیکھا۔

”مما! مجھے بریاتی کھانی ہے۔“ اریبہ لاؤ سے بولی۔ ”اور مجھے چکن قرانی کیا ہوا۔“ اریبہ بولی۔ ”ٹھیک ہے اور واثق! تم کیا کھاؤ گے؟“ واثق کچھ نہیں بولا اور اٹھ کر ماں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ ”اریبہ! اریشہ! اس وقت رات کافی ہو گئی ہے۔ میرے خیال میں صرف چائے یا دودھ کے ساتھ سلاٹس لے

مار کر بولیں۔

”تو پھر کیا کروں آپ ہی بتائیں۔“ بشری نے ہتھیار ڈال دیے۔

”بتا تو چکی ہوں۔ ہفتے دس دن طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے یہاں بیٹھو ہو سکتا ہے اس دوران یہ مسئلہ ہی جائے۔“

وہ ترکیبیں بتانے میں تو یوں بھی ماہر تھیں۔ جھٹ بولیں۔

”اگر حل نہ ہو اتو۔“

”ڈاکٹر نے اسے بیدار سٹ کا کہا ہے۔ بھی! میرا اپنا کوئی لالچ نہیں نسیم بہن! تمہاری نسل کی حفاظت کی ذمہ داری مجھے تو ڈرنہ تم سوار رکھوانی ہو کو اپنے گھر۔ کہہ دوں گی خود جا کر۔“ ذکیہ جھٹ سے بول اٹھیں۔

بشری گم صم سی سوچنے لگی۔

”جتنا سوچو گی اتنا پریشان ہوگی۔ یوں بھی ان دنوں تمہیں خود کو ہر طرح کی فضول سوچوں سے بچانا ہے۔“

”ای! عدیل کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ ہو جاتے ہیں۔“ اسے ایک اور خیال ستایا نا۔
تو وہ ظہیر سے شناسائی والی بات ماں سے شیر نہیں کر سکی تھی۔

اس رات عدیل کا جو اتنا مختلف رویہ اس کے ساتھ تھا۔ اس کو تو وہیں سے ڈر سالگ گیا تھا۔ کتنا بھی چاہے شوہر کیوں نہ ہو اس کے دماغ میں بیوی کی کوئی کمزوری آجائے تو پھر وہ سارا پیار محبت بھول جاتا ہے۔ وہ ایسا دوسرا موقع عدیل کو دینا نہیں چاہتی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ تم رہ لو دو چار دن آئی کی طرف۔ میں ان سے خود بات کر لوں گا۔ یوں بھی گھر میں تو اس کا صرف پریشانی چل رہی ہے۔ تم آکر کون سا کوئی مسئلہ حل کر دو گی۔“

وہ آئی آسانی سے مان جائے گا بشری کو یہ بھی اندازہ نہیں تھا۔ اس نے ذکیہ کے کہنے پر ڈرتے ڈرتے عدیل سے فون کیا تھا اور ماں کے خدشے نرم زبان میں بیان کیے تھے۔

اسے تو ویسے بھی اس ماحول میں بشری کا رہنا کھٹک رہا تھا کہ کہیں کوئی اونچ نیچ نہ ہو جائے۔ بشری کے بات کرنے ہی وہ راضی ہو گیا۔ یوں بھی آج کل نسیم بیگم کا دم خم ختم ہو اڑا تھا۔ کچھ ہوئے کوئلے کی طرح ہو رہی تھیں وہ۔

عدیل کو پتا تھا وہ اعتراض نہیں کریں گی۔ مگر عدیل کی درد سری تو موجود تھی کہ زاہدہ بیگم اور ظہیر اپنے مطالبے سے ایک اونچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ عدیل نسیم بیگم کے مجبور کرنے پر ان کے گھر گیا تھا ملنے مگر ان کی وہی ایک

رٹ رہی کہ بیس لاکھ ملیں گے تو ہی ظہیر کی زندگی سیٹ ہوگی اور اس کی وجہ سے فوزیہ عیش و آرام سے رہ سکیں گی جبکہ وہ دونوں ماں بیٹا بار بار فوزیہ کے ایسے کسی بھی مطالبے کی نفی کر رہے تھے مگر زاہدہ بیٹے کے ساتھ یوں ثابت قدم تھیں جیسے ان کی ڈیمانڈ پوری نہیں ہوئی تو وہ کسی بھی انتہا جاسکتے ہیں۔ عدیل نے تھکے ہوئے انداز میں

بند کر کے بے دلی سے آفس کا کام کرنا شروع کر دیا۔ اگرچہ ٹائم ختم ہو چکا تھا تھا لیکن اس کا گھر جانے کو بھی جی چاہ رہا تھا۔

یوں ہی بیٹھا پریشان سوچوں میں الجھتا رہا۔



وہ بار بار کتنی جارہی تھی اور رقم جیسے سگرتی جارہی تھی۔

واقعہ اسی مدبرانہ انداز میں اس کے پاس بیٹھا تھا۔

”مما آپ کتنی بار گنیں گی ان پیسوں کو۔ بس کریں نا!“ وہ نرمی سے بولا تو عاصمہ تھکن بھرے انداز میں

والتق اہمارا گزارہ کیسے ہوگا۔ ہم کیا کریں گے بیٹا؟ وہ پھر سے رونے لگی تھی۔
 ”مما! انکل زبیر آ رہے ناشام میں آج۔ انہوں نے بابا کے آفس میں بات کی ہوگی تو کچھ نہ کچھ تو توں
 ملے گا۔“ وہ اب ہر معاملے میں ماں کے ساتھ ساتھ تھا۔
 ”دکھتا ہوگا۔ مستقل تو کچھ بھی نہیں بنا۔“ وہ بہت پریشان تھی۔ اس کی راتوں کی نیند غارت ہو چکی تھی۔
 کا خواب بھی بکھر چکا تھا۔ اب روز مرہ کے اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔ بچوں کے اسکول کے ڈیوڑھوں
 اور دوسری ضروریات۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ شل ہوا جا رہا تھا۔ پھر کچھ خیال آنے پر اس نے اپنا جیو لری
 نکالا۔

زبور کے نام پر ایک سیٹ اور چار چوڑیاں ہی تو تھیں۔ اس کے علاوہ والٹق کی چھوٹی سی انگوٹھی ایک
 انگوٹھی اور اربہ کی چھوٹی سی چین۔ وہ ایک ایک چیز کو جیسے تول رہی تھی۔
 ”نی الحال یہ جو رقم ہے۔ اس سے کچھ ضروری سامان منگوا لیں۔ باقی چیزیں بعد میں دیکھ لیں گے۔“
 نے ماں کے ہاتھ میں پکڑے سترہ ہزار کی طرف اشارہ کیا۔
 ”ہاں تمہارے دادا کے گریجویٹ فنڈ میں سے دیکھو ہمیں کیا کچھ ملتا ہے۔ ویسے اب وہ لوگ کسی قسم کی کوشش
 نہیں کریں گے لیکن پھر بھی وقت تو جیسے کوئی انتقام لینے کھڑا ہے۔“ وہ بہت تھک سی گئی تھی۔ چند دنوں میں وہ جیسے
 کئی سال آگے چلی گئی تھی۔ اس کا چند دن کا اکیلے رہنے کا تجربہ آئندہ کی پوری زندگی کے لیے نقد برین گیا تھا۔
 اب والٹق کی یاد دہانی کے بغیر بھی وہ رات کو سونے سے پہلے سارے گھر کی کھڑکیاں دروازے سب چیک کرتی
 رات کو اٹھ کر بچوں کو دیکھتی۔ میٹھیوں چڑھ کر چھت کا دروازہ دیکھتی۔ دن بھر بچوں کو گھر سے باہر نہ نکلنے دیتی
 اگر وہ کہیں دور نکل گئے تو کون ان کو ڈھونڈنے جائے گا۔

سعودی عرب سے اس کے بھائی کا فون آ گیا تھا۔ اسے عاصمہ کے ساتھ بیت جانے والے سانحے کا بے حد
 تھا۔ مگر وہ ابھی آ نہیں سکتا تھا۔ سو تین مہینوں بعد چکر لگانے کا کہہ رہا تھا۔ عاصمہ کیا کہتی۔ اب تو اس کا جیسے بالکل
 نور ہی نہیں رہا تھا۔ اس نے اللہ حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔
 مالک مکان نے کیم تاریخ آجانے کے باوجود ابھی کرایہ نہیں مانگا تھا لیکن ظاہر ہے وہ ہمیشہ تو خاموش نہیں رہے
 گا۔

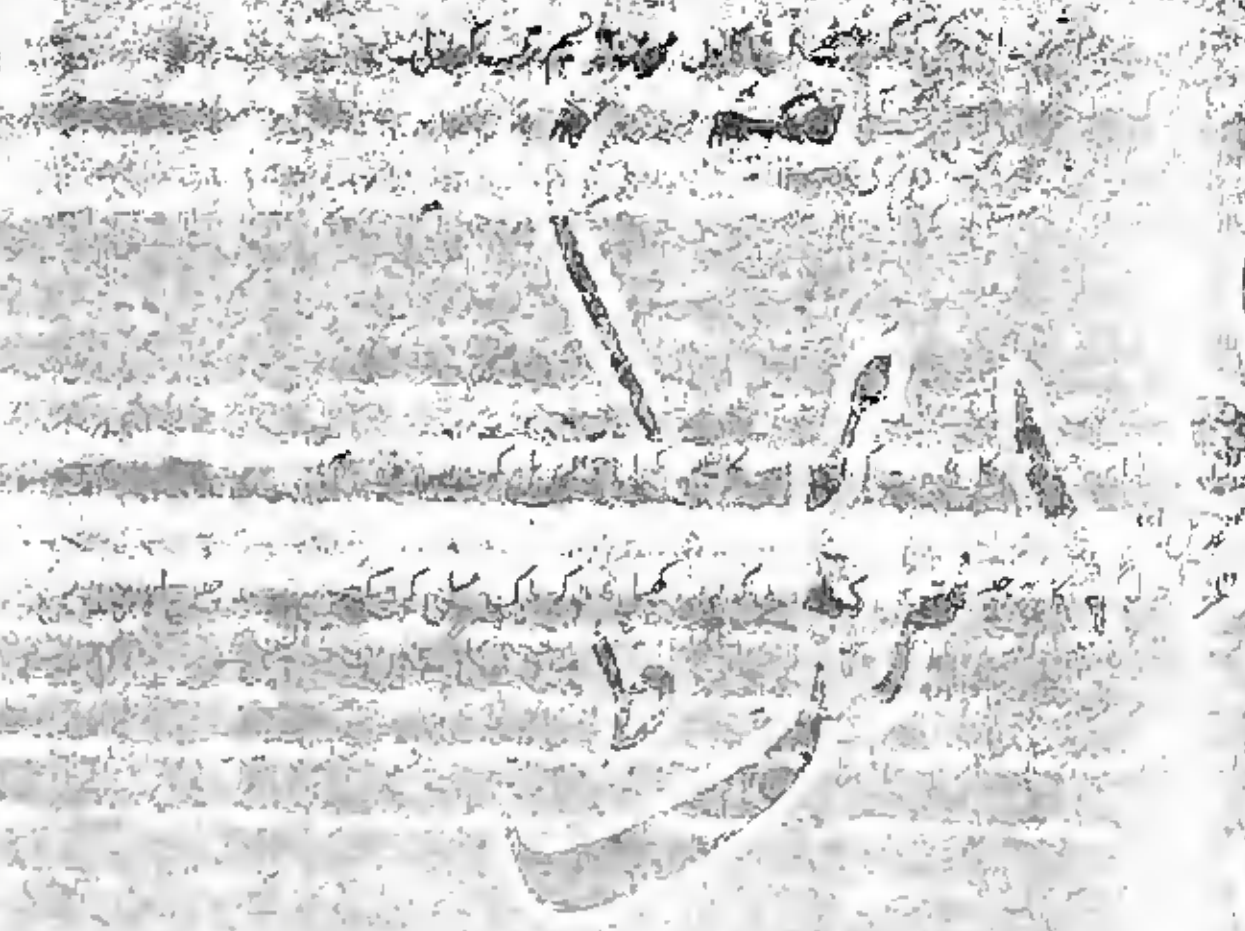
چند دن پہلے یہ سب کچھ کتنا مختلف تھا۔ پہلے تو صرف دونوں کی تنخواہوں میں مہینے بھر کے اخراجات اچھا
 کرنے کی فکر ہوتی تھی اور اب یہ پریشانی ہے کہ آمدنی کے نام پر کیس سے بھی کیا آئے گا کیسے آئے گا اور اب
 چھتہ ایکلی عورت اتنے چھوٹے بچوں کے ساتھ اس معاشرے میں کیسے رہتی ہے۔ عاصمہ کو اندازہ ہی نہیں
 تھا۔

بڑے بڑے سوال جیسے محوتین کر اسے ڈرو لے لگے تھے
 وہ اندر ہی اندر سسکتی جا رہی تھی۔



”کیا لہیہ کیا کہہ رہی ہیں۔ آپ۔“ عدیل نے ابھی آفس کا ایک کھمبے سے اتار کر رکھا تھا جس میں تاکہ
 بیگم کی بات سن کر وہ بیٹھے بیٹھے بکھر گیا تھا۔
 بیگم نے پھوٹ پھوٹ کر دماغ شروع کر دیا۔ نوزیر پچھلے سوئے پر منہ دوسری طرف کیسے بیٹھی تھی۔

والتق اہمارا گزارہ کیسے ہوگا۔ ہم کیا کریں گے بیٹا؟ وہ پھر سے رونے لگی تھی۔
 ”مما! انکل زبیر آ رہے ناشام میں آج۔ انہوں نے بابا کے آفس میں بات کی ہوگی تو کچھ نہ کچھ تو توں
 ملے گا۔“ وہ اب ہر معاملے میں ماں کے ساتھ ساتھ تھا۔
 ”دکھتا ہوگا۔ مستقل تو کچھ بھی نہیں بنا۔“ وہ بہت پریشان تھی۔ اس کی راتوں کی نیند غارت ہو چکی تھی۔
 کا خواب بھی بکھر چکا تھا۔ اب روز مرہ کے اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔ بچوں کے اسکول کے ڈیوڑھوں
 اور دوسری ضروریات۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ شل ہوا جا رہا تھا۔ پھر کچھ خیال آنے پر اس نے اپنا جیو لری
 نکالا۔



بڑے بڑے سوال جیسے محوتین کر اسے ڈرو لے لگے تھے
 وہ اندر ہی اندر سسکتی جا رہی تھی۔

تماشا نہ بنتی۔ اپنی ہی نظروں میں یوں نہ کرتی۔ کوئی نہیں ہے میرا۔ نہ ماں نہ باپ نہ بھائی۔ آپ کی چاہتی تھی تاکہ میں عمر بھر بونہی بن گیا ہی نہیں بیٹھی رہوں تو جا کر اسے مبارکباد دیجیے گا اس کی ساری پوری ہو گئیں۔ گھر بیٹھے طلاق کا اپنا ارڈر مل جائے گا مجھے خوش ہو جائے۔

وہ روتے ہوئے پھٹی آواز میں بولتی چیزوں سے ٹکراتی عدیل کے بڑھے ہوئے ہاتھوں کو جھٹکتی باہر نکل گئی اس نے جس زور سے جا کر اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا تھا عدیل کو یقین ہو گیا اب وہ کل سے پہلے تو یہ نہیں کھولے گی۔ عدیل بے چارگی سے ماں کو دیکھنے لگا۔

”آہ! وہ پھر سے عدھال ہو کر بیٹھ گیا۔ نسیم بیگم نے زور سے اس کا ہاتھ پرے ہٹایا تو وہ اور جھنجھلا گیا۔

”بتائیں کہاں سے کروں میں اتنی بڑی رقم کا بندوبست۔ جمع جتنی نکالوں۔ ادھر ادھر سے ادھار بھی لوں پانچ لاکھ سے اوپر نہیں کر سکتا۔ آپ انہیں بتائی کیوں نہیں اپنی مجبوریاں؟“

”تمہارا کیا خیال ہے۔ میں جان بوجھ کر تمہیں پریشان کر رہی ہوں۔ ماں ہوں مجھے تمہاری پریشانی کا احساس نہیں ہے کیا؟“ وہ تڑخ کر بولیں۔

”نہیں امی! مجھے پتا ہے لیکن انہیں کہیں اگر میں پانچ لاکھ دے دوں تو۔“

”بات کی سہمی میں نے۔ تمہارا پر آنے کی بات کرتے ہو وہ بیس لاکھ سے انہیں پر بھی نہیں آ رہی ہیں۔ تمہارا میں کیا کروں؟“ نسیم بیگم نے جس طرح کہا۔ عدیل سے مزید کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ دونوں یوں چپ ہوئے جیسے کبھی نہیں بولیں گے۔

”آئیں نہیں بشری بیگم تمہارے ساتھ؟“ بہت دیر بعد وہ طنز سے بولیں۔

”اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں بھی بہت تھک سا گیا تھا خود ہی آجائے گی ایک دو دن میں عمران کے ساتھ۔“ وہ لہجے میں بے زاری سمو کر بولا کہ کہیں ماں کو یہ شک نہ ہو جائے کہ وہ خود اسے وہیں رہنے کا کہہ رہا ہے۔

”ہاں معلوم تھا مجھے۔ اسے ہمارے دکھ درد اور پریشانی کا کیا احساس ہو گا۔ اس کی ماں تو خوشی سے بغلیں بجاتی ہوگی۔ جانتی ہوں میں اس عورت کی فطرت کو۔“ وہ زہر بھرے لہجے میں بولیں۔

”امی! میرے واقعی سچھے میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں۔ بہت سوں سے قرضے کی بات کی ہے مگر آج کل کے دور میں جب لوگوں کے روز مرہ کے اخراجات پورے نہیں ہوتے ایسی چوڑی بچت کس کے پاس ہوتی ہے۔ میں تیس ہزار سے اوپر کوئی بھی دینے پر راضی نہیں۔“ وہ بے چارگی سے بولا۔

”ایک طریقہ ہے جس سے تم بغیر قرض لیے آدھی رقم کا تو بندوبست کر ہی سکتے ہو۔“ نسیم نے جتانے والے انداز میں کہا تو وہاں کو دیکھنے لگا۔

”بھابھی! تین لاکھ کا چیک ہے جو دس تاریخ کو کیش ہو سکے گا۔ عفان کے ڈھائی لاکھ کے ڈپوز تھے۔ باقی کے چھپان ہزار آفس نے خود ہی ایڈ کر لیے ہیں۔ سوائٹ جیٹا میٹرک کر چکا ہوتا تو یقیناً وہ اس کی کسی نہ کسی طرح آفس میں جگہ بنا دیتے مگر ابھی۔“

واثق نے یوں شرمندگی سے سر جھکا یا جیسے اس میں اس کا قصور ہو کرے میں کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ ذرا دیر بعد زبیر نے دو سری فائل کھولی۔ کچھ دیر کچھ ورق الٹ پلٹ کر دیکھا رہا۔

”آفس کے گریجویٹ فنڈ سے دس لاکھ تو وہ عفان کے چھوٹے بھائی جمشید کے علاج کے لیے پہلے ہی نکلاوا چکے تھے۔ اب کو یا رہے نا؟“ عاصمہ نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا۔ اب وقت کی اس ستم ظریفی کو کیا کہے کہ پانچ سال پہلے جمشید کو اچانک کینسر تشخیص ہوا اور فاروق صاحب نے اس کے علاج پر پانی کی طرح پیسہ بہلایا۔ مگر اس کی زندگی نے وفا نہیں کی۔ اب وہ دس لاکھ کا خسارہ بھی ان کی تقدیر پر ثبت ہو گیا۔

”اب یہ سات لاکھ ہیں۔ پندرہ تاریخ کو آپ کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہو جائیں گے۔ باقی جو کچھ بھی ان فائلوں میں لکھا ہے آپ فارغ نام میں دیکھ لیجئے گا۔“ وہ جیسے سب کچھ بول کر ایک دم سے خاموش ہو گیا۔ کمرے میں پھر خالد خاموشی تھی۔

”آپ نے آگے کیا سوچا ہے بھابھی؟“ وہ بہت دیر بعد بولا۔

”ابھی تو کچھ بھی نہیں۔ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا زبیر بھائی۔“

”کاش! وہ گاؤں جاتے ہی نہیں۔ منحوس زمین بکتی نہیں اور اس رقم کی وجہ سے انسانی جانیں نہ جاتیں۔“ وہ نہ جانتے ہوئے بھی سسکا اٹھی۔

”میں آپ کی پریشانی سمجھ سکتا ہوں۔“ وہ گہرا سانس لے کر بولا۔ ”مستقل آمدنی کے لیے یہی ہو سکتا ہے کہ آپ یہ ساری رقم بینک میں جمع کروادیں اس کے پرافٹ پر گزارہ کر لیں۔“ وہ ذرا دیر بعد بولا۔

”ابا جی! آپ کو جو گریجویٹ کی رقم ملے گی اسے بینک میں پڑا رہنے دیجیے گا۔ اچھی بھلی ماہانہ آمدنی آنے لگے گی پرافٹ کی شکل میں۔“ وہ ابا جی کے جمعے کے لیے سفید کپڑے کلف لگا کر استری کر رہی تھی جب اس نے فاروق صاحب کو مشورہ دیا تھا۔

”نہ بیٹا! عمر بھر بری بھلی ہمیشہ کوشش کی کہ حلال کھاؤں اور بچوں کو بھی حلال کھلاؤں۔ اب اس عمر میں اگر حرام کھلاؤں؟ سب کچھ عارت کروں؟“ وہ لنگھی میں سر ہلا کر بولے۔

”کیا مطلب ابا جی؟“ وہ جزبہ سا ہوئی تھی۔

”بیٹا! سود ہمارے مذہب میں حرام ہے اور یہ پرافٹ سود کے زمرے میں آتا ہے۔ ایسا آئندہ کبھی سوچنا بھی نہیں۔“ وہ اسے تشبیہ کرتے ہوئے بولے تو عاصمہ سر ہلا کر ان سے متفق ہو گئی۔ وہ تو یوں بھی ان کی ہر بات پر راضی ہو جانا کرتی تھی۔ یہ بات تو بہت بڑی تھی۔ وہ کہے بھول جاتی۔

”بہت شکر یہ زبیر بھائی! میں یہ دیکھ لوں گی۔“ وہ آہستگی سے دونوں فائلیں اپنے آگے کرتے ہوئے بولی۔

”تو ٹھیک ہے بھابھی! میں ابھی دس دن ادھر ہی ہوں آپ کی رقم ٹرانسفر ہو جائے گی تو بس پھر میں جاؤں گا آپ کو جو بھی مسئلہ ہو مجھ سے کہہ دیجیے گا۔“ وہ فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”ضرور۔“ وہ سر ہلا کر بولی۔

واثق بھی ساتھ کھڑا ہو گیا اور زبیر انکل کے ساتھ چلتے ہوئے باہر نکل گیا۔

عاصمہ دونوں فائلوں کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی۔ اسے اب جو کچھ بھی سوچنا تھا ان دس لاکھ روپوں سے سوچنا تھا کہ زندگی بار بار اس کو ایسے مواقع نہیں دے گی۔

کے جانے گا اور دو تین لاکھ کا امی کا۔ اس طرح مل ملا کر بیس لاکھ کے قریب ہو ہی جائے گا۔ کم از کم میری بہن کی زندگی اجڑنے سے بچ جائے گی تو یہ رقم بہت بڑی نہیں۔“

اور بشری کسی بہت کی طرح اسے دیکھے جا رہی تھی جو اپنی دھن میں بار بار دہراتے ہوئے گویا خود کو قتل دے جا رہا تھا۔

”اور اگر میں انکار کر دوں؟“ بشری بہت دیر بعد سرو لہجے میں بولی تھی۔

گاڑی کے نائزور سے چرچائے تھے عدیل کے لیے یہ بات بالکل غیر متوقع تھی۔

اس نے گاڑی ایک طرف روکی اور تیز نظروں سے بشری کو دیکھنے لگا۔

”تم کہنا چاہتی ہو کہ تمہیں اپنا زیور اور اپنی ماں سے لیا جانے والا قرض میری عزت سے زیادہ پیارا ہے۔“ وہ رک رک کر یوں بول رہا تھا جیسے لفظوں کو تول رہا ہو۔

”بات آپ کی عزت کی ہے عدیل! تو میں بھی آپ کی عزت ہوں۔ وہ زیور آدھا آپ لوگوں کی طرف سے تھا بے شک مگر عدیل صاحب تحفہ کسی کو دینے کے بعد اس سے چھینا جائے تو اسے کیا کہتے ہیں؟“ وہ طنز سے بولی اور عدیل کا چہرہ لمحہ بھر میں جیسے لال بھبھو کا ہو گیا۔

اس نے بغیر کچھ کہے گاڑی اشارت کی اور اندھا دھند دوڑانا شروع کر دی۔ گاڑی جس رفتار سے جا رہی تھی لگتا تھا آج وہ دونوں زندہ سلامت گھر نہیں پہنچ سکیں گے میری مثال۔ بشری کو آنکھیں بند کر کے بس آخری یہی خیال آیا تھا۔

”بھئی! پوچھ کر ملاتے ہیں کسی کو۔ بونہی اٹھا کر تم کسی کو بھی لے آؤ اور ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ اچھی بات نہیں۔ مجھے بتاتے تو۔“ وہ واٹس سے سخت سے بولتی اس کے ساتھ ڈرائنگ روم کی طرف آئی۔

”سوری ماما، وہ اٹکل کہنے لگے کہ آپ کی ماما نہیں جانتی ہیں بلکہ دادا ابو بھی جانتے تھے تو میں نے انہیں بٹھا دیا۔“ غاصد ڈرائنگ کے دروازے پر ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

- ☆ تئلیاں، پھول اور خوشبو راحت جسبیں قیمت: 250 روپے
- ☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 600 روپے
- ☆ محبت بیاں نہیں لہنی جدون قیمت: 250 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

”کچھ ایسا کروں کہ یہ رقم ضائع بھی نہیں ہو اور محفوظ بھی ہو جائے۔“ اس کا ذہن اب تیزی سے کام کر رہا تھا۔

”یوں تو ہر مہینے ایک لگی بندھی رقم چاہیے ہوگی۔ اگر اس بد میں ان دس لاکھ روپوں کو وہ خرچ کرے گی تو سال ڈیڑھ سال میں ختم ہو جائے گا اور اس کے بعد۔“ اس کے بعد کا خوفناک سوالیہ نشان اسے دہلا گیا۔

”کیا ہونا چاہیے اس رقم کا مصروف۔“ وہ رات کا کھانا بتاتے ہوئے مسلسل سوچے جا رہی تھی۔



”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں عدیل؟“ بشری کے سر پر جیسے کسی نے ہم پھوڑ دیا تھا۔ وہ شدید ہونٹ پیچھے عدیل کو دیکھتے ہوئے برا فروختہ ہو کر بولی۔

عدیل نے کڑی نظروں سے بشری کو دیکھا مگر کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

”عدیل! آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ مجھے ابھی امی کی طرف رہنا چاہیے کم از کم اس مسئلے کے حل ہو جائے تک۔“ وہ پھر سے پہلی بات کو نظر انداز کر کے بولی۔ شاید وہ بات عدیل کے منہ سے غلطی سے نکل گئی ہوگی۔

”اور اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے بھی تو کچھ کرنا ہو گا اور تم جانتی ہو اسے صرف میں ہی حل کر سکتا ہوں۔“ وہ ترشی سے بولا۔

”میں سمجھی نہیں آپ کی بات۔“

”میں ہی کمانے والا ہوں نا اس گھر کا۔ تو مجھے ہی اسے ہینڈل کرنا ہو گا۔“

”لیکن عدیل! یہ تو غلط بات ہے تاکہ ان لوگوں کی ایسی بے جا ڈیمانڈ پوری کی جائے۔“ وہ تیزی سے بولی۔ اس کے لیے تو یہ بات ہی بہت حیران کن تھی کہ عدیل ان لوگوں کو رقم دینے کے لیے راضی ہو گیا۔

اور یہ یقیناً ”فوزیہ اور نسیم بیگم کے دادا کی بدولت ممکن ہوا ہو گا“ ورنہ پہلے تو عدیل اس معاملے میں کوئی بات نہیں سننا چاہتا تھا۔ اسے گھر سے جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ مگر اب پچھتائے گا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

”تو تم کیا چاہتی ہو میں اپنی بہن کو طلاق دلوں کر ہمیشہ کے لیے گھر بٹھالوں؟“ وہ یوں اجنبی لہجے میں بولا جیسے بشری کو اس سے کوئی مطلب نہ ہو۔

”عدیل مگر۔“ وہ بوکھلا کر رہ گئی۔ اس رات والا عدیل پھر اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

”بشری! ان لوگوں کا مطالبہ غلط یا صحیح ہمارے پاس اس کو مان لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔“

”واشبہ۔ آپ کہاں سے کریں گے بیس لاکھ کا انتظام۔ سوچا ہے آپ نے؟“ وہ تو بھڑک اٹھی۔ عدیل نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی اور لمحہ بھر خاموش رہا۔

”عدیل! میں کیا کہہ رہی ہوں۔“

”سوچ لیا ہے میں نے سب کچھ تو تم کیوں چیخ رہی ہو۔“ وہ اسی اجنبی لہجے میں کٹھورین سے بولا۔ بشری اسے دیکھتی رہ گئی۔

”میں رات میں تمہیں واپس آنی کی طرف چھوڑ جاؤں گا۔“

”کیا مطلب؟“

”ہے تو بہت گھٹیا سی بات مگر مجبوری ہے۔ تم آئی سے دو تین لاکھ روپے ادھار کے طور پر لوگی۔“ وہ بے چنگ لہجے میں بولا۔

”عدیل! یہ وہ صا کا پہلے سے بھی زیادہ زور دار تھا۔“

”پانچ لاکھ کا انتظام میں کسی طرح کر لوں گا۔ تین لاکھ کا عمران اور آئی کریں گی۔ سات آٹھ لاکھ کا تمہارا زیور

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹیبل :-

- ✧ ہرائی بک کا ڈائریکٹ اور رٹریبون ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ایب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہرائی بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایپلوڈنگ
- ✧ نیریم کوالٹی، منڈل کوالٹی، کپریٹڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم ابر
- ✧ ابن صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے ہی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جلسہ کی ضرورت نہیں ہیری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

رُحسانہ نگارِ زنان



عدل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشری ان کی بہوت اور ذکیہ بیگم کی بیٹی عمران بشری کا بھائی ہے۔ مثال ذکر بیگم کی تو اسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشری اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصطفیٰ بیٹا بہو ہے لگاوت و کھالی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کنا ہے۔ ان کی بیٹی بشری کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ذکیہ بیگم اپنے بیٹے عمران کے لیے بھی لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔ سناچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشری کی سند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشری دو لہا ظمیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدل سے شادی سے قبل ظمیر کا بشری کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشری اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کرتا ہے۔ بشری اور عدیل ایک مہنے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشری کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عغان اور عاصمہ اپنے نین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عغان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹ اور گھڑوں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ زمین کا سودا کر کے وہ عغان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہیں۔ عاصمہ کو فون کے ذریعے کوئی اطلاع ملتا ہے جسے سن کر وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔

فون پر پتا چلتا ہے کہ شر آتے ہوئے عغان اور فاروق صاحب زکیتی کی وادعات میں قتل ہو گئے۔ عغان کے فری فون دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عغان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹ سے سات لاکھ روپے وصول کر پالی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔



اسلم چچا نے کیا جواب دیا تھا وہ اپنے ساتھ ہونے والی خودکلامی میں سن ہی نہ سکی۔
 ”یہ لو بیٹا تمہاری امانت۔“ وہ ان کی آواز پر بری طرح سے چونکی۔ انہوں نے سفید رنگ کا لٹافہ اس کے آگے
 کھسکا دیا تھا جو خاصا پھولا ہوا تھا۔

عاصمہ لٹافے کو ہاتھ لگائے بغیر سوائیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔
 ”شاید اللہ کو یہ سب کچھ ایسے ہی ہونا منظور تھا۔“ وہ گہرا سانس لے کر بولے۔ عاصمہ ان کی بات کا مطلب
 سمجھ کر کچھ بول ہی نہ سکی۔ ابھی تو زخم اتنا کچا تھا کہ بغیر ٹھیکس کے بھی اس میں سے ٹھیکس اٹھتی ہی رہتی تھیں۔
 ”میری بیٹی کی شادی تھی۔ میں نے فاروق سے یوکی ذکر کیا کہ اس بار فصل ٹھیک نہیں ہوئی۔ ساتھ کی شادی کا

ارادہ اگلے سال کے لیے اٹھایا تھا کہ لڑکے والوں نے ایک دم سے اصرار شروع کر دیا۔ وہ بھی کچھ ایسے کہ شادی
 کیے بغیر چارہ نہیں۔

میں نے فاروق سے نہ کوئی سوال کیا تھا نہ جی کا حال سنایا تھا پھر بھی ایسا محبت کرنے والا اچھی نیک طبیعت کا
 انسان تھا جیسے ہی زمین کا سودا ہو اس نے رات میں مجھے خاموشی سے یہ چار لاکھ روپے لاکر دے دیے۔

اسلم چچا بے خوف ہو کر ساتھ کی شادی کے دن رہیں۔ ”میں نے لینے سے صاف انکار کر دیا تو کہنے لگا۔“ چلیں
 اسے ادھار سمجھ کر رکھ لیں جب بھی سولت ہو لوٹا دیجیے گا۔“ وہ رک کر اپنے ڈمگاتے لہجے کو سنبھالنے لگے
 آنکھوں کے سامنے رشتے کے نتیجے کی تصویر جچی تھی جیسے وہ ابھی تک ان کے سامنے بیٹھا محبت بھری باتیں کر رہا
 تھا۔

”اور یہ خوفناک واقعہ ہو گیا۔ تمہیں تو شاید اس رقم کا علم بھی نہیں ہو گا بیٹی!“ وہ اس طرح چپ بیٹھی رہی۔
 ”ساتھ کے بھائی نے بحرین سے دو لاکھ روپے بھیج دیے۔ اتنی رقم میں میں اپنی بیٹی کی عزت سے رخصتی کر سکتا
 ہوں تو میرے ضمیر نے گوارا نہیں کیا کہ میں یہ چار لاکھ استعمال میں لے آؤں جبکہ ان روپوں کی جتنی ضرورت
 تمہیں اور تمہارے بچوں کو ہے کسی کو بھی نہیں ہوگی۔ اگر وہ ظالم رقم لے جاتے ان دنوں کی جان بخش جاتے تو
 بھی میں شاید اتنی جلدی رقم نہیں لوٹا تا مگر اب بیٹی! تم یہ رکھ لو۔ میرے سینے پر بہت بوجھ ہے۔ کئی راتوں سے اس
 کی وجہ سے سو نہیں پایا۔ رب نے بشر کے ساتھ انیس کو یونہی نہیں لگایا۔ وہ لحد موقع کی تاک میں رہتا ہے۔ اب
 جانے کب میری نیت میں فتور آجائے اور میں مگر ہی جاؤں تم یہ رکھ لو بیٹی۔“

انہوں نے یوں ڈرے ہوئے انداز میں لٹافہ مزید عاصمہ کے آگے کھسکا جیسے وہ اٹھائے گی نہیں تو وہ مگر ہی
 جائیں گے۔

”اگر آپ کو ضرورت ہے چچا! تو آپ بے شک رکھ لیں۔ اباجی نے آپ کو دی تھی یہ رقم تو۔“ اسے ایک بار
 مروتا ”کہنا ہی تھا اور یہ بھی کہ معلوم تھا کہ انہیں رقم کی واقعی ضرورت ہے۔ وہ دو لاکھ کا انتظام ہو جانے کی بات خود
 سے بنا کر لائے ہوں۔

”نہیں میری بیٹی! اللہ تیری مشکلیں کم کرے۔ تیری ضرورتوں کے آگے تو میری ہر ضرورت چھوٹی اور چھوٹی
 ہے۔ تیرے گھر کے چھپر چھاؤں چلے گئے۔ تجھے اپنی ہمت اپنی طاقت سے اب اپنے بچوں کے لیے چھپر بھی ڈالنا
 ہے اور ان کی چھاؤں بھی بنانا ہے۔“ وہ گلوگیر آواز میں بولے اور عاصمہ کی آنکھوں سے ضبط کرتے کرتے جھکا
 آنسو پھوٹ نکلے۔

”بہت مان سے کہہ رہا تھا فاروق مجھ سے چچا! اب اپنا بہت اچھا سا گھر لینا ہے۔ ان پیسوں سے جا کر پھر میں
 گاؤں سے آپ سب کو بلواؤں گا اور شان داری دعوت ہوگی۔ اپنے گھر کی کیا بات ہے۔ اس کا اندازہ تو وہی کر سکتا

ہے جو کچھ عرصے پر اٹے گھروں میں رہ چکا ہو۔ میری بہو کی بڑی خواہش ہے اپنے گھر کی اللہ کا شکر ہے کہ میں بچوں
 کو اپنی چار دیواری دے کر جاؤں گا۔ اور وہ کھو اس کی یہ حسرت۔ حسرت ہی رہ گئی۔“ وہ آہ سی بھر کر بولے۔
 ”یہ بڑا بچہ ہے تمہارا؟“ وہ اٹن کو دیکھ کر بولے۔

”پورے بچے ہیں؟“
 ”جین چھوٹی بیٹیاں ہیں۔ واثق بڑا ہے ان تینوں سے۔“
 ”خاندانوں کو اللہ دنیا اور آخرت میں رسوا اور برباد کرے جنہوں نے تھوڑے سے پیسوں کی خاطر اپنی گور کالی کی۔
 ان عضو موں کے سر سے باپ دادا کا سایہ چھینا۔“

عاصمہ نے آہستگی سے اپنا چہرہ صاف کیا۔ اب تو اس کا دل ان کو بدعالمیں دینے پر بھی راضی نہیں تھا۔ اس نے
 اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا یقیناً ”اللہ سے بڑھ کر کوئی انصاف کرنے والا نہیں۔“
 ”پولیس کو کچھ بتا نہیں چلا ان کا؟“

عاصمہ نے نفی میں سر ہلا دیا تو وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔
 ”چچا! کھانا کھا کر جائیے گا نا۔ کھانا تیار ہے۔“ عاصمہ اصرار سے بولی۔
 ”اللہ تمہارے گھر کا جو لہا ہمیشہ جلتا رکھے۔ آباد رہو۔ اپنے بچوں کے سر پر سلامت رہو۔ ہر مشکل میں اللہ
 تمہاری رہنمائی کرے بیٹی! یہ میرا فون نمبر ہے۔ گھر کا نمبر ہے جب کبھی جو بھی پریشانی یا مسئلہ ہو بلا جھجک مجھے فون
 کر لیتا۔ میں تمہارے لیے فاروق کی طرح ہی تو ہوں بیٹی! باپ سمجھ کر اپنی پریشانی کہہ دیتا۔“

”اور پھر چچا! لیکن آپ بیٹھے تو کھانا کھا کر جائیں سب تیار ہے۔“
 ”خوش رہو آباد رہو۔ میرا فون نمبر سنبھال کر رکھنا۔ اللہ حافظ!“
 وہ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر چلے گئے۔
 واثق اس لٹافے سے رقم نکال کر ماں کو دکھاتے ہوئے گننے لگا۔

”اباجی! میں آپ کو کہاں کہاں یاد کروں۔ ابھی تک جتنی رقم کا انتظام ہو سکا۔ وہ سب آپ کی وجہ سے۔ مگر یہ
 ایلان میں کسے آپ دونوں کے بغیر رہنا سیکھوں گی۔“
 ”مما! کاؤنٹ کریں نا کتنی رقم ہے۔ کتنی کہہ رہے تھے انکل؟“ واثق نے ہاتھ ہلا کر اسے متوجہ کیا۔ شاید نوٹوں
 کی تعداد دیکھ کر اس سے گنتا مشکل ہو رہا تھا۔

”واثق! شاید اب ہم اپنا گھر لے ہی سکیں۔“
 ”مما! واقعی ممما! ایسا ہو سکتا ہے اتنے پیسوں میں گھر لے سکتے ہیں ہم۔“
 ”اچھا کرنا ایسا ہو جائے۔“ وہ رقم گنتے ہوئے بولی۔



بھرتی حسرت بھرے انداز میں اپنے آگے پڑے زیورات کے خالی ڈبے دیکھ رہی تھی۔
 ایک انگوٹھی تک عدیل نے اس کے پاس نہیں چھوڑی تھی۔ صرف اس کے گلے کی چین تھی جو بشری کی
 نوٹوں کا تحفہ تھی جسے نہ بشری اپنے لیے مانی نہ عدیل نے ہی اصرار کیا۔
 ”مگر سب تو چلا گیا نا!“ اس کی آنکھوں میں بار بار آنسو آئے جا رہے تھے۔

”مما! آپ کی جیولری کہاں تھی۔ آپ نے یہ سارے باکس خالی کیوں کر دیے۔ کیا تانوکے گھر لے کر جا رہی تھی۔“ مثال اپنی اسکول کی کتاب لیے بشری سے کچھ پوچھنے کے لیے آئی تھی کہ بیڈ پر بکھرے ان سرخ جامنی مٹیلین ڈیوں کو دیکھ کر مجس انداز میں کھول کر دیکھنے لگی۔ ایک کے بعد ایک سارے ڈبے خالی تھے تو وہ ماں سے پوچھنے لگی۔

”اٹھا کر رکھ دو انہیں ایک طرف۔“ وہ چڑھے انداز میں بولی۔
 مثال نے بمشکل تمام ڈبے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیے۔
 ”مما! آپ رو رہی ہیں؟“ وہ ماں کا ہاتھ پکڑ کر ہمدردی سے بولی۔

”نہیں میری جان! بس کیوں رو رہی تھی۔“ بشری آنکھیں رگڑ کر بولی۔ وہ ماں کو غور سے دیکھنے لگی۔
 ”پھپھو اور دادو بھی رو رہی تھیں۔ میں ان کے پاس جانی ہوں تو وہ مجھے ڈانٹنے لگتی ہیں۔“

”تو جان! آپ ان کے پاس مت جاؤ۔ اپنے روم میں رہو بس۔“ بشری اسے ساتھ لگا کر بولی۔
 ”بابا بھی اب مجھے پیار نہیں کرتے۔ سب پیسوں کی بات کرتے ہیں ممما! اگر بابا کو پیسے چاہئیں تو میرے بینک میں اتنے سارے پیسے ہیں۔ میں نے جمع کر رکھے ہیں۔ میں وہ بابا کو دے دوں پھر تو وہ خوش ہو جائیں گے؟“ مثال ماں کی طرف دیکھ کر معصومیت سے بولی۔
 ”میری جان کتنی حساس ہے۔ بیٹا! بابا پریشان ہیں۔ آپ بس اللہ میاں سے دعا کرو کہ ان کی پریشانی دور ہو جائے۔“

”میں دعا کروں گی اور نانو نے کہا تھا ڈھیر ساری دعا اپنے بھائی کے لیے بھی مانگنا۔ تمہارا بھائی آنے والا ہے۔ ممما نانو ٹھیک کہہ رہی ہیں؟“

وہ ماں کا چہرہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں لے کر اشتیاق بھری خوشی سے پوچھنے لگی۔
 ”ہاں جان! نانو ٹھیک کہتی ہیں۔ آپ بس اللہ تعالیٰ سے ڈھیر ساری دعا کرو کہ پیارا سا بھائی آپ کو مل جائے اور بابا کی ساری پریشانیاں بھی دور ہو جائیں۔“ بات کرتے ہوئے وہ کھوسی گئی۔
 ”اگر سارا زیور بیچ کر بھی مطلوبہ رقم نہ مل سکی تو۔۔۔“

عدیل نے اب تک کی گئی ساری بچت بھی اس جوئے میں جھونک دی ہے۔ انہوں نے تو نہ کچھ ہمارے بارے میں سوچا ہے نہ آنے والے بچے کے بارے میں۔ سب کچھ تو ان چڑیلوں نے داؤ پر لگوا دیا ہے۔ اتنا سارا زیور دہانا کبھی بھی نہیں بن سکتا۔ میری مثال کے لیے تو ایک چھٹلا نہیں بچا۔“ وہ چاہتے ہوئے بھی اس تکلیف دہ احساس سے باہر نہیں نکل پا رہی تھی حالانکہ عدیل نے اس سے بہت دعوے کیے تھے کہ وہ اس سال کے آخر تک لادائی اسے دو جوڑیاں اور ایک لاکھ سیٹ ہواوے گا مگر اس کے بے قرار دل کو قرار مل ہی نہیں رہا تھا۔
 اس کا سیل فون کافی دیر سے بج رہا تھا۔

”مما! نانو کا فون ہے۔ آپ سن کیوں نہیں رہیں۔“ مثال ہوم ورک کرتے ہوئے اپنے کمرے سے اٹھ کر آئی اور ایک طرف پڑا فون اٹھا کر اسے دیا۔ بشری گرا سا بس لے کر فون سننے لگی۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں امی آپ! بشری ان کی بات سن کر ایک دم سے پریشان ہو گئی۔
 ”بیٹا! میں نے اور عمران نے تو بہتری کو سس کی۔ صرف ستر ہزار روپے ہیں میرے پاس بینک میں۔ وہ بھی میں نے عمران کی شادی کے لیے اٹھا رکھے ہیں۔ اصل میں عمران نے جس شخص کو ڈھائی لاکھ اوجھاروے رکھا تھا۔ یقین کرو میرا بچہ آدمی رات تک اس کینے کے گھر بیٹھا رہا۔ اس نے اگلے مہینے کا کہہ کر ٹال دیا۔ اب بتاؤ کیا کریں

”ایک دم سے تین لاکھ کا انتظام نہیں ہو سکتا۔“
 ”میں نے زمانے بھر کی مظلومیت سمو کر بولیں۔ بشری اسے تو کچھ دیر بولا ہی نہیں گیا۔
 ”میرا زیور بکنا تو بے کار ملے گا، اگر امی کی طرف سے تین لاکھ کا انتظام نہیں ہو گا اور عدیل نے زیور تو بیچ بھی دیا ہو گا شاید، ابھی سہیچا ہو میں جلدی سے انہیں فون کر کے بتا دیتی ہوں کہ امی نے انکار کر دیا ہے۔“

اس نے جلدی سے ذکیہ کی کال کاٹ کر عدیل کا نمبر ملایا۔
 ”میں باؤ کال کرنے کے باوجود عدیل نے فون نہیں اٹھایا۔“

”شاید میری قسمت ہی خراب ہے، زیور بک کر ہی رہے گا۔“ اس نے تھک کر فون ایک طرف ڈال دیا۔
 خواہ مخواہ ہی رچی بھر بھر آ رہا تھا۔

اس کی سانس بند نے کبھی اس سے محبت بھرا سلوک نہیں کیا۔ کبھی بشری کو دل سے قبول نہیں کیا۔ اگرچہ وہ خود عدیل کے لیے بیاہ کر لے کر لاتی تھیں مگر پھر بھی آج بشری کو ان دونوں کی وجہ سے اتنی بڑی قربانی دینا پڑی۔

وہ اتنی ہی بد لحاظ ہیں ان کے سامنے عدیل سارا زیور سمیٹ کر لے گیا پھر بھی کسی سے توفیق نہیں ہو سکی کہ آکر عدیل کو جوتی ہی کر دیں۔ اللہ ان ظالموں کو دکھا بھی رہا ہے۔ ان کے کرتوتوں کی سزا دے بھی رہا ہے پھر بھی یہ نہیں دیکھتا۔
 عدیل کے ساتھ بہت برا سوچتی چلی گئی۔



”زیربھائی! کیا یہ ممکن ہے؟“ عاصمہ کو اپنی ہی آواز کا پتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔
 ”ہاں! میں زیربھائی کے کچھ اور قریب ہو کر بیٹھ گیا۔“

”جی ہاں! اس دنیا میں سب ہی کچھ ممکن ہے بس جیب میں پیسہ ہونا چاہیے، ہر چیز مل سکتی ہے۔“ زیربھائی نے بولا۔
 ”زیربھائی! صرف چند سو لاکھ میں گھر۔ وہ بھی اپنا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا۔ آپ سچ کہہ رہے ہیں نا؟“ وہ

تسلی سے یقین سی ہو رہی تھی۔
 ”اصل میں بھابھی! وہ شخص گھر جلدی میں بیچ کر ملک سے باہر میٹل ہو رہا ہے۔ اسے منہ مانگے سے جتنے بھی کم

”میرا“ لیں گے وہ لے لے گا۔ یوں بھی گھر کوئی زیادہ بڑا نہیں۔ دو کمرے نیچے دو اوپر ہیں۔ ایک برآمدہ کچن اور کمرہ۔ یہ اتنا نیا بھی نہیں بنا ہوا علاقہ بھی بس گزارہ سمجھیں۔ مگر ان سب کا پس پوائنٹ یہی ہے کہ آپ کو اپنی قسمت مل جائے گی۔ بچوں کو ایک جگہ لے کر بیٹھ جائیں گی۔“

زیربھائی آہستہ نرمی سے سب بتانے لگا تو عاصمہ کی آنکھوں میں رے ہوئے آنسو بہ نکلے۔
 ”مما! یقین۔“ واٹن تو اب ہر لمحہ ماں کے چہرے پر نظریں جمائے رکھتا تھا۔ اسے روتے دیکھ کر آہستگی سے ماں سے بولا تو عدیل جلدی سے سنبھل گئی۔

”مگر ممما! ایک مسئلہ ہے؟“ زیربھائی کچھ دیر بعد بولا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔
 ”کیا وہ گھر نہیں نہیں مل سکتا؟“ پاس آئی خوشی ایک دم سے جیسے ہاتھ چھڑا کر دیور جا کھڑی ہوئی تھی۔
 ”عاصمہ کو ایسا ہی لگا۔ قسمت آج کل اس کے ساتھ ہی کھیل تو کھیل رہی تھی۔ ادھر خوشی محسوس کرتے وہ

”اللہ نہ کرے۔“ اس نے دہل کر اپنی ازیت تاک سوچ سے ہاتھ چھڑایا۔

”مگر آپ ساری رقم میں گھر خرید لیں گی تو پھر بعد میں کیا کریں گی۔ میرا مطلب ہے روزمرہ کے اخراجات بچوں کا اسکول ان کی تعلیم دوسرے بے شمار اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔“

زبیر رک رک کر بولا جیسے وہ خود ان مسلوں پر بہت دنوں سے سوچ رہا ہو۔

”اللہ بڑا کرم کرنے والا ہے زبیر بھائی! اس نے اتنی بڑی مشکل میں ڈالا ہے تو وہی ہمیں اس آزمائش سے نکالے گا۔“ اسے خود بھی پتا نہیں چلا کہ وہ اتنے مضبوط لہجے میں بات کرنے کے قابل ہوئی تھی اور بہت دنوں بعد ایسا ہو سکا تھا کہ ایک مکمل جملہ بولتے ہوئے نہ تو آنسو اس کے کبھے میں گھلے نہ آنکھ سے نکلے۔

”پھر بھی بھابھی! وہ متذبذب سا تھا۔“

”آپ کے ذہن میں کچھ ہے ایسا زبیر بھائی؟“ وہ الٹا اس سے پوچھنے لگی۔

”آپ کی کوالیفیکیشن کتنی ہے؟“ وہ سوچ کر بولا۔

عاصمہ لہجہ بھر کر کچھ بول نہیں سکی۔

”انٹرا! وہ اسپتالی سے یوں بولی جیسے اپنی کم تعلیم کو کوتاہی سمجھ کر چھپانا چاہ رہی ہو۔“

”چھوٹے بچوں کو تو پڑھایا سکتی ہیں نا؟“

عاصمہ فوری طور پر کچھ نہیں بول سکی۔

”ظاہر ہے اپنے بچوں کو بھی تو آپ خود ہی پڑھاتی ہوں گی۔“ وہ پھر سے بولا تو عاصمہ سر ہلا کر رہ گئی۔

”ستھس اور انگلش انہیں عقان پڑھا دیا کرتے تھے۔ سبانی سبجیکٹس میں دیکھ لیتی تھی۔“ وہ افسردگی سے بولی۔

”چلیں پھر تو کچھ ہو سکتا ہے۔ میرے ایک جاننے والے کا چھوٹا سا اسکول ہے۔ میں وہاں آپ کے لیے بات کر سکتا ہوں۔“ وہ رک کر بولا۔

”یہ تو بڑی اچھی بات ہو جائے گی۔ مگر نہیں زبیر بھائی! دورہ ابھی بہت چھوٹا ہے اسے چھوڑ کر۔“ وہ آگے سوچ سے پریشان ہو کر بولی۔

”وہ بھی دیکھ لیں گے۔ آپ ارادہ تو باندھیں۔ میں بات کر لیتا ہوں اپنے دوست سے تو آپ عدت کے بعد وہاں جوائن کر لیں۔“

”اور گھر کا۔“

”ہاں ایسا ہے کہ آپ آج۔ مگر آپ کیسے جائیں گی عدت کی وجہ سے۔ آپ گھر دیکھیں گی تو ہی۔“ عالمہ آگے بڑھے گا۔ ”وہ پریشان ہو کر بولا۔“

یہ بات تو عاصمہ نے بھی نہیں سوچی تھی۔

”چلیں میں پھر کسی عالم دین سے اس کی کوئی گنجائش پوچھتا ہوں کیونکہ وہ شخص گھر جلد سے جلد بیچنا چاہتا ہے۔ یہ نہ ہو کہ ہم زور دیر کریں اور اتنا اچھا موقع ہاتھ سے نکل جائے۔“

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد کھڑے ہو کر بولا۔

”اور اس گھر کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ اس کے اوپر والے پورشن کی سیڑھیاں بیرونی گیٹ سے ہیں یعنی اوپر والے پورشن آسانی سے کرائے پر دیا جا سکتا ہے۔ آپ کی آمدنی کا ذریعہ بھی بن جائے گا۔ میں اس لیے بھی یہ گھر لے سکتے نہیں دینا چاہتا۔“

عاصمہ اس شخص کے خلوص پر شکریہ بھی نہیں بول سکی۔ وہ جتنا بے لوث ہو کر اس کے کام آ رہا تھا، صرف شہرت سے اس کے احسانوں کا بدلہ نہیں چکایا جا سکتا تھا۔

”ارکے بھابھی! میں ان شاء اللہ کل آؤں گا تو پھر جو بھی صورت ہوگی اس کے مطابق دیکھ لیں گے۔“ وہ جاتے ہوئے بولا۔

”بھائی! مجھے آپ پر پورا اعتماد ہے۔ اگر میں گھر دیکھنے نہ جا سکی تو واثق آپ کے ساتھ چلا جائے گا۔ اگر نہ گھر بند آجاتا ہے تو آپ بے شک سودا کر لیجئے گا۔“ وہ اس کام میں مزید تاخیر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”واثق!“ زبیر نے کچھ حیرانی سے اسے دیکھا اور پھر ہنس پڑا۔

”ہاں بھئی۔ اب یہی تو اس گھر کا جوان ہے۔ اچھی بات ہے آپ ابھی سے اسے اتنا اعتماد دے رہی ہیں گڈ!“ وہ حاش سے واثق کے سر پر ہاتھ پھیر کر اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔

عاصمہ دونوں کو جاتا دیکھ کر بے اختیار عصفان کو سوچنے لگی۔

وہ بھی بالکل اسی طرح واثق کو ساتھ لگا کر باتیں کرتے ہوئے باہر لے کر جاتا تھا۔

”تو کھو تو بھی عاصمہ! واثق کا قدمیرے کندھوں کے برابر آ رہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے میرا بیٹا مجھ سے بھی اچھا قدم نکالے گا۔ میں اس دن کتنا خوش ہوں گا جب واثق مجھ سے اونچا ہو جائے گا۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتیں۔“

”ہاں عصفان! اب تو میں بالکل بھی اندازہ نہیں لگا سکتی۔ میں نے مستقبل کے لیے بھی اندازے لگانے چھوڑ دیے ہیں۔ ہمارے اندازے ہمارے ارادے ہماری خواہش ہمارے خواب کتنے بوڑھے کتنے کمزور ہوتے ہیں۔“

اس بات کا اندازہ مجھ سے بڑھ کر اور کون لگا سکتا ہے؟“ وہ افسردہ ہو گئی۔

”کن سترہ تاریخ ہے۔“ اسے ایک دم سے خیال آیا۔ ”زبیر بھائی تو کہہ رہے تھے کہ وہ دس تاریخ کو جا رہے ہیں۔ میں گیارہ کو اسے شہر میں جا کر آؤں میں جو آٹنگ دینی ہے تو پھر۔ اتنے دن اور ہو گئے مجھے بھی خیال نہیں آیا۔“

”نہیں نے پوچھا۔ شاید بے چارے ہماری وجہ سے رک گئے ہیں۔ اللہ کرے وہ اب بھی نہ جائیں۔“ اس نے گھر دلا کر ہی عاصمہ سے ورنہ میں اکیلی عورت کیا کر سکتوں گی۔ میرا تو ان کے سوا کوئی سہارا بھی نہیں۔“ بے خیالی میں وہ بہت غلط بات سوچ گئی تھی جس کا اندازہ اسے خود بھی نہ ہو سکا تھا ورنہ وہ کم از کم توبہ تو کر لیتی کہ اس نے کتنی بڑی بات سوچی ہے۔

وہ آٹنگ کرکچن میں چلی گئی۔ ابھی رات کے لیے کھانا بھی بنانا تھا۔

”سارا کیا دھرا تمہاری ساس کا ہے۔ وہ چاہتی ہی نہیں کہ میری بیٹی کا سلسلہ کسی اچھی جگہ ہو جائے۔“ نسیم نے کڑے لہجے میں چلائی۔

”بھئی! نے طیش کی اٹھتی لہر بمشکل دہائی تھی۔“

”بھئی! اچھی جگہ آپ کر رہی ہیں فوزیہ کا اس سے تو میرے خیال میں کوئی احمق ہی جلے گا۔“ عدیل بھٹی کے ہنسنے سے توبے خبر تھا مگر اس کے غصے کی ترجمانی ضرور کر گیا۔

”اور میں تو اس دن کو رو رہا ہوں جب ہم ان لاپچی حریص کتوں میں پھنسے جنہیں صرف بڑی نہیں پورا بکرا کر سکتے۔ سارے گھر کا زیور امی! شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ میں نے کبھی آپ کے بھٹی کے زیور کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا اور آج ان ذلیل لوگوں کے لیے مجھے جا کر سارا زیور بیچنا پڑا اور معلوم ہے آپ کو کیا

فصل بولتے ہوئے وہ سیل برزادہ کا نمبر ملانے لگا۔

تم ٹھہراؤ۔ رکو! میں خوب بات کرتی ہوں۔ آرام نکل سے۔ جب اتنی تکلیف اٹھائی تو پھر یوں عجلت میں بات کرنے کا فائدہ۔ تم نماز صحر کرنا مزم دم ہو۔ میں اتنے میں فون کر لیتی ہوں۔ تم ٹھیک کہتے ہو اب تو انہیں ہٹ کر دیکھو۔ میں رکھانی چاہیے۔ جاؤ میرا بیٹا شاہنشاہ۔ فوزیہ! اٹھ بھائی کے لیے چائے بنا کر لا۔" نسیم عدیل کو پیار سے کہنے لگے بولیں تو اس نے بھی مزید اصرار نہیں کیا۔ یوں بھی وہ زائدہ جیسی لالچی حرص اور گھٹیا عورت سے بات کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

اسی رقم کا انتظام ہو جانے کے بعد بھی اس کا دل ان لوگوں کی طرف سے بہت کھٹا ہو گیا تھا۔

یہ رشتہ دار تو نہ ہونے کی تو قصائی ہوئے چھری پھیرنے والے۔" وہ جھنجلا کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

نسیم نے سوچ سوچ کر زائدہ کا نمبر ملا ہی لیا۔

"اللہ! اس عورت کے دل میں رحم ڈال دے۔" وہ فون کان سے لگائے دعائے مانگنے لگیں جس کے قبول ہونے کی امید اس میں بھی کم ہی تھی۔



شام کے پانچ بج رہے تھے جب وہ تھکا ہارا کمرے میں داخل ہوا۔ کیلنڈر پر سولہ تاریخ سنہ رنگ میں مسکرا رہی تھی۔

اس کی ساری جھکن جیسے اڑن چھو ہو گئی۔

اس نے بچتے بچتے بھی نہیں اتارے اور تیزی سے آگے بڑھ کر کھڑکی کھول دی اور جیسے ساری کائنات کی گردش ایک دم سے ختم ہو گئی۔

وہ مانتے ہی تو بیٹھی تھی۔

سرخی لباس میں سرمئی اڑتے بادلوں کے ٹکڑوں کے درمیان اسی منظر کا کوئی حصہ بنے ارد گرد سے بے خبر، کسی گہری سوچ میں گم اس کے سیاہ بالوں کی آوارہ لٹیں ادھر ادھر ہوا سے سرگوشیاں کر رہی تھیں مگر وہ تو کسی پتھر کے پختے کی طرح یوں ساکت بیٹھی تھی جیسے اب صدیوں تک ٹپل نہیں سکے گی۔

لیکن نہیں۔ وہ جانتا تھا وہ یہاں صرف سترہ منٹ کے لیے بیٹھی تھی۔

کس طرح کی تھی۔

اس احساس نے اس کے اندر بجلی سی بھروی۔

تو جتنے جلدی سے اپنے ٹیبل سے اسکیچ پیپر اور پنسل اٹھائی اور پورے انہماک سے اس منظر میں کھوئی اس اطمینان اور کی کا اسکیچ بنانے لگا۔

کرتی بادل اور گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

اس کا حسین چہرہ کچھ دھندلا جا رہا تھا۔ وہ تیزی سے ہاتھ چلانے میں لگن تھا۔

اس نے سراٹھایا اور سنانے میں رہ گیا۔

وہ خوب صورت شام ایک دم سے ویران ہو گئی تھی۔ اس کی بوئیس جا چکی تھی۔ ہمیشہ ایسے ہی ہوتا تھا۔ وہ اسکیچ بنانے میں لگن ہوتا تھا۔ اسے پتا بھی نہیں چلتا تھا کہ وہ خاموشی سے اٹھ کر چلی جاتی تھی۔

خوب صورت شام سرمئی اندے بادلوں کے ٹکڑے اور مست ہوا کے جھونکے سب بے معنی سے ہو کر رہ گئی۔

مل رہا ہے سارے زیورات کا؟" عدیل بہت غصے میں تھا۔ آج اسے فوزیہ کی روتی صورت پر ترس آ رہا تھا۔ اس کے واویلے پے۔

عدیل کے اتنا اونچا بولنے پر نسیم بیگم ایک دم سے چہرے پہ ڈھیر ساری مظلومیت لیے یوں جیٹھ گئیں جیسے ہمیشہ سے بیٹے کا غصہ سستی آئی ہے۔

ساڑھے بارہ لاکھ۔ تین لاکھ ادھر ادھر سے مانگ کر کیا ہے۔ اب بتائیں۔ باقی کے ساڑھے چار لاکھ کہاں سے پورے کر لیں۔" عدیل کا غصہ کوفت، جھنجلاہٹ سب عروج پہ تھے۔

"کس ٹھگ سار کے پاس چلے گئے تھے تم؟" نسیم بیگم اپنی فطرت سے مجبور تھیں بولنے سے رو نہ سکیں۔ عدیل نے تیز نظروں سے ماں کو دیکھا۔

"وہی تو میں کہہ رہی ہوں اگر ذکیہ بہن کسی طرح تین چار لاکھ کا انتظام کر دیتیں تو ہمیں اتنی پریشانی تو نہ اڑنی پڑتی۔" وہ ایک دم یوں نرم اور التجائیہ لہجے میں بولیں جیسے بہت اچھے مراسم ہوں ان کے ذکیہ بہن کے ساتھ۔

"امی! خدا نخواستہ اگر ذکیہ آنٹی پر ایسا وقت آیا تو کیا آپ دے دیتیں انہیں چار لاکھ۔ آسانی سے۔" عدیل نے غصہ ٹھنڈا ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

"عدیل! اس وقت فضول مثالوں اور مفروضوں سے کچھ نہیں ہونے والا۔ تم خود بھی پریشان ہو رہے ہو اور مجھے بھی کر رہے ہو۔" نسیم بیگم نے فضول کے مفروضے پر یوں ہاتھ ہلایا جیسے کبھی کان سے ہٹائی ہو۔

"ہاں مجھے تو کالے کتے نے کاٹا ہے نا جو خونا خنجر پریشان ہو رہا ہوں۔" وہ بھی آج کوئی ادھار رکھنے پر تیار نہیں تھا۔

"اب کرنا کیا ہے؟" نسیم بیگم اسے پشیمانی سے لالنے کے لیے آج ہر ممکن جتن کرنے پر تیار تھیں۔

"یہ بھی آپ مجھ سے پوچھ رہی ہیں کہ کرنا کیا ہے۔" وہ کٹیلتے لہجے میں بولا۔

دونوں کے مباحثے کے درمیان فوزیہ کو نے میں یوں سمٹی بیٹھی تھی جیسے اسے اس مناظرے میں جج مقرر کیا گیا ہو۔ آخری فیصلہ بہر حال اسے ہی سنانا ہو گا۔ یا قسمت اسے سنائے۔ آنکھیں بھر بھر آ رہی تھیں جنہیں وہ بار بار مسل رہی تھی۔ آج کل سارا طمطراق چالاکا ہوشیاری، فتنہ بروری سب اڑن چھو ہو چکے تھے۔ بس ایک خوف کا عالم تھا۔ ایک تلوار سی سربر لگی تھی دن رات کہ اب سر پر گری کہ تب اسے زندگی میں پہلی بار پتا چلا تھا۔

آنکھوں میں رات کا ٹٹا کے کہتے ہیں۔ دکھ، کرب، ذلت، رسوائی، جگ ہنسانی کون سا تکلیف دہ احساس نہیں تھا۔ اسے رات بھر کو نہیں لینے۔ مجبور نہیں کرنا تھا۔

ان دور و بھرے لمحوں میں بھی اسے خیال تھا تو صرف اپنا اپنی ذلت رسوائی اور خدا نخواستہ گھر بٹھ جانے کا خوف۔ بھائی کی ذہنی تکلیف اور پریشانی کا اسے ایک بار بھی بھولنے سے خیال نہیں آیا تھا۔ ہاں یہ احساس ذلت گزارنے کے ساتھ ساتھ غصے میں بدلتا جا رہا تھا کہ بھائی جان بوجھ کر رقم اکٹھی کرنے میں دیر کر رہا ہے اور یہ سب بشری کی سازش ہے۔

"ان لوگوں کو صاف بتادیں کہ ہم پندرہ لاکھ سے زیادہ کا انتظام نہیں کر سکے۔ ویش آل۔" عدیل بے لگنے میں ماں سے بولا۔

"پندرہ لاکھ۔" نسیم کی آواز گلے میں ہی گھٹ گئی۔

"امی! کیا! ہم ان کے قرض دار ہیں؟ بس بہت ہو گیا۔ اتنا ڈر خوف جیسے وہ ہمیں پھاڑ کھا میں گے۔ میں انہیں فون کرتا ہوں کہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ میں آپ کو صاف بتا رہا ہوں۔ میں انہیں کسی کے آگے جھولی نہیں پھیلاؤں گا۔"

اس کے ہاتھ یوں ست پڑے کہ بالآخر اس نے پھیل اسٹیج پر ہی رکھ دی۔

”یہ کیا ہے؟“ وہ ہر بار اپنی اس دیوانگی کے بارے میں سوال ضرور کرتا تھا اور ہر بار اسے کوئی جواب نہیں دیتا تھا۔

”مجھے اس سے ملنا چاہیے۔“ اس کے دل نے مچل کر کہا۔

”کیا کروں گا مل کر۔ وہ میرے پاس ہی ہے۔ استنپاس کس۔“ وہ مسکرا کر گود میں پڑے اس کے اسٹیج کو دیکھنے لگا۔ سیاہ بالوں کی لٹوں میں چھپا چاند سا چہرہ۔

اس کی ساری تھکاوٹ ختم ہو چکی تھی۔ وہ بے خود سا کسی اور ہی دنیا میں تھا۔



”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں خالہ جان! عاصمہ حیران سی انہیں دیکھے گئی۔

”بیٹا! تم سمجھ دار ہو پھر بہت اچھے خاندان کی۔ فاروق بھائی کی شرافت اور نیکی کی تو لوگ مثالیں دیتے ہیں۔ ان کا بیٹا عفان سمجھو ہماری گودوں میں کھیل کر بڑا ہوا۔ اتنا شریف، نیک، محبت کرنے والا، ہمدرد انسان میرا جی نہیں چاہا کہ اوہرا دھر سے تم کوئی الٹی سیدھی بات سنو۔ تمہارا دل تو یوں بھی آج کل درد کا پھپھولا بنا ہو گا۔ ذرا سی بات پر پھوٹ پڑے گا۔“ وہ زمانے بھر کی ہمدردی اور احساس اپنے منتخب کردہ جملوں میں سمو کر بول رہی تھیں۔

مگر عاصمہ کو ان کا ایک ایک جملہ جیسے چبھ رہا تھا۔ وہ بس ایک ٹک انہیں دیکھتی جا رہی تھی جیسے فاروق اور عفان کی شرارت و نیکی کی مثال دے کر اسے بہت کچھ سمجھا جا رہا ہے کہ وہ ان کی اتنی قریبی ہوتے ہوئے بھی ان دونوں جیسی نہیں۔

عاصمہ کے اندر جیسے ابال سے اٹھنے لگے۔

”تم عدت میں ہو پھر خیر سے جوان ہو گون سی کوئی بوڑھی یا عمر رسیدہ ہو۔ ایسے میں تو ارد گرد والے کھلے والے اور بھی آنکھیں کان کھلے رکھتے ہیں۔“ وہ اب اس بات کی طرف آ رہی تھیں مگر عاصمہ کے صبر کا پیمانہ جیسے لبریز ہو چلا تھا۔

”آپ بتائیں گی خالہ! آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟“ وہ ضبط کر کے بول ہی اٹھی۔

”میری بیٹی کی طرح ہو تم پھر برسوں کا ساتھ ہے۔ تم پہ کوئی انگلی اٹھائے یا کچھ ایسا دیا کہے تو مجھے اچھا تو نہیں لگے گا؟“ وہ پھر بھی تمہید باندھے جا رہی تھیں۔

”لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں خالہ جان!“ وہ تحمل سے بولی کیونکہ وہ جانتی تھی اب آئندہ کی زندگی میں اس کا بہ تحمل اور لوگوں کی باتیں ساتھ ساتھ چلیں گی۔

”وہ آدمی لاکھ عفان کے ساتھ دفتر میں کام کرنے والا ہو لاکھ وہ تمہارے مرحوم شوہر اور سر کے دفتری معاملات کو دیکھنے والا ہو مگر میری بیٹی! وہ جوان جہان ہے۔ اس کا تمہارے گھریوں بار بار آنا اور گھنٹوں بیٹھے رہنا۔ اب تو یوں سمجھو کم از کم عدت تک سب کی نظریں تمہاری چوکھٹ سے لگی ہیں۔ کچھ تو اس خیال سے نہ جانے تم کب کس ضرورت کے تحت کسی کو آواز دے لو اور کچھ کی اس نیت سے دیکھیں تو مرحوم عفان کی بیوہ خود کو کیسے سنبھالتی ہے۔“ وہ رک رک کر اسے صاف لفظوں میں بہت کچھ سمجھا گئیں۔

”سمجھ رہی ہوں عاصمہ بیٹی! میری بات؟“ وہ اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگیں۔

”تو کون کرے یہ سارے کام خالہ! مجھے اتنا بھی سمجھا دیں۔“

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی لمبے کو غم ہونے سے نہ بچا سکی۔

وہ بھلے بھلے کرے مگر اسے دروازے کے باہر تک رکھو یا زیادہ سے زیادہ صحن میں بٹھالو۔ پھر یوں بھی تم کرائے کے گز میں رہتی ہو۔ نظر رکھنے کو مالک مکان ہی بہت ہے۔“ وہ پھر سے اسے جتا گئیں۔

”میں ایسا کچھ غلط نہیں کر رہی اور میں جو کچھ کر رہی ہوں۔ مجھے اس کا احساس بھی ہے اور خیال بھی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رنج ہی ہو گئی۔

”بھئی! تمہارا جی دکھانا نہیں تھا۔“ وہ اس کی تلخی پر بولیں۔ ”آگے تم خود سمجھ دار ہو بال بچے والی ہو۔ ابھی سے کسی کو موقع نہیں دو گی تو کسی کی جرات نہیں ہو سکے گی کہ خواہ مخواہ تم پر انگلی اٹھا سکے۔“ وہ جانے اسے کیا سمجھانا چاہ رہی تھیں۔

”خالہ جان! میں اکیلی نہیں ہوتی۔ میرا بیٹا میرے ساتھ ہوتا ہے۔“ حیدرہ کو شاید اس کے منہ سے ایسی بچکانہ بات کی توقع نہیں تھی پھر بھی انہوں نے حتمایا نہیں۔

”اللہ اسے تمہارے ساتھ رکھے۔ تمہارا سہارا بنائے۔ بہر حال میں تمہیں سمجھانے آئی تھی۔ اگر وہ عفان کا بہت بھی ہے تو ظاہر ہے شادی شدہ بال بچے والا بھی ہو گا۔ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر آیا کرے اتنا ضروری کام بنانا ہے تو پھر بھلا کون بات کرے گا۔ تم سمجھ رہی ہوں؟“

وہ سر بھی نہ ہلا سکی۔ اب وہ یہ بات زیر سے تو نہیں کہہ سکتی تھی۔



”یہ لہیہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“ بشری کچھ بوکھلا سی گئی۔ نسیم بیگم جواب میں ایک دم سے رونے لگیں۔

بشری پریشان ہو کر سانس کو دیکھنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ انہیں کیسے چپ کرائے۔

”ای۔ پلیز یوں نہیں رو میں۔ کیا ہوا ہے۔ مجھے بتائیں۔“ وہ نرمی سے انہیں اپنے ساتھ لگا کر بولی۔

نسیم بیگم نے ایک دم سے بشری کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ ششدر رہ گئی۔ ایسا تو اس نے کبھی سوچا تھا۔

”ای پلیز یوں مجھے گناہ گار تو نہیں کریں۔ پلیز آپ خود کو سنبھالیں۔“ اس نے اٹھ کر انہیں پانی کا گلاس نکھایا۔

یو گھونٹ پانی لی کر نسیم بیگم کا جی کچھ سنبھلا۔

”تم اپنی ماں کی منت کرو۔ کسی بھی طرح سے وہ تین لاکھ کا انتظام کر دیں۔ دو لاکھ میں خود کر لوں گی۔ ان کا یہ جہان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ تم بات کرو اپنی ماں سے عمران بیٹے سے۔“ وہ تلخی لہجے میں کہہ رہی تھیں

جس میں کچھ بھی بناوٹ ڈرا مایا دوغلا پن نہیں تھا۔ صرف ایک ماں کی التجا اس کی پریشانی تھی کہ کسی طرح ادھ بیانی بھی بیاہ کر اپنے گھر چلی جائے نہ کہ گھر بیٹھے اسے کسی طرح کا دل لگ جائے۔ بشری کو ان پر بہت ترس آیا۔

”اچھا آپ پریشان نہیں ہوں۔ میں ابھی ای سے بات کرتی ہوں۔ خود عمران کی منت کروں گی۔ وہ کہیں سے بھی مجھے کچھ مہینوں کے ادھار پر رقم لا دے۔ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی مت رو میں اس طرح۔ میں بات کرتی ہوں۔“ بشری کو پہلی بار نسیم بیگم اپنی ماں کی طرح لگی تھیں۔ ایک دکھی ماں جو اس کے آگے رو رہی تھی۔

بشری کا دل پتھر بن گیا۔

”اس گھنیا عورت نے صاف انکار کر دیا ہے کہ وہ بندہ لاکھ نہیں لیں گے۔ اب بتاؤ میں عدل سے یہ بات کر سکتی ہوں۔ تب ہی تو عدل سے بہانہ کر دیا کہ وہ گھر پر نہیں تھی تو میری بات نہیں ہو سکی مگر ظاہر ہے میں اسے چھپا کر لے سکتی۔“ وہ اپنی پریشانی کی وجہ بتانے لگیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی ویب سائٹ

یہ تمامہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کے پیش کیا ہے

مہمان کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایپلوڈنگ
- ☆ بریم کوالٹی، نادل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو امیل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر پریو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ایب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہیری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”بھئی! وہ آہستگی سے بولی۔“

”سب سمجھ رہی ہوں بیٹی! یہ بہت بڑا جوا ہے۔ اندھا کتواں سے جس میں فوزیہ کو دھکا دینے جا رہی ہوں گے۔ دل پر ہاتھ رکھ کر کہو اگر اللہ نہ کرے میری بچی پر گھر بیٹھے طلاق کا ٹکڑا لگ گیا تو کیا ہو گا۔ بس یہی خیال مجھے دکھائے دے رہا ہے ورنہ میں ایسے لوگوں کے سامنے جھکتی منت کرتی، کبھی نہیں۔ یہ تو میری مجبوری مجھے نہ مانا کرتے لے آئی کہ اب پیچھے کتواں ہے اور آگے کھائی۔“

”اب تو صرف اللہ عزت رکھنے والا ہے۔“ بشری انہیں دیکھتی رہ گئی۔

”بھائی! میں شام میں آؤں گا۔ میری ایک مفتی صاحب سے بات ہو گئی تھی عدت میں گھر سے نکلنے کے مسئلے میں۔“ وہ پریشان سی بیٹھی تھی۔ خالہ حمیدہ کی باتوں پر اسے یوں لگ رہا تھا جیسے سب کی نظریں اس پر جمی ہیں۔ وہ آج سارا دن دردناکے میں بھی نہیں گئی تھی مگر پھر بھی عجیب سا احساس تھا۔ اس نے دن بھر چادر یوں لپیٹے ہوئے جیسے بازار جا رہی ہو۔

”جی! وہ آہستگی سے بولی۔“

”آپ انتہائی ضروری کام سے اچھی طرح پردہ کر کے نکل سکتی ہیں۔“ وہ رک کر بولا۔

”اب کچھ مٹی گھر بہت اچھا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہاتھ سے نکل جائے۔ آپ ایک نظر دیکھ لیں گی تو پھر پتائی کے کام میں خود ہی پتائیوں گا۔“ اس کے لہجے میں کچھ بھی ایسا نہیں تھا جسے عاصمہ پکڑتی یا وہ اسے بد نیت لگتا۔

”سب حمیدہ خالہ کے ذہن کا فتور ہے۔ خود تو جسکے لینے کے لیے گھر گھر بھرتی رہتی تھیں۔ دوسروں پر انکی انگلیاں ان کا مشغلہ ہے۔“ اسے حمیدہ خالہ پر جی بھر کر غصہ آیا۔

”میں شام میں گاڑی لے آؤں گا۔ آپ واثق کو بھی تیار رکھیے گا۔ ہمارے ساتھ جائے گا۔ بہت سمجھ دار میرا ہے آپ کا۔“ اس کے دل میں کوئی کھوٹ ہوتا تو وہ ایسا کیوں کہتا۔

”بھائی! بھائی! کو بھی لے آئے گا آپ۔ وہ بھی گھر دیکھ لیں گی تو دور رائے ہو جائیں گی۔“ اس نے کچھ جھجک کر اصل بات کہہ ہی دی۔

وہ سب تو بچھلے مینے جا چکے ہیں گھر۔ میں صرف آپ کے کاموں کی وجہ سے رکا ہوا تھا۔ آفس سے بھی میں نے آف لے لی ہے۔ بس یہ گھر والا معاملہ مٹ جائے پھر میں چلا جاؤں گا۔“ وہ بتا رہا تھا اور عاصمہ جی میں خوب شرمندہ ہو رہی تھی۔ کیسے اچھے انسان پر وہ شک کرنے جا رہی تھی۔ اس نے خود کو تازا۔

”اوسکے بھائی! میں شام میں آؤں گا۔ آپ کو کچھ منگوانا تو نہیں۔“

”نہیں بھائی! ایسا کچھ نہیں منگوانا۔ آپ کا بہت شکریہ۔“ اس نے نرمی سے کہہ کر فون بند کر دیا۔

واثق اسکول سے آیا تو تیز بخار میں پھنک رہا تھا۔ عاصمہ کے تو ہاتھ پیر پھول گئے۔ اسے جلدی سے یونیفارم تبدیل کروا کے تھوڑا سا دودھ دیا اور بخار کی دوائی دے کر سلا دیا۔

”اگر شام کو اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا پڑ گیا تو؟“ وہ اسے سلاتے ہوئے سوچنے لگی۔

یوں بھی شام تو ہو ہی چلی تھی۔ چھ بجنے کو تھے۔ زیر نے چھ سات کے درمیان آنا تھا۔

”واثق کیسے جائے گا میرے ساتھ۔“ وہ بے چین سی ہو گئی۔

جلدی سے اریبہ کو خالہ حمیدہ کو بلانے بھیج دیا۔

”ان ہی کو ساتھ لے جاؤں گی۔ یہ ٹھیک رہے گا۔“ وہ سارہ سے کپڑے پہنے بڑی سی چادر اوڑھے جا رہی تھی۔

”مما! وہ آئی کہہ رہی ہیں۔ خالہ اپنی بیٹی کی طرف مٹی ہیں۔ کل آئیں گی۔“ سارہ نے آکر بتایا تو وہ حیران پریشان ہو گئی۔

”اب کیا کروں گی۔ رات ہونے کو ہے۔ اکیلی میں نہیں جاؤں گی مگر واثق کو بھی نہیں لے جاسکتی۔“ وہ چہین سی ادھر ادھر ٹھکے جا رہی تھی۔

سازھے سات ہونے والے تھے۔
ہو سکتا ہے زیر بھائی کا ارادہ بدل گیا ہو۔“ وہ خود ہی کچھ مطمئن سی ہو گئی۔ ”اگر ابھی گئے تو میں فی الحال صبح دوں گی۔ کل چلی جاؤں گی واثق اور حمیدہ خالہ کو لے کر۔“

وہ سوچ رہی تھی کہ باہر گاڑی کا پارن بجا۔
وہ وہیں ٹھک کر رک گئی۔ ”اب کیا بہانہ کروں؟“

”بھابھی! آپ سارہ کو لے چلیں ساتھ پلینز تھوڑی دور کا کام ہے آپ نے گھر ہی دکھنا ہے۔ میں بھی دو تین ضروری کاموں میں پھنس گیا نکلتے نکلتے اتنا ٹائم ہو گیا دیکھیں اب پلینز اس کام کو اور ڈیلے نہیں کریں۔ میں آئس سے مراد چھٹی نہیں لے سکتا۔“

ساتھ والی ہمسائی کو بچوں کا خیال رکھنے کا کہہ کر وہ سارہ کا ہاتھ پکڑ کر پھیلی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئی۔ گاڑی روانہ ہو گئی۔



”ای! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ بشری کو دھچکا سا لگا۔
”جو میں تم سے کہہ رہی ہوں تم صرف وہ کرو۔“ وہ اس کی حیرانی کی پروا کیے بغیر بولیں۔

”ای! آپ جانتی ہیں اس وقت میرے گھر میں کیا چل رہا ہے۔“ وہ احساس دلانے کو بولی۔
”کون سی نئی بات ہے۔ کان پک گئے ہیں یہ سن سن کر اور تم سے میں نے کہا بھی تھا کہ مثال کو لے کر میری طرف آ جاؤ۔ وہاں تم صرف ٹینشن کھاؤ گی۔ جو تمہارے لیے بھی نقصان دہ ہے اور تمہارے ہونے والے بچے کے لیے بھی۔ تمہیں یہ بات کیوں سمجھ میں نہیں آ رہی۔“

”اچھا ای! آپ صرف مجھے یہ بتائیں آپ مجھے رقم کا بندوبست کر کے دے رہی ہیں یا نہیں؟“ وہاں کی بھاری سے زچ آ کر بولی۔

”نہیں۔ کیونکہ میں تمہاری طرح بے وقوف نہیں ہوں۔“ ذکیہ دو ٹوک لہجے میں بولیں تو بشری کچھ دیر بولنا ہی نہ سکی۔

”میری گارنٹی پر بھی نہیں جبکہ میں جانتی ہوں آپ کی پاس۔“ بشری نرم لہجے میں ہاں سے کہنے لگی۔
”تم جو بھی کہو۔ نہ میرے پاس اتنی رقم ہے نہ میں تمہیں دوں گی۔ مگر ہے تم خود بھی جتنا بے وقوف بن چکی

اپنا سارا زور لٹا کر اس کو کافی مجھو اور ہاں! میری یہ بات لکھ لو جس چکر میں یہ ماں بیٹا سب کچھ داؤ پر لگا رہے ہیں وہ کام پھر بھی نہیں ہوتا۔“ ذکیہ باوثوق لہجے میں بولیں۔ بشری نے اکتا کر فون بند کر دیا۔

اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے ماں کے مشورے پہ کان دھرے یا ساس کی التجاؤں پہ۔
اس نے کچھ سوچ کر عمران کو فون کیا۔ شاید ذکیہ اور عمران میں پہلے ہی اس سلسلے میں ساری بات چیت ہو گئی تھی۔ تب ہی اس نے صاف کہہ دیا کہ اس نے کسی دوست کو ادھار دیے تھے وہ اب ملک سے باہر چلا گیا ہے۔

اس نے تھک کر پھر فون بند کر دیا۔
”اگر ای کی بات درست نکلی۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی وہ لوگ فوزیہ کو رخصت کرانے پر آمادہ نہ ہونے

وہ بھی سوچ میں پڑ گئی۔
”یہ عدیل کہاں ہیں۔“ اسے بہت دیر بعد خیال آیا تو فون کرنے لگی۔
”میں گھر ہی آ رہا ہوں۔ اگر بات کرنا ہوں۔“ عدیل نے کہہ کر فون بند کر لیا۔

”پتا نہیں اب یہ کیا بات کریں گے مجھ سے۔“ وہ پریشان ہو گئی۔



”نہیں ای! وہ لوگ نہیں مان رہے۔ ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے ماں بیٹے کہ بیس لاکھ ملیں گے تو ہی ان کا کام ہو گا۔ میں نے جب زیادہ کہا تو کہنے لگے۔ پھر دو ماہ بعد کے لیے پانچ لاکھ کا چیک لکھ دوں۔ دو ماہ بعد وہ کیش ہو جائے گا تو شادی کی تاریخ رکھ دیں گے۔ عجیب کاروباری سائنڈ از تھا ان کا۔ سچ ای! ہم فوزیہ کو بہت غلط جگہ بھیج رہے ہیں۔ یہ بات لکھ لیں آپ۔“ وہ سخت آکٹا ہٹ کا شکار تھا۔ تھکن اس کے چہرے سے جھٹک رہی تھی۔

”پھر کیا کہہ کر آئے ہو تم ان سے؟“ نسیم بیگم بھی کچھ مایوس سی ہو گئی تھیں۔ بہت دیر بعد بولیں۔
”یہی کہ ہمارے پاس صرف یہ پندرہ لاکھ ہیں اس سے اوپر ایک پانی نہیں۔ آگے ان سے جو ہوتا ہے کر لیں۔“

”عدیل! نسیم تشویش سے بولیں۔“

”ای! آپ فکر نہیں کریں ذکیہ یہی پندرہ لاکھ لینے کیسے آئیں گے کل صبح سے پہلے یہ لالچی لوگ۔ میں اب کچھ دیر آرام کروں گا۔ بہت تھک گیا ہوں۔“ وہ اٹھ کر جانے لگا۔

”تم کہو تو میں بات کروں زاہدہ سے۔“ نسیم بیگم آخری امید کے طور پر بولیں۔
”خبردار ای! آپ نے اب ادھر زرا بھی فون کیا۔ ان کا دماغ تو پہلے ہی بہت خراب ہے اور سر پہ چڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اب جو ہو گا دکھ جائے گا۔“ وہ جاتے ہوئے سخت لہجے میں ہاں کو تاکید کر گیا۔

نسیم بیگم جواب میں کچھ بول ہی نہ سکیں۔ آج تو فوزیہ بھی بہت مایوس بہت مرصحاٹی ہوئی لگ رہی تھی۔
دونوں پاس بیٹھی تھیں اور چپ تھیں کوئی تیسرا دکھتا تو یقین نہ کرنا کر کیا کیا جائے کہ وقت سدا ایک سا نہیں

رہتا۔ اس وقت نسیم بیگم پر بھی بڑا بھاری وقت پڑا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



والتی ہمارا گزارہ کیسے ہوگا۔ ہم کیا کریں گے بیٹا؟ وہ پھر سے رونے لگی تھی۔
 ”مما! انکل زبیر آ رہے ناشام میں آج۔ انہوں نے بابا کے آفس میں بات کی ہوگی تو کچھ نہ کچھ تو توں
 ملے گا۔“ وہ اب ہر معاملے میں ماں کے ساتھ ساتھ تھا۔
 ”دکھتا ہوگا۔ مستقل تو کچھ بھی نہیں بنا۔“ وہ بہت پریشان تھی۔ اس کی راتوں کی نیند غارت ہو چکی تھی۔
 کا خواب بھی بکھر چکا تھا۔ اب روز مرہ کے اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔ بچوں کے اسکول کے ڈیوڑھوں
 اور دوسری ضروریات۔ سوچ سوچ کر اس کا داغ شل ہوا جا رہا تھا۔ پھر کچھ خیال آنے پر اس نے اپنا جیولری
 نکالا۔

زیور کے نام پر ایک سیٹ اور چار جوڑیاں ہی تو تھیں۔ اس کے علاوہ والتی کی چھوٹی سی انگوٹھی ایک
 انگوٹھی اور اربہ کی چھوٹی سی چین۔ وہ ایک ایک چیز کو جیسے تول رہی تھی۔
 ”نی الحال یہ جو رقم ہے۔ اس سے کچھ ضروری سامان منگوا لیں۔ باقی چیزیں بعد میں دیکھ لیں گے۔“ والتی
 نے ماں کے ہاتھ میں پکڑے سترہ ہزار کی طرف اشارہ کیا۔
 ”ہاں تمہارے دادا کے گریجویٹ فنڈ میں سے دیکھو ہمیں کیا کچھ ملتا ہے۔ ویسے اب وہ لوگ کسی قسم کی کموال
 نہیں کریں گے لیکن پھر بھی وقت تو جیسے کوئی انتقام لینے کھڑا ہے۔“ وہ بہت تھک سی گئی تھی۔ چند دنوں میں وہ جیسے
 کئی سال آگے چلی گئی تھی۔ اس کا چند دن کا اکیلے رہنے کا تجربہ آئندہ کی پوری زندگی کے لیے نقد برین گیا تھا۔
 اب والتی کی یاد دہانی کے بغیر بھی وہ رات کو سونے سے پہلے سارے گھر کی کھڑکیاں دروازے سب چیک کرتی
 رات کو اٹھ کر بچوں کو دیکھتی۔ میٹرھیاں چڑھ کر چھت کا دروازہ دیکھتی۔ دن بھر بچوں کو گھر سے باہر نہ نکلنے دیتی
 اگر وہ کہیں دور نکل گئے تو کون ان کو ڈھونڈنے جائے گا۔

سعودی عرب سے اس کے بھائی کا فون آ گیا تھا۔ اسے عاصمہ کے ساتھ بیت جانے والے سانحے کا بے حد دکھ
 تھا۔ مگر وہ ابھی آ نہیں سکتا تھا۔ سو تین مہینوں بعد چکر لگانے کا کہہ رہا تھا۔ عاصمہ کیا کہتی۔ اب تو اس کا جیسے بالکل
 زور ہی نہیں رہا تھا۔ اس نے اللہ حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔
 مالک مکان نے کیم تاریخ آجانے کے باوجود ابھی کرایہ نہیں مانگا تھا لیکن ظاہر ہے وہ ہمیشہ تو خاموش نہیں رہے
 گا۔

چند دن پہلے یہ سب کچھ کتنا مختلف تھا۔ پہلے تو صرف دونوں کی تنخواہوں میں مہینے بھر کے اخراجات اچھا
 کرنے کی فکر ہوتی تھی اور اب یہ پریشانی ہے کہ آمدنی کے نام پر کیس سے بھی کیا آئے گا کیسے آئے گا اور اب
 چھتھب اکیلی عورت اتنے چھوٹے بچوں کے ساتھ اس معاشرے میں کیسے رہتی ہے۔ عاصمہ کو اندازہ ہی نہیں
 تھا۔

بڑے بڑے سوال جیسے محوتین کر اسے ڈرو لے لگے تھے۔
 وہ اندر ہی اندر سسکتی جا رہی تھی۔



”کیا لہیہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔“ عدیل نے ابھی آفس کا ایک کھمبے سے اتار کر کھڑکی میں تھکا کر
 بیٹھنے کی بات سن کر وہ بیٹھتے بیٹھتے بکھر گیا تھا۔
 ”ہم نے پھوٹ پھوٹ کر دنا شروع کر دیا۔ تو زبیر پچھلے سوئے پر منہ دوسری طرف کیسے پٹکی تھی۔“

والتی نے کہا کہ میں نے ابھی تک اس کا نام نہیں لیا ہے کہ بکر رقیہ کا بندہ کتنا ہی نہیں ہو سکتا تو بے شک ابھی میں تو گھر
 کے لیے اس کا نام ہی نہیں لیا ہے۔ مگر مجھے اس کے گھر کے حالات نظام بھی دراز ہونے چاہئے۔
 ”ابھی تو وہ بکر رقیہ کا بندہ ہی نہیں ہے۔ اس کا نام ہی نہیں لیا ہے۔“

والتی نے کہا کہ میں نے ابھی تک اس کا نام نہیں لیا ہے کہ بکر رقیہ کا بندہ کتنا ہی نہیں ہو سکتا تو بے شک ابھی میں تو گھر
 کے لیے اس کا نام ہی نہیں لیا ہے۔ مگر مجھے اس کے گھر کے حالات نظام بھی دراز ہونے چاہئے۔
 ”ابھی تو وہ بکر رقیہ کا بندہ ہی نہیں ہے۔ اس کا نام ہی نہیں لیا ہے۔“



تماشا نہ بنتی۔ اپنی ہی نظروں میں یوں نہ کرتی۔ کوئی نہیں ہے میرا۔ نہ ماں نہ باپ نہ بھائی۔ آپ کی چاہتی تھی تاکہ میں عمر بھر بونہی بن گیا ہی نہیں بیٹھی رہوں تو جا کر اسے مبارکباد دیجیے گا اس کی ساری پوری ہو گئیں۔ گھر بیٹھے طلاق کا اپنا رڈ مل جائے گا مجھے خوش ہو جائے۔

وہ روتے ہوئے پھٹی آواز میں بولتی چیزوں سے ٹکراتی عدیل کے بڑھے ہوئے ہاتھوں کو جھٹکتی باہر نکل گئی اس نے جس زور سے جا کر اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا تھا عدیل کو یقین ہو گیا اب وہ کل سے پہلے تو یہ نہیں کھولے گی۔ عدیل بے چارگی سے ماں کو دیکھنے لگا۔

”آہ! وہ پھر سے عدھال ہو کر بیٹھ گیا۔ نسیم بیگم نے زور سے اس کا ہاتھ پرے ہٹایا تو وہ اور جھنجھلا گیا۔

”بتائیں کہاں سے کروں میں اتنی بڑی رقم کا بندوبست۔ جمع جتنی نکالوں۔ ادھر ادھر سے ادھار بھی لوں پانچ لاکھ سے اوپر نہیں کر سکتا۔ آپ انہیں بتائی کیوں نہیں اپنی مجبوریاں؟“

”تمہارا کیا خیال ہے۔ میں جان بوجھ کر تمہیں پریشان کر رہی ہوں۔ ماں ہوں مجھے تمہاری پریشانی کا احساس نہیں ہے کیا؟“ وہ تڑخ کر بولیں۔

”نہیں امی! مجھے پتا ہے لیکن انہیں کہیں اگر میں پانچ لاکھ دے دوں تو۔“

”بات کی سچی میں نے۔ تمہارا پر آنے کی بات کرتے ہو وہ بیس لاکھ سے انہیں پر بھی نہیں آ رہی ہیں۔ تمہارا میں کیا کروں؟“ نسیم بیگم نے جس طرح کہا عدیل سے مزید کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ دونوں یوں چپ ہوئے جیسے کبھی نہیں بولیں گے۔

”آئیں نہیں بشری بیگم تمہارے ساتھ؟“ بہت دیر بعد وہ طنز سے بولیں۔

”اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں بھی بہت تھک سا گیا تھا خود ہی آجائے گی ایک دو دن میں عمران کے ساتھ۔“ وہ لہجے میں بے زاری سمو کر بولا کہ کہیں ماں کو یہ شک نہ ہو جائے کہ وہ خود اسے وہیں رہنے کا کہہ رہا ہے۔

”ہاں معلوم تھا مجھے۔ اسے ہمارے دکھ درد اور پریشانی کا کیا احساس ہو گا۔ اس کی ماں تو خوشی سے بغلیں بجائے ہوگی۔ جانتی ہوں میں اس عورت کی فطرت کو۔“ وہ زہر بھرے لہجے میں بولیں۔

”امی! میرے واقعی سچھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں۔ بہت سوں سے قرضے کی بات کی ہے مگر آج کل کے دور میں جب لوگوں کے روز مرہ کے اخراجات پورے نہیں ہوتے ایسی چوڑی بچت کس کے پاس ہوتی ہے۔ میں تیس ہزار سے اوپر کوئی بھی دینے پر راضی نہیں۔“ وہ بے چارگی سے بولا۔

”ایک طریقہ ہے جس سے تم بغیر قرض لیے آدھی رقم کا تو بندوبست کر ہی سکتے ہو۔“ نسیم نے جتانے والے انداز میں کہا تو وہاں کو دیکھنے لگا۔

بھابھی! تین لاکھ کا چیک ہے جو دس تاریخ کو کیش ہو سکے گا۔ عفتان کے ڈھائی لاکھ کے ڈپوز تھے۔ باقی کے چھپان ہزار آفس نے خود ہی ایڈ کر لیے ہیں۔ سوائٹ جیٹا میٹرک کر چکا ہوتا تو یقیناً ”وہ اس کی کسی نہ کسی طرح آفس میں جگہ بنا دیتے مگر ابھی۔“

واثق نے یوں شرمندگی سے سر جھکا یا جیسے اس میں اس کا قصور ہو کرے میں کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ ذرا دیر بعد زبیر نے دو سری فائل کھولی۔ کچھ دیر کچھ ورق الٹ پلٹ کر دیکھا رہا۔

”آفس کے گریجویٹ فنڈ سے دس لاکھ تو وہ عفتان کے چھوٹے بھائی جمشید کے علاج کے لیے پہلے ہی نکلاوا چکے تھے۔ اب کو یا رہے نا؟“ عاصمہ نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا۔ اب وقت کی اس ستم ظریفی کو کیا کہے کہ پانچ سال پہلے جمشید کو اچانک کینسر تشخیص ہوا اور فاروق صاحب نے اس کے علاج پر پانی کی طرح پیسہ بہلایا۔ مگر اس کی زندگی نے وفا نہیں کی۔ اب وہ دس لاکھ کا خسارہ بھی ان کی تقدیر پر ثبت ہو گیا۔

”اب یہ سات لاکھ ہیں۔ پندرہ تاریخ کو آپ کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہو جائیں گے۔ باقی جو کچھ بھی ان فائلوں میں لکھا ہے آپ فارغ نام میں دیکھ لیجئے گا۔“ وہ جیسے سب کچھ بول کر ایک دم سے خاموش ہو گیا۔ کمرے میں پھر خالد خاموشی تھی۔

”آپ نے آگے کیا سوچا ہے بھابھی؟“ وہ بہت دیر بعد بولا۔

”ابھی تو کچھ بھی نہیں۔ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا زبیر بھائی۔“

”کاش! وہ گاؤں جاتے ہی نہیں۔ منحوس زمین بکتی نہیں اور اس رقم کی وجہ سے انسانی جانیں نہ جاتیں۔“ وہ نہ جانتے ہوئے بھی سسکا اٹھی۔

”میں آپ کی پریشانی سمجھ سکتا ہوں۔“ وہ گہرا سانس لے کر بولا۔ ”مستقل آمدنی کے لیے یہی ہو سکتا ہے کہ آپ یہ ساری رقم بینک میں جمع کروادیں اس کے پرافٹ پر گزارہ کر لیں۔“ وہ ذرا دیر بعد بولا۔

”ابا جی! آپ کو جو گریجویٹ کی رقم ملے گی اسے بینک میں پڑا رہنے دیجیے گا۔ اچھی بھلی ماہانہ آمدنی آنے لگے گی پرافٹ کی شکل میں۔“ وہ ابا جی کے جمعے کے لیے سفید کپڑے کلف لگا کر استری کر رہی تھی جب اس نے فاروق صاحب کو مشورہ دیا تھا۔

”نہ بیٹا! عمر بھر بری بھلی ہمیشہ کوشش کی کہ حلال کھاؤں اور بچوں کو بھی حلال کھلاؤں۔ اب اس عمر میں اگر حرام کھلاؤں؟ سب کچھ عمارت کروں؟“ وہ لنگی میں سر ہلا کر بولے۔

”کیا مطلب ابا جی؟“ وہ جزبز سا ہوئی تھی۔

”بیٹا! سود ہمارے مذہب میں حرام ہے اور یہ پرافٹ سود کے زمرے میں آتا ہے۔ ایسا آئندہ کبھی سوچنا بھی نہیں۔“ وہ اسے تنبیہ کرتے ہوئے بولے تو عاصمہ سر ہلا کر ان سے متفق ہو گئی۔ وہ تو یوں بھی ان کی ہر بات پر راضی ہو جانا کرتی تھی۔ یہ بات تو بہت بڑی تھی۔ وہ کہے بھول جاتی۔

”بہت شکریہ زبیر بھائی! میں یہ دیکھ لوں گی۔“ وہ آہستگی سے دونوں فائلیں اپنے آگے کرتے ہوئے بولی۔

”تو ٹھیک ہے بھابھی! میں ابھی دس دن ادھر ہی ہوں آپ کی رقم ٹرانسفر ہو جائے گی تو بس پھر میں جاؤں گا آپ کو جو بھی مسئلہ ہو مجھ سے کہہ دیجیے گا۔“ وہ فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”ضرور۔“ وہ سر ہلا کر بولی۔

واثق بھی ساتھ کھڑا ہو گیا اور زبیر انکل کے ساتھ چلتے ہوئے باہر نکل گیا۔

عاصمہ دونوں فائلوں کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی۔ اسے اب جو کچھ بھی سوچنا تھا ان دس لاکھ روپوں سے سوچنا تھا کہ زندگی بار بار اس کو ایسے مواقع نہیں دے گی۔

کے جانے گا اور دو تین لاکھ کا امی کا۔ اس طرح مل ملا کر بیس لاکھ کے قریب ہو ہی جائے گا۔ کم از کم میری بہن کی زندگی اجڑنے سے بچ جائے گی تو یہ رقم بہت بڑی نہیں۔“

اور بشری کسی بہت کی طرح اسے دیکھے جا رہی تھی جو اپنی دھن میں بار بار دہراتے ہوئے گویا خود کو تسلی دے جا رہا تھا۔

”اور اگر میں انکار کروں؟“ بشری بہت دیر بعد سرو لہجے میں بولی تھی۔

گاڑی کے ٹائز زور سے چر چرائے تھے۔ عدیل کے لیے یہ بات بالکل غیر متوقع تھی۔

اس نے گاڑی ایک طرف روکی اور تیز نظروں سے بشری کو دیکھنے لگا۔

”تم کہنا چاہتی ہو کہ تمہیں اپنا زیور اور اپنی ماں سے لیا جانے والا قرض میری عزت سے زیادہ پیارا ہے۔“ وہ رک رک کر یوں بول رہا تھا جیسے لفظوں کو تول رہا ہو۔

”بات آپ کی عزت کی ہے عدیل! تو میں بھی آپ کی عزت ہوں۔ وہ زیور آدھا آپ لوگوں کی طرف سے تھا بے شک مگر عدیل صاحب تحفہ کسی کو دینے کے بعد اس سے چھینا جائے تو اسے کیا کہتے ہیں؟“ وہ طنز سے بولی اور عدیل کا چہرہ لمحہ بھر میں جیسے لال بھبھو کا ہو گیا۔

اس نے بغیر کچھ کے گاڑی اشارت کی اور اندھا دھند دوڑانا شروع کر دی۔ گاڑی جس رفتار سے جا رہی تھی، لگتا تھا آج وہ دونوں زندہ سلامت گھر نہیں پہنچ سکیں گے میری مثال۔ بشری کو آنکھیں بند کر کے بس آخری یہی خیال آیا تھا۔

”بیٹا! پوچھ کر ملاتے ہیں کسی کو۔ بونٹی اٹھا کر تم کسی کو بھی لے آؤ اور ڈرائنگ روم میں بیٹھا دو۔ اچھی بات نہیں۔ مجھے بتاتے تو۔“ وہ واٹس سے سخت سے بولتی اس کے ساتھ ڈرائنگ روم کی طرف آئی۔

”سوری ماما، وہ اٹکل کہنے لگے کہ آپ کی ماما انہیں جانتی ہیں بلکہ دادا ابو بھی جانتے تھے تو میں نے انہیں بیٹھا دیا۔“ غاصد ڈرائنگ کے دروازے پر ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

- | | | |
|--------------------------|--------------|----------------|
| ☆ تئلیاں، پھول اور خوشبو | راحت جسبیں | قیمت: 250 روپے |
| ☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں | فائزہ افتخار | قیمت: 600 روپے |
| ☆ محبت بیاں نہیں | لینٹی جدون | قیمت: 250 روپے |

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

”کچھ ایسا کروں کہ یہ رقم ضائع بھی نہیں ہو اور محفوظ بھی ہو جائے۔“ اس کا ذہن اب تیزی سے کام کر رہا تھا۔

”یوں تو ہر مہینے ایک لگی بندھی رقم چاہیے ہوگی۔ اگر اس بد میں ان دس لاکھ روپوں کو وہ خرچ کرے گی تو سال ڈیڑھ سال میں ختم ہو جائے گا اور اس کے بعد۔“ اس کے بعد کا خوفناک سوالیہ نشان اسے دہلا گیا۔

”کیا ہونا چاہیے اس رقم کا مصروف۔“ وہ رات کا کھانا بتاتے ہوئے مسلسل سوچے جا رہی تھی۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں عدیل؟“ بشری کے سر پر جیسے کسی نے ہم پھوڑ دیا تھا۔ وہ شدید ہونٹ پیچھے عدیل کو دیکھتے ہوئے برا فروختہ ہو کر بولی۔

عدیل نے کڑی نظروں سے بشری کو دیکھا مگر کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

”عدیل! آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ مجھے ابھی امی کی طرف رہنا چاہیے کم از کم اس مسئلے کے حل ہو جائے تک۔“ وہ پھر سے پہلی بات کو نظر انداز کر کے بولی۔ شاید وہ بات عدیل کے منہ سے غلطی سے نکل گئی ہوگی۔

”اور اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے بھی تو کچھ کرنا ہو گا اور تم جانتی ہو اسے صرف میں ہی حل کر سکتا ہوں۔“ وہ ترشی سے بولا۔

”میں سمجھی نہیں آپ کی بات۔“

”میں ہی کمانے والا ہوں نا اس گھر کا۔ تو مجھے ہی اسے ہینڈل کرنا ہو گا۔“

”لیکن عدیل! یہ تو غلط بات ہے تاکہ ان لوگوں کی ایسی بے جا ڈیمانڈ پوری کی جائے۔“ وہ تیزی سے بولی۔ اس کے لیے تو یہ بات ہی بہت حیران کن تھی کہ عدیل ان لوگوں کو رقم دینے کے لیے راضی ہو گیا۔

اور یہ یقیناً ”فوزیہ اور نسیم بیگم کے دادیلا کی بدولت ممکن ہوا ہو گا“ ورنہ پہلے تو عدیل اس معاملے میں کوئی بات نہیں سننا چاہتا تھا۔ اسے گھر سے جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ مگر اب پچھتائے گا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

”تو تم کیا چاہتی ہو میں اپنی بہن کو طلاق دلوں کر ہمیشہ کے لیے گھر بیٹھالوں؟“ وہ یوں اجنبی لہجے میں بولا جیسے بشری کو اس سے کوئی مطلب نہ ہو۔

”عدیل مگر۔“ وہ بوکھلا کر رہ گئی۔ اس رات والا عدیل پھر اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

”بشری! ان لوگوں کا مطالبہ غلط یا صحیح ہمارے پاس اس کو مان لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔“

”واشبہ۔ آپ کہاں سے کریں گے بیس لاکھ کا انتظام۔ سوچا ہے آپ نے؟“ وہ تو بھڑک اٹھی۔ عدیل نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی اور لمحہ بھر خاموش رہا۔

”عدیل! میں کیا کہہ رہی ہوں۔“

”سوچ لیا ہے میں نے سب کچھ تو تم کیوں چیخ رہی ہو۔“ وہ اسی اجنبی لہجے میں کٹھور بن سے بولا۔ بشری اسے دیکھتی رہ گئی۔

”میں رات میں تمہیں واپس آنی کی طرف چھوڑ جاؤں گا۔“

”کیا مطلب؟“

”ہے تو بہت گھٹیا سی بات مگر مجبوری ہے۔ تم آئی سے دو تین لاکھ روپے ادھار کے طور پر لوگی۔“ وہ بے چنگ لہجے میں بولا۔

”عدیل! یہ وہاں کا پہلے سے بھی زیادہ زور دار تھا۔“

”پانچ لاکھ کا انتظام میں کسی طرح کر لوں گا۔ تین لاکھ کا عمران اور آئی کریں گی۔ سات آٹھ لاکھ کا تمہارا زیور

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم حاصل کیوں کریں :-

رُحسانہ نگار عدنان

لکھی جاتی ہیں

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشری ان کی بہن ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی عمران بشری کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی تو اسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشری اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصلحتاً "میںا بسوسے لگاوت دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ "دن کی بیٹی بشری کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ذکیہ بیگم اپنے بیٹے عمران کے لیے بھی لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔ سب سے پہلے سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشری کی منہ توڑیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشری دو لہا ظمیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظمیر کا بشری کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشری اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشری اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشری کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹ اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہیں۔ عاصمہ کو فون کے ذریعے کوئی اطلاع ملتی ہے جسے سن کر وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔

فون پر پتا چلتا ہے کہ شہر آتے ہوئے عفان اور فاروق صاحب ذکیہ کی وارادت میں قتل ہو گئے۔ عفان کے قریبی دوست زہیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹ سے سات لاکھ روپے وصول کرائی ہے۔ زہیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ پیریڈک کو الٹی مڈل کو الٹی، کمپریزڈ کو الٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✧ ڈاؤن لوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ایچ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

دعا دے ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ڈورنٹ سے لگی ڈاؤن لوڈ کی جا سکتی ہے

↳ ڈاؤن لوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤن لوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہیری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤن لوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook fb.com/paksociety  twitter.com/paksociety



اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں متولیوں کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوری رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشری سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔ جمیدہ خالہ عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زیر کا اکیلے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں۔ جبکہ عاصمہ مجبور ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔ وہ چاہتا ہے جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آ جاتا ہے کہ وہ انتہائی ضرورت کے تحت گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔

پانچویں قسط

گھر میں ایک جاہد سناٹا تھا ایک خوفناک خاموشی۔
 بشری یوں ہی نیم دراز سی جانے کس وقت صوفے پر بڑے بڑے گہری نیند سو گئی تھی۔
 اس کی کی آنکھ اس خوفناک سناٹے کی وجہ سے کھلی تھی۔
 کمرے میں وحند لاسانڈھیرا تھا اور سائیں سائیں کرتی چپ۔
 وہ ڈر سی گئی۔ اس نے جیسے خوف سے اپنے پیر سمیٹ لیے۔
 ”مثال!“ کمرے میں اوہرا اوہر دیکھتے ہوئے اس نے آہستگی سے پکارا۔ اس کی پکار کسی سرگوشی کی مانند تھی جیسے اس کے لبوں سے نکلی ہی نہ ہو۔
 ”سب لوگ کہاں ہیں؟“ کچھ دیر پہلے تو کتنا ہنگامہ شور اور بد مزگی سی تھی سارے گھر میں اور اب عدیل۔
 عدیل کہاں ہیں؟“ اسے پاؤ آیا۔
 وہ تینوں لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ جب بشری ان کی ملاحظہ حاصل بحث سے اکتا کر اپنے بیڈ روم میں آگئی تھی۔ مثال صوفے کے قریب اپنے کھلونے لیے کھیل رہی تھی۔ بشری اکتائی ہوئی سی اس کے پاس بیٹھ گئی۔ مثال اس سے اوہرا اوہر کی باتیں کرنے لگی۔ بشری غائب دماغ سی بنے گئی۔
 اور جانے کب مثال سے باتیں کرتے وہ صوفے کے ہتھ پر سڑکائے گہری نیند سو گئی۔
 کسی برے خیال کے آتے ہی وہ تیزی سے اٹھ کر باہر جانے لگی۔ صوفے کے پاس زمین پر پڑے مثال کے کھلونے اس کے پاؤں سے ٹکرا کر ایک ناخوشگوار شور کے ساتھ اوہرا اوہر بکھرے گئے۔
 اسی وقت باہر ڈور بیل بجی۔
 اور پھر بجتی ہی چلی گئی۔ بشری تیزی سے باہر نکلی۔ صوفے پر پڑا اس کا سیل فون بجنے لگا۔
 وہ لہجہ بھر متذبذب سی کھڑی رہی۔ پھر مڑ کر سیل اٹھایا تو وہ اتنی دیر میں بند ہو چکا تھا۔ اس نے نمبر دیکھا تو کوئی اجنبی نمبر تھا۔
 اس نے سیل مٹھی میں دبایا اور باہر جانے لگی کہ فوزیہ کی دل دوزخ نے جیسے اس کے قدم جکڑ لیے۔
 ”یا اللہ! خیر۔ آئی ٹھیک ہوں۔ فوزیہ ایسے کیوں چیخی۔“ وہ سینے پر ہاتھ رکھے گویا دل کو سنبھالتی کمرے سے نکل آئی۔
 دونوں ہاں بیٹی لاؤنج ہی میں تھیں۔
 فوزیہ کاربٹ پر بیٹھی تھی اور اس کے ہاتھ میں کوئی ادھ کھلا کاغذ تھا۔ فوزیہ کسی بت کی طرح ساکت سی بیٹھی تھی۔

سیم پھٹی پھٹی آنکھوں سے فوزیہ کو دیکھے جا رہی تھیں۔
 بشری کچھ اور خوفزدہ سی ہو گئی۔ ”کیس وہ انسوئی تو نہیں ہو گئی۔ جس کے خوف نے ہمارے گھر کا چین مسکون اتنے مہینوں سے عارت کر رکھا تھا۔“ اس نے سیم کو سوچا۔
 ”ای! کیا ہوا؟“ فوزیہ ایسے کیوں چیخی تھی؟“ اس نے ڈرے ہوئے لہجے میں آگے بڑھ کر پوچھا۔
 دونوں ہی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئیں۔ اس طرح بے جان سی بتوں کی طرح بیٹھی رہیں۔
 ”فوزیہ! سب ٹھیک ہے نا؟“ وہ فوزیہ کے پاس آ کر دھیرے سے بولی۔
 فوزیہ کے ہاتھ سے کاغذ چھوٹ کر نیچے گر گیا۔

بشری ساکت سی اسے دیکھ کر رہ گئی۔ ”تو میرا دہم ٹھیک ہے۔“
 اس نے ذرا سی نظریں ترچھی کر کے پتھر کا بت بنی نسیم بیگم کو دیکھا اور پھر ڈرتے ڈرتے فوزیہ کے پاس گر ڈکاغذ اٹھالیا۔
 ”طلاق نامہ۔“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا اور نسیم بیگم جیسے خود پر ضبط کھو بیٹھیں۔ ان کے منہ سے ایک دلخراش چیخ سی نکلی اور وہ صوفے کے ایک طرف گر کر بے ہوش ہو گئیں۔ فوزیہ اس طرح بت بنی بیٹھی رہ گئی۔
 ”ای! ای! ای! نہیں۔ ہوش کر پئی ای! بشری! گھبرا کر نسیم بیگم کو بٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔
 ”یہ تو بے ہوش ہو گئی ہیں۔“ فوزیہ لہجے میں غمی کو کچھ ہونہ جانے۔
 پلیز! کسی ڈاکٹر کو عدیل کو فون کرو۔ کہاں ہے عدیل؟“ وہ بے ربط سا بولے جا رہی تھی۔ فوزیہ اس طرح ساکت بیٹھی تھی۔
 وہ جلدی سے عدیل کا نمبر ملانے لگی۔ عدیل کا فون وہیں صوفے کے نیچے کہیں گرا ہوا تھا۔ وہاں سے آئی ہپ کی آواز بشری کو پریشان کر گئی۔
 عدیل جانے کس پریشانی میں گھر سے نکل کر گئے ہوں گے کہ وہ اپنا سیل بھی نہیں بھول گئے۔ وہ تاسف سے سوچ کر رہ گئی۔ نسیم بیگم ابھی تک بے ہوش تھیں۔
 بشری نے جلدی سے عمران کا نمبر ملایا اور اسے صورت حال بتا کر جلدی پہنچنے کی تاکید کی اور پھر فکر مندی سے اسی طرح بے حس بیٹھی فوزیہ کو دیکھتی رہی۔



باہر اندھیرا گرا ہوا تھا جلا جا رہا تھا۔
 جوں جوں گاڑی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ عاصمہ کا دل جیسے بیٹھا جا رہا تھا۔ جانے کیوں اسے کسی ان دیکھے انجانے خطرے کا احساس ہو رہا تھا۔
 اس کے ہاتھوں میں ٹھنڈے سپینے آرے تھے۔ اس نے سہارے کے لیے ساتھ جڑ کر بیٹھی اربہ کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینے چاہے اور دوسرے لمحے چونک سی گئی۔
 اربہ ایک طرف لڑھکی گہری نیند سو چکی تھی۔
 ”اربہ بیٹا! سو کیوں گئیں؟“ وہ اس پر جھکی متفکر سی آہستگی سے بولی۔
 اربہ ماں کی پریشانی سے بے خبر گہری نیند سو چکی تھی۔
 ”زیر بھائی! یہ تو سو گئی۔“ اس نے زیر کی بہت گہری معنی خیز خاموشی سے توجہ ہٹا کر بظاہر نارمل انداز میں مخاطب کیا۔ ورنہ زیر کی مسلسل چپ اسے اندر ہی اندر ڈرا بھی رہی تھی۔

”سوئے ہیں۔ اسکول سے آکر سوئی ہو نہیں ہوگی۔“ وہ لاپرواہی سے بولا۔

”نہیں! اسکول سے آکر تو یہ کافی سوئی تھی۔ پھر اب کیوں سو گئی۔ اربہ میری جان! اٹھو نا۔ نیا گھر نہیں دیکھو۔ اس نے ایک بار پھر اربہ کو اٹھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ بہت بے سادہ سو رہی تھی۔“

”اس طرح تو یہ کبھی نہیں سوئی۔“ وہ پریشان سی ہو گئی۔

”سوئے دونا! کیوں اسے ڈسٹرب کر رہی ہو؟“ زبیر کا بے تکلفانہ انداز اسے چونکا سا گیا۔

بے اختیار اس نے چادر کے کونے کو چہرے کے ارد گرد کر لیا اور یوں ہی پریشان بھکتی نظر جیسے ہی بیک درہ پڑی تو اس کی جان ہی نکل گئی۔

زبیر کی آنکھوں میں انوکھی سی چمک تھی اور عاصمہ کے وجود پر جی نظریں۔ کیا نہیں تھا ان نظروں میں۔ عاصمہ جیسی محتاط عورت جس نے اپنی زندگی میں پہلے باپ بھائی اور پھر شوہر مسر کے سوا کسی مرد کو قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ مگر پھر بھی وہ ان نظروں کو بہت اچھی طرح پہچان سکتی تھی کہ یہ کسی مرد کی بری نظر تھی۔ اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کی میلی ہتھیلیوں نے اربہ کے ہاتھوں پر اپنی گرفت اور بھی مضبوط کر لی۔

وہ کچھ اور بھی سمٹ کر رہ گئی۔ لیکن وہ نظریں۔

”زبیر بھائی! اس نے بے اختیار پھینچی ہوئی آواز میں اسے رکارا۔

”میں گھر واپس جانا چاہتی ہوں۔ مجھے لگ رہا ہے کہ میری طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔ میرا پی پی۔ بی پی اور ہارے پکے بھی ایسا ہو چکا ہے۔ تو آپ پلیز مجھے گھر۔“ وہ بہت مشکل سے بول پارہی تھی گلے میں جیسے بہت سے پھندے تھے۔

”گھر تو آ گیا ہے۔ بس دو منٹ کی ڈرائیو اور ہے۔ پھر آپ کو پتا ہے، آپ بار بار تو نکل نہیں سکیں گی۔ بس تھوڑی دیر اور۔“ زبیر نے ان ہی نظروں سے اسے دیکھا اور گاڑی کی رفتار بڑھادی۔ عاصمہ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

اپنے ساتھ سوئے اس ننھے سہارے کو دیکھا وہ ہوش و خرد سے بے نیاز گہری نیند سو رہی تھی۔

عاصمہ کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔

جب وہ گاڑی میں بیٹھنے کے لیے باہر آئی تھی تو اربہ زبیر کی دی ہوئی چاکلیٹ مزے سے کھا رہی تھی۔

”تو تمہیں اس چاکلیٹ میں کچھ۔۔۔ اربہ دوپہر میں اسکول سے آکر تین چار گھنٹے سوئی تھی۔ اب دوبارہ اتنی جلدی تو اسے نہیں سونا چاہیے تھا۔“ وہ اربہ کی مدد ہوشی کو دیکھتے ہوئے جیسے اس کی نیند کی وجہ جاننے کی کوشش کرنے لگی۔

گاڑی اب ایک دیر ان اندھیری سڑک پر تھی۔ یہ کوئی نئی بستی تھی۔ ارد گرد آبادی بہت کم تھی۔ اگر کچھ مکان بنے بھی تھے تو ان میں زندگی کے آثار نہیں تھے۔

”میرے خیال میں آپ کچھ گھبرا رہی ہیں۔ ہے نا؟“ زبیر کے عجیب سے لہجے نے اس گنہگار سنانے کو توڑا تھا۔

عاصمہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”میرے خیال میں گھر کتنا بھی اچھا کیوں نہ ہو۔ مجھے پسند نہیں آئے گا۔ اس لیے پلیز! آپ مجھے واپس گھر چھوڑ دیں یا میں اسے ہی اتار دیں۔“ اس نے اربہ کو اب اپنی گود میں سمیٹ لیا تھا۔ جیسے وہ ابھی واقعی ہی گاڑی روکے گا اور وہ نکل بھاگے گی۔

اگر ایسا ہو بھی جاتا تو بھی اس دیرانے میں اسے کونہیں کہاں سے ملتی۔

لیکن اس وقت وہ ہر طرح کا رسک لینے کے لیے تیار تھی۔ بس اس گاڑی سے اتر جاتی ایک بار۔

”یہاں۔۔۔؟“ وہ لیٹھے سے بولا۔ اس کی نظریں صاف عاصمہ کو مذاق اڑاتی محسوس ہوئی تھیں۔

”کیا کریں گی یہاں اتر کر آپ؟“ وہ واقعی اس کی گھبراہٹ سے محظوظ ہو رہا تھا۔

”پلیز! مجھے آپ یہیں ڈراپ کریں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی بے بسی کے گہرے احساس نے اس کی آنکھیں

دھندلا دیں آواز میں نمی سی اتر آئی۔

”ڈراپ تو نہیں کر سکتا اب۔“ وہ یقیناً ”زیر لب ہی بولا تھا۔ آواز بہت نیچی تھی۔ مگر عاصمہ سن چکی تھی۔

”اگر آپ گاڑی نہیں روکیں گے۔ میں اس طرح اتر جاؤں گی۔“ اس نے بے اختیار دروازے کے ہینڈل پر

ہاتھ رکھا۔

”آؤ بیگ لاک ہیں اس کے اور عاصمہ بھا بھی آپ کیوں گھبرا رہی ہیں؟ علاقہ تو ہوا کم آباد ضرور ہے۔ لیکن

یقین کریں۔ یہاں سارے پلاسٹک ہو چکے ہیں۔ بلکہ آدھے سے زیادہ تو بن بھی چکے ہیں اور لوگ یہاں آکر

رہنے لگے ہیں اس لیے تو آپ کو اتنی کم قیمت میں گھر مل رہا ہے بس یہ دیکھیں۔ آگیا گھر۔ وہ وائٹ گیٹ نظر آ رہا

ہے نا اس سرمئی اور نیلے گیٹ سے آگے۔ وہی تو ہماری منزل ہے۔ بس وہیں تک جانا ہے ہمیں۔“

اس کا لہجہ اور انداز ایک بار پھر بدل چکے تھے۔

عاصمہ نے اب بھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ جیسے فیصلہ نہ کر پارہی ہو۔ گاڑی اب جیسے ٹوٹی پھوٹی پکنڈنڈی

سے گزر رہی تھی۔ کیونکہ سڑک تو اب وہاں کوئی نہیں تھی۔

”اس دیرانے میں۔۔۔ میں بچوں کے ساتھ یہاں نہیں رہ سکتی۔ میرے بچے گھر میں اکیلے ہیں اور یہ شخص

۔۔۔ اس کی نیت مجھے ٹھیک نہیں لگتی۔ یا اللہ! مجھ پر رحم فرما۔ میں تو پہلے ہی بڑی کڑی آزمائش میں گھری ہوں۔ مجھے

خیر و عافیت کے ساتھ میرے بچوں کے درمیان واپس پہنچا۔ میں تجھ سے توبہ کرتی ہوں۔ میں نے تیرے سوا کسی

اور کو سہارا جانا۔ برا کیا۔ اے اللہ! مجھے معاف کر دے۔ مجھے اور میری بچی کو بچالے۔ اس کی نیت کو پھیر دے۔

اے دلوں کو پھیرنے والے اس شخص کو میرے لیے بے ضرر بنا دے۔ میرے اللہ! ایک بار مجھ پر رحم فرما۔ میں

آئندہ تیری حدود نہیں توڑوں گی۔ مجھ پر رحم فرما! گرم گرم آنسو اس کی آنکھوں سے بہتے چلے گئے۔

گاڑی اس سنسان سے گھر کے سفید گیٹ کے آگے رک چکی تھی۔



فیم بیگم آئی سی یو میں تھیں۔

انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ ابھی ڈاکٹرز ان کے بچ جانے کے بارے میں پر امید نہیں تھے۔

بشری اور عمران نے چینی سے آئی سی یو کے باہر بیٹھے تھے۔

”عدیل بھائی کے کسی ایسے قریبی دوست کا نمبر جہاں ود جا سکتے ہوں۔ آپنی! تمہیں کچھ تو پتا ہو گا۔“ عمران کچھ

جھنجھلا کر بولا۔

ڈیڑھ گھنٹہ ہونے لگا تھا اور عدیل سے کوشش کے باوجود رابطہ نہیں ہو پارہا تھا۔ بشری بہت فکر مند تھی۔

عدیل ایک ذمہ دار شخص تھا۔ وہ یوں گھر میں اتنی بڑی پریشانی کے ہونے وامن چھڑا کر یاروں دوستوں میں جا کر

بیٹھنے والوں میں سے نہیں تھا۔ اتنا اسے پتا تھا۔

”جو وہ ایک دوست تھے ان سے میں اسپتال آنے سے پہلے بات کر چکی ہوں۔ بلکہ پیغام بھی دے آئی تھی کہ

جیسے ہی ان کا عدیل سے رابطہ ہو وہ انہیں امی کے بارے میں بتادیں۔“ وہ گہرا سانس لے کر فکر مندی سے بولی۔

عمران تھوڑی دیر بعد پھر کر بولا۔

”ای کا پھر فون آرہا ہے۔ پھر انہیں یہی کہنا ہو گا کہ بشری سے کہو گھر چلی جائے۔ آبی میں ہوں نایمان۔ تمہیں کیوں نہیں جاتیں؟“

عمران جھنجھلا کر بولا۔ ذکیہ کی کال اس نے ڈراپ کر دی تھی۔
”فوزیہ کی حالت بھی اچھی نہیں۔ میں بھی گھر جا کر بیٹھ گئی اور خدا نخواستہ امی کو کچھ ہو گیا تو تم عدیل کو نہیں جانتے۔ میں ٹھیک ہوں۔ تم کہہ دو امی سے۔“ بشری آئی سی یو کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”یہ خوب رہی ابھی دونوں بہن بھائی عاتب ہیں۔ آپ کی ساس صاحبہ جن کی والدہ ہیں۔ انہیں تو کچھ پریشان نہیں۔ آپ اس حالت میں سب دکھ جھیلنے نیک خدمت گار بنی بیٹھی ہیں۔“ عمران اب چڑ گیا تھا کہ تین گھنٹے سے اس فصول کی بے گار میں پھنسے پڑے ہیں کہ جس خدمت خلق کا اسے کچھ حاصل وصول بھی نظر نہیں رہا تھا۔

”ای سے پوچھو مثال نے کچھ کھایا ہے۔“ بشری کو خیال آیا۔

”کھالیا ہو گا۔ اب اتنی سی بات کے لیے فون کروں۔ میرے خیال میں میں ڈاکٹرز سے پوچھ کر آتا ہوں۔ نیم آئی کی اب کیا کنڈیشن ہے۔“ عمران کی طبیعت میں نچلا بیٹھنا محال تھا۔ یوں بھی وہ کسی بھی انتظار کی کیفیت کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ جلد بازی اس کی فطرت کا محور تھی۔ وہ کسی بھی چیز سے کچھ ہی دیر میں اکتا جاتا۔ اب وہ اسپتال سے کھکنے کے چکر میں تھا۔ بشری جانتی تھی مگر عدیل کے آنے تک عمران کی سب باتیں برداشت کرنا اس کی مجبوری تھا۔



”میں تو حیران ہوں۔ تین سال ہو گئے ہیں اور اس علاقے کا ابھی بھی وہی حال ہے۔ جو تین سال پہلے تھا۔ اکاؤ کا گھر بنے ہیں۔ وہ بھی ابھی تک بے آباد۔“ عدیل نے ساتھ بیٹھے محسن سے کہا۔

”ہاں! شہر کی آبادیوں سے یہ سوسائٹی کالی ہٹ کر ہے۔ بلکہ جنہوں نے گھر بنائے ہیں وہ بھی انہیں بیچنے کے چکروں میں ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ قیمت وہ بڑھی ہوئی چاہتے ہیں جو کہ مل نہیں پا رہی۔ سوا کتر گھر بند کر کے شہر کے آس پاس یا کسی اور پر رونق سوسائٹی میں پسند کا پلاٹ لے کر گھر بنانے چکے ہیں۔“ محسن نے تفصیل سے بتایا۔ باہر گری رات ہو چکی تھی۔

”چلو پھر تو میرا فیصلہ ٹھیک ہی ہے۔ اگرچہ میں نے بہت سوچ کر بلکہ یوں سمجھو نیم عدیل سے اسے بیچنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اگر مجھے اتنی ایمر جنسی میں ضرورت نہ آتی تو چند سال اور اسے پڑا رہنے دیتا۔“

”کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میرا سیل گھر ہی میں رو گیا ہو۔ بہت الجھن سی ہو رہی ہے۔ میں کسی کو تار کر بھی نہیں آیا کہ کہاں جا رہا ہوں۔“ عدیل کو عجیب سی فکر ہو رہی تھی۔ وہ نسیم بیگم اور فوزیہ اس پریشانی میں کوئی بھی آس و لائے بغیر چلا آیا تھا۔ وہ یقیناً ”بہت پریشان ہوں گی۔“

”فکر نہیں کرو۔ ہمیں زیادہ ناظم نہیں لگے گا۔ وحید صاحب کاروباری آوی ہیں اور لین دین میں بڑے صاف ستھرے ہیں اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ آدھی سے زیادہ رقم فوراً دے رہے ہیں۔ یہ کہہ ہے کیا؟“
”ہوں لیہ تو ہے۔“ گاڑی اب پلاٹ کے پاس پہنچ چکی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم سا تھا۔ دور دور تک آبادی کے آثار نہیں تھے۔

”میں نے تو یہ پلاٹ تین سال پہلے بشری کو سربراہ کرنے کے لیے خریدا تھا۔ اچھا ہوا اس نے یہاں آکر نہیں دیکھا ورنہ وہ فوراً اسے بیچنے کا مشورہ دیتی۔“ ہر طرف پھیلے گھنگھور اندھیرے اور سناٹے کو دیکھ کر عدیل نے دل

میں سوچا۔ اس نے بہت سوچنے کے بعد اپنے لیے خریدے ہوئے اس پلاٹ کو بیچنے کا فیصلہ کیا تھا کہ کسی طرح فوزیہ اور ظہیر کا رشتہ بچ جائے۔ اس کی بہن کا گھر کسی طرح جن ہی جائے۔ اتنی مشکلوں سے ہوا تھا یہ رشتہ۔

”جی! کیا کہہ رہے ہیں حاجی صاحب۔ اجی۔ جی! وہ تو میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔ جی بالکل! میں جانتا ہوں۔ تو چلیں! ٹھیک ہے پھر کل پر رکھ لیتے ہیں۔“ اس نے کچھ مایوس سا ہو کر فون بند کر دیا۔
”کیا ہوا؟“ عدیل نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”چانک انہیں ایک ایمر جنسی کے سلسلے میں شہر سے باہر جانا پڑ گیا ہے۔ ان کے بہنوئی کا اچانک ایک سینڈنٹ ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ نہیں آسکتے۔“ محسن نے فون بند کرتے ہوئے عدیل کو بتایا۔

عدیل کو امید تھی کہ کچھ نہ کچھ پیمنٹ کا انتظام کر کے ہی گھر جائے گا مگر۔ شاید قدرت کو یہ منظور ہی نہیں تھا۔

”چلو! ٹھیک ہے تو پھر چلیں۔“ وہ بے دلی سے بولا۔
”یہاں ہے کہ تم مجھے یہاں سے تیرے بلاک میں اے زید کے آفس ڈراپ کرو۔ مجھے اس سے کچھ کام ہے۔ اس کے ساتھ واپس چلا جاؤں گا۔“ محسن نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

عدیل نے عاتب و ماعی کی سی کیفیت میں محسن کو اس کے اسٹیٹ ایجنٹ دوست کے آفس ڈراپ کیا اور پھر ان لوگوں کے روکنے کے باوجود چائے پیے بغیر واپسی کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ جانے اسے کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں کچھ ایسا ویسا ہو گیا ہے۔ وہ جلد سے جلد اس علاقے سے نکل جانا چاہتا تھا۔ عجیب وحشت سی اسے گھیرے ہوئے تھی۔ وہ گاڑی تیزی سے چلانے لگا۔



وہ بیرونی لائٹ جلا کے گھر کا گیٹ کھول چکا تھا اور اب اس کے گاڑی سے اتر کر آنے کا منتظر تھا۔
عاصمہ متذبذب تھی۔ گود میں سوئی اریبہ کو لیے ہوئے وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ گاڑی سے اترے یا پھر دروازہ کھول کر دور تک بھاگتی چلی جائے۔ لیکن کتنی دور تک؟ اگر وہ بدنیت ہو چکا ہے تو پھر وہ زیادہ دور نہیں بھاگ سکتی۔ لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ سب اس کا وہم ہو۔ ایسا کچھ بھی نہ ہو۔
اس نے اپنے وسوسوں کو جھٹلانے کی کمزوری کو شش کی۔ ورنہ تو اس کا اندر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ یہ سب اس کا وہم نہیں ہے۔

دوسرے لمحے وہ پھر سے ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا تھا۔
عاصمہ نے الجھی ہوئی نظروں سے کھلے گیٹ کو دیکھا اور پھر گاڑی اشارت کرتے زیر کو۔

”ہم واپس جا رہے ہیں کیا؟“ عاصمہ اپنے لہجے کی لرزاہٹ کو چھپا نہیں سکی تھی۔ وہ کچھ نہیں بولا۔ بہت مشاقی سے پہلے گاڑی تھوڑی پیچھے کی اور پھر بہت تیزی سے کھلے گیٹ کے اندر لے گیا۔

”یہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ ہمیں واپس جانا ہے ابھی۔ پلیز! گاڑی باہر نکالیں۔ مجھے گھر جانا ہے ابھی۔“ میں اور نہیں رک سکتی۔ ”وہ سبہ قابو ہو کر چیخ ہی پڑی۔“
”اریبہ! اریبہ! اٹھو بیٹا! آنکھیں کھولو دیکھو! میں آپ کی ماما۔“ وہ زور زور سے اریبہ کے گال تھپتھپانے لگی۔

اگرچہ اس کا کچھ فائدہ نہیں تھا۔ اریبہ بے سدھ تھی۔
گاڑی گھر کے اندر آچکی تھی۔
زہیر نے تیزی سے باہر نکل کر گھر کا بیرونی گیٹ بند کر دیا۔

اس کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔



وہ اندھیرے میں اسکی بیٹھی تھی۔ باہر خنک ہوا چل رہی تھی۔ سردی تو یوں بھی پچھ دنوں سے بہت برہ گئی تھی اور اس بار بھی اسے موسم کے بدل جانے کا احساس بہت دنوں بعد ہوا تھا۔

جب یہ سرد ہوا اس کے جسم کو کاٹنے لگی تھی۔ اس کے جسم پر کاشن کا گھسا ہوا پنک کلر کا سوٹ تھا۔ بہت سوچنے پر بھی اسے یاد نہیں آیا تھا کہ یہ سوٹ کس نے مسترد کیا تھا اور اسے دے دیا گیا تھا۔ اسے یہ تب یاد رہتا جب یہ اس کے ساتھ پہلی بار ہوتا۔ اتنے سالوں میں ہنہ ایسے ہی تو ہوتا آیا تھا کہ اسے مسترد کی ہوئی چیزیں بڑا احسان جتلا کر دے دی جاتی تھیں۔ کئی بار تو دو سروں کی ازن بھی۔

موسم ایک بار پھر اسے دھوکا دے گیا تھا۔ وہ اپنے کپڑوں میں گرم کپڑے۔ اگر اس کے پاس کچھ تھے تو وہ ساتھ رکھنا بھول گئی تھی اور اب اس کاشن کے گھسے ہوئے سوٹ میں اس کے دانت بچنے لگے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ آہان جو لمحہ بہ لمحہ تاریک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آج صبح ہونے سے پہلے ضرور برے گا اور وہ سردی کتنی تکلیف دہ ہوگی۔

کتنے دنوں تک تو کسی کو نظری نہیں آئے گا کہ اس کے جسم پر کوئی گرم کپڑا نہیں ہے اور جب نظر آئے گا تو بھی بہت سے دن نظریں چرانے میں گزر جائیں گے اور پھر وہی سولہ مارچ آجائے گی۔ ایک اور منحوس سولہ مارچ۔

وہ ایک دم سے اٹھی اور بھاتی ہوئی کھلے گیٹ سے باہر نکل گئی۔ سمت کا تعین کیے بغیر اندھا وھند وہ اندھیرے میں بھاتی چلی جا رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ایک لڑکی کا یوں اندھیرے میں رات کے اس حصے میں اکیلے بھاگنا اور بھاگتے چلے جانا کیسا ہے مگر اس وقت وہ کچھ نہیں سوچ رہی تھی۔ صرف بھاگ رہی تھی۔ بھاگتے بھاگتے اس کے قدم بے اختیار رک گئے۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگی۔



اس کا جسم زخمی نہیں تھا۔ لیکن جیسے جوڑ جوڑ میں درد، تکلیف اور اذیت کی شدت اتر آئی تھی۔ نہ جانے کتنے گھنٹے، کتنے منٹ، لمحے یا شاید پوری رات گزر چکی تھی۔ اسے یوں اکڑی ہوئی دیوار کے ساتھ اکڑ کر بیٹھے۔

باہر گھرانے اور گھیر خاموشی تھی کہ دور کہیں کتا زور سے بھونکا اور اس کے ذرا دیر بعد کوئی گیدڑ بڑی بری طرح سے دھارتا تھا۔ اس کے رونے کی آوازیوں تھی جیسے کوئی فوج کہا ہو۔ بے اختیار اس نے اپنے کندھے کو چھوا۔ جہاں سے قمیص نیچے تک پھٹ چکی تھی اور دکھن کا احساس۔ اس کے منہ سے بے اختیار کراہ نکلی۔

”میرا دلہنا... چاؤ۔ کہاں ہے؟“ اس نے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ کہیں کتا کچھ نہیں تھا۔ سردی سے اس کا پورا دکھتا ہوا بدن اکڑا ہوا تھا۔ نم ماربل کے فرش سے خنکی پھوٹ رہی تھی۔

اور عاصمہ کو یوں لگا۔ اس پر باہر جانے کا ہر راستہ بند ہو گیا ہے۔ وہ جیسے پتھر سی گئی۔ ”آجائیں۔ اریبہ کو یہیں رہنے دیں۔ ہم ذرا سی دیر میں گھر دیکھ کر واپس چلتے ہیں۔ یہ کافی گہری نیند سو رہے۔“ زبیر دروازہ کھولے اس سے کہہ رہا تھا۔

”میں اب گھر نہیں دیکھنا چاہتی۔“ اس نے لمبے لمبے کو مضبوط کرنا چاہا۔ ”کیونکہ مجھے یہ گھر نہیں لیتا۔ آپ پلیر مجھے واپس لے چلیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔“ اس نے اگلی سیٹ کی پشت کو بہت مضبوطی سے یوں تھام لیا جیسے اس سے بڑا اور مضبوط سہارا اور کوئی بھی نہیں۔

”دو منٹ لگیں گے بھابھی! اب اتنی دور آئے ہیں تو بس ایک نظر دیکھ لیں۔ چاہے نہ خریدیں۔ اور میرا بھی یہی خیال ہے کہ چھوٹے بچوں کے ساتھ اتنی دور گھر لینا مناسب نہیں ہوگا۔“ اس کے لمبے لمبے جھول نہیں تھا۔

”تو پھر واپس چلتے ہیں۔ کیا ضرورت ہے دیکھنے کی؟“ وہ اور رکھائی سے بولی۔ ”آپ پلیر واپس چلیں۔“ ”آجائیں نا! میں کہہ رہا ہوں آپ سے دو منٹ لگیں گے بس۔ ہو سکتا ہے گھر واقعی آپ کو پسند آجائے۔ آپ یوں ہی ضد لگا کر بیٹھی رہیں گی تو ہم لیٹ ہوتے رہیں گے۔ بہتر ہے مزید ٹائم ضائع نہ کریں۔ مجھے ایک ضروری کام سے بھی جانا ہے۔ آپ کی وجہ سے پہلے ہی خاصا لیٹ ہو چکا ہوں میں۔“ اس نے لمبے لمبے سارے احسانوں کو جتانے والا انداز سمویا تو عاصمہ جیسے ٹھنک کر رہ گئی۔

”آئندہ زندگی بھر کے لیے سبق ملا ہے۔ کبھی ایسا رسک نہیں لیتا۔ یوں اکیلے کسی غیر آدمی کے ساتھ نہ لگانا چاہے کتنا ہی ضروری کام کیوں نہ ہو۔ کبھی نہیں۔“ وہ خود کو ڈیپٹی جھڑکتی بظاہر محتاط سی گھر کے اندر داخل ہوئی۔ پہلا کمر شاید لاؤنج تھا۔ خوب صورت ٹائلوں اور لکڑی کے کام سے مزین۔ مگر اس لمحے عاصمہ کے دل کو کچھ بھی نہیں بھارا تھا۔ اپنے گھر کی خواہش جیسے کہیں مری گئی تھی۔

”کیسا ہے؟“ وہ اس کے قریب پہنچا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی ایک دم سے کمرے میں۔ بلکہ سب طرف اندھیرا ہو گیا۔ دروازہ ایک زوردار دھماکے کے ساتھ بند ہو گیا۔ روشنی کا آخری راستہ بھی۔

عاصمہ کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی۔ لیکن ایک مضبوط ہاتھ نے اس کی آدھی چیخ کا گلا وہیں گھونٹ دیا۔ وہ ایک بہت مضبوط گرفت میں آچکی تھی۔ مچھلی کی طرح تڑپتے ہوئے اس نے خود کو اس گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر اتنے اندھیرے میں اسے دیرانے میں اکیلے پن کا اور اپنی عزت کے لٹ جانے کا بھیاں تک احساس پورا زور لگا کر بھی وہ اسے ایک انچ پرے نہ دھکیل سکی۔ اس کی آنکھیں گہری تاریکی میں روشنی تلاشتے جیسے پھٹ سی گئیں۔ وہ کسی بے جان شے کی طرح دیوار کے ساتھ زمین پہ گرتی چلی گئی اور شیطان کا کام آسان ہو گیا۔

آخری خیال جو اس کے دماغ میں آیا تھا کہ اریبہ گاڑی میں ہے اور اس کے بچے پرانے گھر میں اکیلے۔ اس کے مرنے کے بعد ان چاروں کا کیا بنے گا۔ اسے لگا موت بالکل اس کے پہلو میں اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی ہے اور اس گھور اندھیرے میں اسے دعوت دینے لگی ہے۔

”تم بھی تو اتنے دن عفان کے بغیر جی لیں۔ بچے بھی کسی نہ کسی طرح جی لیں گے۔ تم بس اب کچھ نہیں سوچو۔ صرف میرے بارے میں سوچو۔ اپنی موت کے بارے میں۔“

”اریبہ اریبہ! ایک دم سے اس کے ذہن میں کوئٹہ سا لڑکا۔
 ”اریبہ میری بچی۔ کہیں وہ اسے تو ساتھ نہیں لے گیا۔ نہیں۔ نہیں۔ میں مر جاؤں گی۔ یہی
 گڑبیا۔“ وہ دیوانہ دار اٹھی اور زور سے کسی چیز سے الجھ کر گر گئی تھی۔ اس کے ماتھے پر بری طرح سے چوٹ لگی۔
 اس کی چادر اس کے پیروں میں الجھی تھی۔ وہ چادریوں ہی ہاتھوں میں پکڑے اندازے سے دروازے کی طرف
 بڑھی۔

وہ بند کھڑکی تھی۔ وہ دیواروں کو ٹٹولتے ہوئے آنکھیں پھاڑے اندھیرے میں دروازہ ڈھونڈ رہی تھی۔
 اس کا ہاتھ دروازے کے پینڈل پر پڑا۔ اس نے زور زور سے اسے گھمایا۔ دروازہ کھل گیا۔
 بیخ ہوا کا جھونکا دروازہ کھلتے ہی اندر آیا تھا۔ باہر دھیمی دھیمی روشنی تھی جو کہیں دور سے آ رہی تھی۔
 گیٹ کے پاس جو گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ تھی جہاں اس شیطان نے گاڑی کھڑی کی تھی وہ خالی تھی۔
 وہ دھک سے کھڑی بوکھتی رہ گئی۔

”میری اریبہ۔ میری بچی۔“ وہ سینے پر ہاتھ رکھے اس خالی جگہ کو ایک ٹکدے کی طرح جارہی تھی۔
 ”اریبہ اریبہ!“ اس کے منہ سے چیخوں کے ساتھ نکلا اور وہ پاگلوں کی طرح بند گیٹ کی طرف بڑھی اور
 دوسری بار کھوکھا کر گئی۔

دروازے کے آگے ہلو کے پاس اریبہ اندھی فرش پر پڑی تھی۔ وہ دھک سے رہ گئی اور اس کے پاس وہیں
 فرش پہ بیٹھ گئی۔
 ڈرتے ڈرتے بچی کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کی دھڑکن کو محسوس کرنے لگی۔ بہت خفیف سی دھڑکن چل رہی
 تھی۔ وہ ابھی تک بے سدھ تھی یا بے ہوش۔ جانے اس نے کیسا نشہ آور چاکلیٹ اسے کھلایا تھا۔
 اس نے بے اختیار اریبہ کو اٹھا کر اپنی چھاتی کے ساتھ بھینچ لیا۔ جیسے کوئی برف کی اکڑی ہوئی سل اس نے سینے
 سے لگائی ہو۔

اریبہ کا لمحہ بہ لمحہ سرد پڑتا وجود اسے ہراساں کیے دے رہا تھا۔ ”مگر یہاں سے کنوئس پتا نہیں ملتی ہے یا نہیں
 یا کتنی دور۔ تو کیا میں اس طرح تنگ پادوں جاؤں گی؟“ وہ متذبذب کھڑی تھی۔
 دور کہیں وہی گیدڑ پھر رو رہا تھا۔ عاصمہ کا دل جیسے بیٹھ سا گیا۔ اس نے گیٹ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

تھکاوٹ اس کی رگ رگ میں دوڑ رہی تھی کہ اب اس سے ایک قدم بھی اٹھانا محال ہو رہا تھا۔ بس دل چاہ رہا
 تھا۔ یہیں سڑک پر آتی پالتی مار کر بیٹھ جائے۔ کسی پتھر سے کمر ٹکا کر ہمیشہ کے لیے گری نیند سو جائے۔
 ”یا اللہ تو نے اوم کی زندگی کو اتنا مشکل کیوں بنایا؟“ شکوہ کرنا اس کی عادت نہیں تھا۔ مگر آج جیسے اس کا دل بھر
 سا آیا تھا۔

دن بھر کی لا حاصل جدوجہد۔ سینے سے لگا بے کار کانڈوں کا پلندہ۔ یہ ذرا سا بوجھ اسے اٹھا کر چلنا محال ہو رہا
 تھا۔
 بس جی یہ ہی چاہ رہا تھا کہ ان کانڈوں کو کسی بھی گندے نالے میں پھینک دے یا جلا ڈالے۔
 اسے پتا تھا ابھی تو وہ یہ تھکن اکیلا ہی جھیل رہا ہے۔ جب گھر پہنچے گا تو اس کی منتظر آنکھوں میں بھی تھکن از
 جائے گی۔ سو منتظر آنکھیں بن کے اس کے دل کا سارا احوال پڑھ لیں گی۔
 ”آخر ایسا کب تک ہوتا رہے گا۔ کب تک؟“

قدم جیسے من من بھر کے ہو رہے تھے۔ چلنا محال اور رکنا اس سے بھی مشکل۔
 گرد سے اٹنے جو توں کو دیکھتے وہ بے اختیار کسی سے ٹکرایا اور لمحہ بھر کو لڑکھڑا کر رہ گیا۔
 وہ بھی کسی خوف زدہ ہرن کی طرح آنکھیں پھاڑے اس کی بانہوں کے سارے تیشہیلی اس کے سینے سے لگی
 کئی تھی۔

اور وہ تو جیسے حیرت اور خوشی سے پتھر کا ہو کر رہ گیا تھا۔
 اس قابل نفرت تھکے ہوئے دن کے اختتام پر ایسی انوکھی خوشی اسے مل سکتی ہے۔ یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں
 تھا۔

اس کے خواب یوں مجسم ہو کر اس کے اتنے قریب بھی آسکتے ہیں۔ وہ اسے محض ایک خیال، ایک خواب ہی تو
 سمجھتا تھا۔ مگر اس کے ریشمی بال ہوا سے سرسراتے اس کے گالوں کو چھونے لگے تھے اس کی آنکھیں جیسے
 نمور ہونے لگیں۔

دوسرے لمحے اسے زور کا جھٹکا لگا۔
 وہ تیزی سے اسے پرے دھکا دے کر جس اندھیری سمیت سے آئی تھی اسی میں کہیں گم ہو کر اندھیرے کا حصہ
 بن گئی۔

اور وہ تو جیسے وہاں سے ہلنا بھی بھول گیا کہ بت کی طرح ساکت بے حس کھڑا تھا۔ ہلکی ہلکی سی اس کے بدن اور
 لباس کی باس ابھی تک اس کے کہیں آس پاس ہی تو تھی۔

اس نے آنکھیں بند کر کے اپنے ہاتھوں کو آنکھوں سے چھوا۔ اس کے ہاتھوں میں اس کا ایک ریشمی سیاہ بال
 رہ گیا تھا۔ اسے لگا جیسے اسے ساری دنیا کے خزانے مل گئے ہوں۔ اس بال کو دیکھتے ہوئے سرشار سا وہ کہیں اور ہی
 پرواز کر رہا تھا۔ اس کی تھکن ان چند خواب آگئیں لمحوں نے چن لی تھی۔



ایسا تو اس کے ساتھ زندگی میں کبھی بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ راستہ بھول جائے۔ ایسا نادان بھی نہیں تھا بے عقل
 بھی نہیں اور بھٹکتا تو بالکل بھی نہیں۔ اس کے حافظے کا تو یہ حال تھا کہ جس سڑک، گلی سے ایک بار گزر جاتا دوبارہ
 اسے کبھی نہیں بھولتی تھی۔

اور آج عدیل اس سوسائٹی میں داخل ہوتے ہوئے جانے کیسے یہاں سے باہر نکلنے کا وہ ایسی کار راستہ بھول گیا اور
 اس پر مستزاد کہ اس کے پاس سیل فون بھی نہیں تھا۔

گتے راستے، سڑکیں، گلیاں بدلیں اور پھر سے انہیں وہ گزاروں پر آجاتا۔ جہاں سے کچھ دیر پہلے گزر کر گیا تھا۔
 فیول، اینڈیکیشن بھی خطرے کا نشان بنا ہوا تھا۔ مگر سست۔ وہ اب تھک بھی چکا تھا اور ذہنی طور پر کوفت کا شکار
 بھی۔ اس کی گاڑی کے آگے سیاہ چادر میں لپٹا کوئی خوب ابھرا ہوا وجود آن کھڑا ہوا۔ اگر وہ جمالی لیتے ہوئے بے
 اختیار چونک کر بریک نہ لگاتا تو شاید اب تک وہ اس وجود کو چیل بھی چکا ہوتا۔ اس نے سخت غصہ میں بریک
 لگائے۔

وہ کوئی عورت تھی۔ جس نے آٹھ سے زیادہ جسم اپنی بڑی سی سیاہ چادر میں چھپا رکھا تھا۔ اس نے گود میں
 کوئی بچہ اٹھا رکھا تھا شاید۔

رات کے اس پہرے۔ گیارہ بج چکے تھے۔ یہاں اس دیرانے میں تو سمجھو رات کا تیسرا پہرہ لگا تھا۔ وہ ڈر سا گیا۔
 ”لی بی! کیا مرنے کا شوق چرا لیا ہے؟ وہ بھی اس دیرانے میں؟“ وہ بظاہر سخت لہجے میں بولا۔

وہ کسی بہت کی طرح خاموش تھی۔ سیاہ چادر میں اس کی آنکھیں اور کھڑی ناک کا اندازہ ہو رہا تھا۔
 ”ہیں راستے سے۔ کہیں اور جا کر خود کشی کریں۔“ وہ کچھ خائف سے لمحے میں کہہ کر گاڑی اشارت کر کے
 جانے لگا۔

عاصمہ نے خوف زدہ نظروں سے دور تک پھیلے تھنگھور اندھیرے، سردی اور اس دیرانے کو دیکھا۔ وہ روتی ہوئی
 بھی چلتی رہتی تو بھی گھر تک نہ پہنچ پاتی۔ اتنا اندازہ تو اسے ہو ہی گیا تھا۔

”پلیز۔ پلیز۔ مجھے صرف۔۔۔ میں روڈ تک چھوڑ دیں۔۔۔ میری بیٹی بیمار ہے۔ اسے ڈاکٹر۔۔۔ اسپتال۔۔۔
 جانا ہے اور کوئی کنویں نہیں۔ مجبوراً مجھے۔۔۔ پلیز۔“ وہ بے اختیار اس کی طرف کی کھڑکی میں جھانک کر گزرتا
 ہوئے بولی۔

”تو آپ کے گھر والے کہاں ہیں۔ جو آپ یوں اکیلی اس دیرانے میں بچی کو ساتھ لے کر نکل پڑی ہیں۔“ عدیل

کا دماغ ابھی بھی فلفلی فلفلی تھا اس عورت کے بارے میں۔ یہاں کہتی ہی ایسے دیرانوں میں راتوں کو بچھل
 پیرپاں نکلا کرتی ہیں اور اس نے کون سی بچھل پیری دیکھ رکھی تھی۔ یقیناً ”کچھ ایسی شکل و صورت اور حلیے کی
 ہوتی ہوگی۔“

”سوری میں خود لٹ ہو چکا ہوں، آپ کوئی اور۔۔۔“ وہ رسک نہیں لے سکتا۔ رکھائی سے کہہ کر گاڑی لے
 جانے لگا۔

”آپ کو خدا۔۔۔ خدا کا واسطہ۔۔۔ آپ کو اپنی ماں، بہن، بیوی اگر آپ کی کوئی بیٹی ہے تو اس کے صدقے پلیز۔
 میں یہاں اکیلی ہوں، میرے شوہر کا کچھ دن پہلے انتقال ہوا ہے ورنہ۔۔۔“ اس کے گلے میں پھندا سا پڑ گیا۔

”تو یہاں کیا کر رہی ہیں آپ؟“ وہ جھنجھلا کر بولا۔
 ”سمجھیں میری بد نصیبی مجھے یہاں گھیر کر لے آئی۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

”کیا مطلب۔۔۔ آپ یہاں کسی سے ملنے آئی تھیں؟“ وہ اسے بخور دیکھ کر بولا۔ ہو سکتا ہے یہ عورت کسی گینگ
 کی رکن ہو اور اس کے ساتھی ہمیں کہیں دیرانے میں۔ اس نے خوب ہوشیار نظروں سے اوہرا دھر دیکھا۔

فی الحال تو ان دونوں کے سوا وہاں اور کوئی ذی روح نہیں تھا۔
 ”میں آپ کو راستے میں ہی بتا دوں گی، میری بیٹی ٹھیک نہیں۔ اسے مجھے ڈاکٹر کو دکھانا ہے۔ پلیز۔ چلیں آپ

مجھے مین روڈ پر اتار دیجئے گا۔ میں کوئی کنویں لے لوں گی۔“ وہ مجبوری اور بے چارگی کی انتہا پر تھی۔ ورنہ جانتی
 تھی۔ اس کا شوڈر بیگ جس میں چند سو روپے تھے۔ اسی منحوس گھر میں کہیں رہ گیا۔ وہ کنویں کہاں لے سکتی

تھی۔
 عدیل نے لمحہ بھر کچھ سوچا اور پھر پھلا دروازہ کھول دیا۔
 وہ تیزی سے اربہ کو گود میں سمیٹے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

اور صد شکر کہ وہاں مکمل اندھیرا تھا۔ اگر وہ اس کو ننگے پاؤں دیکھ لیتا تو یقیناً اسے کوئی چڑیل ہی سمجھتا۔
 اس نے اپنے تئیں مستہ اور جگہ جگہ کانٹوں، پتھروں سے زخمی پیروں کو گاڑی کی سیٹس پر جوڑ کر رکھ لیا۔

عدیل نے گاڑی چلا دی اور دل میں دعا مانگنے لگا کہ اب اسے صحیح راستہ مل جائے۔ اتنی دیر سے تو وہ ایکڑوں،
 پھیلی سوسائٹی میں بھٹک رہا تھا۔ اب بھی اگر راستہ نہ مل سکا تو یہ عورت جانے کیا سمجھے گی۔

”آپ نے بتایا نہیں، آپ یہاں کیا کرنے آئی تھیں؟“ وہ اپنی کمزوری کو چھپاتے ہوئے بیک ویو مرڈ میں
 عاصمہ کو دیکھتے ہوئے بولا، جو کونے میں بیٹھے ہوئے خود کو سمیٹے جا رہی تھی۔ کچھ غیر معمولی ہی تھا اس کا یوں خود کو

چھپانے میں عدیل کو پہلی بار کچھ عجیب سا احساس ہوا۔

”بس یہاں کسی نے کھر کا بتایا تھا کہ سستا اور اچھا مل رہا ہے۔ میں اکیلی آئی تھی۔ واپسی پر رستہ بھول گئی۔“ وہ
 نظریں جھکائے کانپتی آواز میں بے حد آہستگی سے بولی۔ اور عدیل ایک دم سے شاکڈ سا ہو گیا۔
 بالکل سامنے مین روڈ کے سائین بورڈ چمک رہے تھے۔

اس نے خدا کا شکر ادا کرنے کے ساتھ دل میں اس عورت کا بھی شکر یہ ادا کیا۔ شاید اس کی مدد کرنے کی وجہ
 سے اسے کھویا ہوا رستہ مل گیا تھا۔ وہ عورت اب بچی کے اوپر چہرہ جھکائے بے حس بیٹھی تھی۔

”آپ کی بچی کو کیا ہوا ہے؟“ اسے خیال آیا تو پوچھ بیٹھا۔
 ”بہت گہری نیند میں ہے۔ میرے ہلانے پر بھی نہیں اٹھ رہی۔“ وہ رندھے گلے سے بولی تو عدیل کو اندازہ ہوا وہ
 رو رہی تھی۔

عدیل اب سمجھن بھری نظروں سے دیکھنے لگا کہ آخر اس عورت کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔

”یہاں قریب ہی میں ایک ڈاکٹر کا کلینک ہے۔ شاید کھلا ہو، اگر آپ کہتی ہیں تو پہلے ہمیں چیک کرا لیتے ہیں بچی
 کو۔“ وہ ہمدردی سے بولا۔ دل میں ہی احساس نشکر تھا کہ اس عورت کی وجہ سے ہی وہ اس سوسائٹی سے باہر تو نکل
 سکا۔

”نہیں شکریہ۔۔۔ میرے خیال میں یہ یوں ہی سو رہی ہے اور کوئی وجہ نہیں۔ گھر جا کر اٹھاؤں گی تو اٹھ جائے گی۔
 آپ پلیز مجھے کسی اسٹاپ پر اتار دیں، آپ کی اتنی ہمد کا بہت شکریہ۔“

سڑکوں پر اکاڈا دوڑتی گاڑیوں اور لوگوں کو دیکھ کر اسے کچھ اطمینان سا ہوا تھا کہ وہ اب گھر پہنچ سکتی ہے۔
 ”کوئی بات نہیں، میں آپ کو آپ کے گھر ڈراپ کر دیتا ہوں۔ آپ مجھے ایڈریس سمجھاویں۔“ وہ مروت سے
 بولا۔

”آپ کو تکلیف ہوگی۔ میں یہاں سے کوئی رکشالے لوں گی۔“ وہ بار بار اپنے چہرے کو چھپا رہی تھی۔
 ”ایسا کچھ نہیں اس وقت آپ کو معلوم نہیں کوئی رکشا وغیرہ ملتا ہے یا نہیں، میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔“ وہ

اصرار سے بولا تو عاصمہ چپ کر گئی۔
 وہ بار بار غیر ارادی طور پر اپنے کندھے کو چادر سے ڈھانپتے ہوئے چھو چھو کر دیکھتی تھی۔ عدیل اسے دیکھتے
 ہوئے کچھ سوچنے لگا۔ وہ راستے میں اسے ایڈریس سمجھاتی رہی۔

اس کے گھر کے آگے اس نے گاڑی روکی تو وہ اسی طرح بچی کو گود میں سمیٹتے ہوئے گاڑی سے اتر گئی۔
 ”آپ کا بہت شکریہ۔ آپ کا یہ احسان۔ میں اس کا بدل نہیں دے سکتی۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔ اللہ

حافظ۔“ کہہ کر وہ عدیل کی طرف دیکھے بغیر چھوٹے سے دروازے کے پہلو میں لگی ڈور بیل دبا کر منہ دروازے کی
 طرف کر کے ہی کھڑی رہی۔

عدیل دروازہ کھلنے کے انتظار میں کھڑا رہا اور گاڑی ریورس کرتے ہوئے وہ بے اختیار چونک کر رہ گیا۔
 وہ عورت ننگے پاؤں تھی۔ اس کی قمیص کا پچھلا دامن ایک طرف سے پھٹ کر نیچے لٹک رہا تھا۔
 وہ کھڑا دیکھتا رہ گیا۔

دروازہ کھل گیا تھا۔ ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا دروازے میں کھڑا تھا۔ دو سرے لمحے وہ اس عورت سے چمٹ گیا
 اور وہ اسے ساتھ لگائے اندر دھکیلتے ہوئے گیٹ بند کر کے اندر چلی گئی۔

عدیل کتنی دیر وہیں کھڑا رہا۔
 ”یقیناً اس عورت کے ساتھ کوئی بہت ناخوشگوار واقعہ ہوا ہے۔ بہت برا اور بدترین۔“

وہ چاہتے ہوئے بھی وہ کچھ نہیں سوچتا چاہتا تھا جو اس کا دل اسے سمجھا رہا تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ نادرہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہانی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ ڈاؤن لوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ایب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورٹ سے بھی ڈاؤن لوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤن لوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤن لوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہر ویب سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤن لوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

وہ سوسائٹی کتنی دیران ہے اور رات کے اس پہ اس عورت کا یوں اکیلے، تنگے پاؤں، پھینے کپڑوں کے ساتھ میرے خدایا۔ بے چاری دیکھنے میں اچھے گھر کی لگتی تھی اور وہ کہہ رہی تھی کہ اس کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے وہاں کوئی گھر دیکھنے گئی تھی۔ یقیناً "کتنی نے گھر کا جھانسا دے کر اس غریب کو لوٹ لیا ہے۔ لختہ بھر میں پوری کتا اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔

گھر پھر بھی وہ یہ سب کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ جانے کس درندے سے اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھایا ہو گا۔ خدا سے غارت کرے وہ افسرہ سا گاڑی تیز رفتاری سے لے گیا۔

”مما پلیز۔ نکل بھی آئیں اتنی شدید سردی میں آپ کیوں نہ سائے جا رہی ہیں۔ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔ بیمار ہو جائیں گی آپ۔“ واثق وقفہ وقفے سے ہاتھ روم کے دروازے پر آکر پریشان آواز میں ماں کو پکارے جا رہا تھا اور عاصمہ جیسے کچھ بھی نہیں سن رہی تھی۔

وہ نچ پالی کے شاور کے نیچے کپڑوں سمیت بھگتے ہوئے منہ کے آگے ہاتھ رکھے اپنی چیخوں کو روکتے ہوئے روئے جا رہی تھی۔

ایک ہی کمرہ منظر بار بار اس کی نظروں کے سامنے آئے جا رہا تھا اور زور زور سے اپنا چہرہ ہاتھ بازور گڑنے لگتی اور پھر جیسے بے بس سی ہو کر اور بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔

اس کی بیوگی کو عدت میں ہی داغ لگ گیا تھا اور یہ سب کچھ اس کی نادانی کی وجہ سے ہوا تھا وہ خود کو کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ اگر اس کے بچوں کو پتا چل جائے۔ اگر غلیظ انسان اسے بلیک میل کرنے لگے تو اس کے پاس کیا بچے گا۔

خود کو چھپانے اور ڈھنسنے کے لیے بیوگی کی چادر بھی نہیں۔ ابھی تو اس کے شوہر کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا کہ اس نے اس کی ناموس کو کچھڑ میں ملا دیا۔ گھر کی ہوس میں اس نے عدت کے دوران گھر کی وہلیز سے نکلنے ہوئے کچھ بھی نہیں سوچا۔ کچھ بھی نہیں۔

وہ خود کو معاف نہیں کر سکتی۔ اسے اس گندے وجود کے ساتھ زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ اس پر صاف ستھری زندگی کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ اسے مرجانا چاہیے۔ مرجانا چاہیے۔

وہ ٹھنڈے کیلے فرش پر شاور کے نیچے بیٹھ گئی اور خود کو ختم کرنے کے طریقے سوچنے لگی۔

عدیل شاکد سا اسپتال کے سفید بستری بہت سی مشینوں اور ٹالیوں کے ساتھ جگڑی ماں کو دکھتا جا رہا تھا۔ فوزیہ کی طلاق اس کے لیے دوسرا بڑا دھچکا تھا مگر ماں کی یہ حالت جس کی وجہ سے ہوئی کاش وہ اتنا مذہب اتنا سلجھا ہوا، بڑھا لکھا نکل بڑداشت والا بزدل انسان نہ ہوتا تو ابھی جا کر اس ظمیر اور اس کی دکان دار ماں کے سینے میں پستول کی ساری گولیاں اتار دیتا۔

لوگ اتنے بے رحم بھی ہو سکتے ہیں اسے آج سے پہلے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا۔ لیکن نہیں ایک بے رحمی کا بہت بھیانک منظر تو ابھی وہ دیکھ کر آ رہا تھا۔ جو ظلم اس عورت کے ساتھ ہوا وہ بھی تو کم نہیں تھا اور جو عدیل کی ماں بہن کے ساتھ ہوا۔

اس نے بشری کو گھر بھیج دیا تھا مگر خود اسے چین نہیں آیا تھا۔ فوزیہ کی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے

اسے غیند اور انجکشن لگایا تھا مگر جب وہ جاگے گی۔ اسے سنبھلنے میں اپنا قصور سمجھنے میں کتنے دن لگیں گے۔
”اور امی کو میں کیسے سنبھالوں گا۔ میری ساری کوششیں بے کار گئیں۔“ وہ تھکا ہوا وہیں آنکھیں موند کر بیٹھ گیا۔

اگلے روز وہ تیز بخار میں جھنک رہی تھی۔

چاروں بچے اس کے ارد گرد پریشان صورتیں لیے بیٹھے تھے اور وہ ان کی موجودگی کے خیال سے آنکھوں پر بازو رکھے بدن کی ٹیسوں کو دبائے ہوئے تھی۔
وہ آج انہیں اسکول بھی نہیں بھیج سکی تھی۔ اربیب صبح اٹھی تو بہت مست اور ہڈھال سی تھی۔ اسے ہلکا ہلکا ٹمپیرچر بھی تھا۔ وہ تو خود سے بھی نظریں نہیں ملارہی تھی۔

”نہیں۔ اسے اب زندہ نہیں رہنا باپ کے بغیر بھی تو یہ رہ رہے ہیں تا میرے بغیر بھی رہ لیں گے۔“ وہ دل میں پکارا وہ کر رہی تھی۔

”مما! ورنہ روئے جا رہی ہے۔ اس نے فیڈر بھی نہیں پیا۔ کچھ کھایا بھی نہیں۔ بتائیں میں اسے کیسے چپ کرواؤں۔“ واثق روتی ورنہ کو خاموش کرانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہا تھا۔ عاجز سا آکر بولا۔
”اسے دوسرے کمرے میں لے جا کر سلا دو وہاں نیند کا سیرپ پڑا ہے وہ ایک چمچ چوے دو اسے سو جائے گی۔“ اسی طرح آنکھوں پر ہاتھ رکھے سرو بے نیاز لہجے میں بولی۔

”مما! یہ صبح سے بھوکی ہے۔ نیند کے سیرپ سے اس کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔“ واثق پریشانی سے بولا۔
”مرو تو نہیں جائے گی نا۔ یا تم مر جاؤ گے اس کو سنبھالتے ہوئے۔ نہیں سنبھلتی تو مجھے کہیں سے زہر لادو میں کھا کر سو رہوں۔ خود تو اپنی جان چھڑا کر قبر میں جا سونے سب مصیبتیں میرے لیے چھوڑ گئے۔ سیکھو اکیلا رہنا میرے بغیر بھی۔ میں بھی ہمیشہ تم لوگوں کا ساتھ نہیں رہوں گی۔“ وہ پتا نہیں کیسے اپنا ضبط کھو بیٹھی اور غصے میں بھری بولتی چلی گئی۔

”اگر ماما واقعی ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں تو میں ان تینوں کو اور خود کو کیسے سنبھالوں گا۔“ واثق ایک دم سے ڈر سا گیا۔

”مما! میں ڈاکٹر کو بلا کر لے آؤں۔ آپ کی طبیعت اچھی نہیں۔ وہ چیک کر لے گا۔“ وہ ڈرے ہوئے انداز میں بولا۔

”خراب بھی ہو جائے گی تو بھی اتنی جلدی مرنے والی نہیں۔ بہت سخت جاں ہوں میں۔ بے فکر ہو جاؤ۔ موت مجھ پر مہربان نہیں ہوگی۔“ وہ سخت اذیت پسند ہو رہی تھی۔

”اور خدا کے لیے اس بددہ کو لے جاؤ یہاں سے ورنہ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔“ ورنہ کے مسلسل رونے پر وہ زور سے بولی تو واثق اور اربیب جلدی سے ورنہ کو لے کر باہر نکل گئے۔

اربیب سہمی ہوئی نظروں سے ماں کو دیکھنے لگی۔ عاصمہ نے پھر آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔
اگر اربیب ہوش میں ہوتی اور سب کچھ دیکھا ہوتا اس نے تو شاید میرے لیے مرنے کا فیصلہ کرنا اور بھی آسان ہو جاتا۔

”کیا کروں کیسے مردوں؟ ان چاروں کو کس کے حوالے کر کے جاؤں۔“ ہر گرم گرم آنسو اس کی آنکھوں سے پھیلتے گئے۔

ورنہ کے رونے کی آواز بند ہو گئی تھی۔ شاید واثق اسے باہر لے گیا تھا۔ وہ صبح سے بھوکی تھی۔ رو کر احتجاج کر

رہی تھی اور یہ تینوں بچی تو بھوکے ہیں۔ تھوڑے سمجھ دار ہیں۔ اس لیے ورنہ کی طرح رو نہیں رہے۔
”میرے اللہ میں کیا کروں۔“
اس کے آنسو اور بھی شدت سے بننے لگے۔



”بے شک میری بیٹی کی قسمت میں ہی لکھا تھا کہ وہ گھر بیٹھے طلاق کا داغ ماتھے پر لگالے لیکن میں سمجھتی ہوں اس میں ہمارے شریکوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔“ نسیم بیگم ابھی مکمل طور پر روبرو صحت نہیں ہوئی تھیں۔ ذکیہ بڑی، عمران، عدیل، ان کے پاس ہی اسپتال میں بیٹھے تھے جب تک کیوں سے ٹیک لگائے ہوئے وہ نقاہت زدہ لہجے میں بولی۔

”پلیز امی! بھول جائیں۔ وہ لوگ میری بہن کے لائق ہی نہیں تھے۔ وہ تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا ذکر بھی کیا جائے۔“ عدیل نے ماں کو سمجھانا چاہا۔

”تم بھول سکتے ہو۔ فوزیہ تمہارے جگر کا ٹکڑا نہیں۔ میں نہیں بھول سکتی نہ معاف کر سکتی ہوں۔ جن کی وجہ سے میری معصوم بے گناہ بچی کو یہ کالا دن دکھانا پڑا۔“ نسیم بیگم کے لہجے میں پہلے والی سختی اور آئی تھی۔
”امی! ڈاکٹر نے آپ کو بہت بولنے اور ٹینشن لینے سے منع کیا ہے پلیز! ابھی کچھ نہیں سوچیں۔“ بشری نرمی سے ان کے بال سہلا کر بولی۔

”ہاں تم تو یہ کہو گی تمہارا زیور سمجھو واپس آ گیا۔ دو چار ہفتوں میں ہی یہ عدیل تمہیں نیاز یور بنا دے گا۔ سب کے تہسان پورے ہو جائیں گے بس ایک میری فوزیہ کا نقصان۔“ وہ رندھے گلے سے بولیں۔
”امی پلیز۔“ عدیل نے ماں کو دلاسا دینا چاہا۔

”مگر میں ان لوگوں کو معاف نہیں کروں گی جن کی وجہ سے میری بچی پر یہ داغ لگا۔“ وہ سیدھا ذکیہ اور عمران کی طرف دیکھتے ہوئے بے چنگ لہجے میں بولیں۔

”بہن! کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔ اللہ نے اس میں بھی فوزیہ بیٹی کے لیے کوئی بہتری رکھی ہوگی۔“ اب ذکیہ کو کچھ تو بولنا تھا۔

”طلاق میں بہتری۔۔۔۔۔“ وہ جیسے تمسخر سے بولیں۔ ”پھر تو خدا انخواستہ تمہاری بیٹی کو طلاق ہو جائے تو اس میں بچی اللہ کی کوئی بہتری ہوگی کیوں اب کیا کہو گی۔“

اور ذکیہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اتنا سیدھا دار کریں گی وہ سرخ چہرے کے ساتھ سمدھن کو دیکھ کر لگیں۔

عدیل اور بشری نے بھی ناگواری سے ان کی طرف دیکھا۔

عاصمہ پتھرائی ہوئی نظروں سے سامنے بیٹھی حسد کو دیکھتی رہ گئی۔

”ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے عاصمہ کہ تم ایسی نکلو گی۔ اور تم خدا انخواستہ اس دنیا میں پہلی بیوہ تو نہیں ہوتی ہو یہ قیامت تو ہر جو تھے پانچویں گھر میں ٹوٹی ہے جو ان کل کی بیباہی شوہروں کے کفن کی لالچ سمیٹے عمریں گزار رہی ہیں اور تم نے چند دنوں میں ان عزت دار شریف لوگوں کی عزت کی کیسی دھجیاں اڑا دیں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم ایسا گندہ دھندہ کرنے لگو گی۔ ایک کی گاڑی میں جاؤ گی دوسرے کی گاڑی میں آدھی رات کے بعد واپس آؤ گی۔“ وہ پتھر کا بت بنی دیکھتی رہ گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ نیا پاکستان سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہرائی بینک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بینک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ایب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہرائی بینک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایپلوڈنگ
- ☆ یریم کوالٹی، نڈل کوالٹی، کیریڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورٹ سے مکی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہرزی سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like Us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

رخسانہ نگار عدنان



عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشری ان کی بوسہ اور ذکیہ بیگم کی بیٹی عمران بشری کا بھائی ہے۔ مثال ڈیکر بیگم کی تو اسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشری اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بھوکا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصلحتاً بیٹا بوسہ سے لگاوت دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشری کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ذکیہ بیگم اپنے بیٹے عمران کے لیے بھی لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔ سب سے پہلے سسرال کی سلسل کو ششوں کے بعد بشری کی نند فوزیہ کا بلاؤز ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشری دو لہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشری کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشری اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو اتنے سے منع کر دیتا ہے۔ بشری اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشری کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گرجبوی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوش خوشی شہر آ رہے ہیں۔ عاصمہ کو فون کے ذریعے کوئی اطلاع ملتی ہے جسے سن کر وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔

فون پر پتا چلتا ہے کہ شہر آتے ہوئے عفان اور فاروق صاحب ذمیت کی واردات میں قتل ہو گئے۔ عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گرجبوی سے سات لاکھ روپے وصول کیاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔



اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقتولین کو دکھاتا ہے۔ زاہدہ نسیم بیگم سے جس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ رخصتی کی بات کرتی ہیں وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشری سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔ حمیدہ خالہ عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زیر کا اٹلے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں۔ جبکہ عاصمہ مجبور ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں اس کا بیٹا ابھی پھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔ وہ جلد ا جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آ جاتا ہے کہ وہ انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔

وہاں اس کی نیت خراب ہو جاتی ہے۔ زیر اسی مکان میں عاصمہ اور اس کی بے ہوش بیٹی اریہ کو چھوڑ کر بھاگ جاتی ہے۔ بہت دیر بعد لٹی بیٹی عاصمہ اریہ کو اٹھائے باہر نکلتی ہے۔ وہیں اسے عدیل مل جاتا ہے۔ عدیل اچھے وقتوں میں لیے گئے پلاٹ کی فروخت کے سلسلے میں ادھر آتا ہے اور راستہ بھٹک جاتا ہے۔ عدیل ہمدردی میں عاصمہ کو اس کے گھر تک چھوڑنے جاتا ہے۔

بروقت مطلوبہ رقم نہ ملنے پر زاہدہ بیگم فوزیہ کو طلاق بھجوا دیتی ہیں۔ نسیم بیگم کو ہارٹ انیک ہو جاتا ہے۔ حمیدہ خالہ عاصمہ پر الزام لگا دیتی ہیں کہ وہ شوہر کے مرنے کے بعد بے حیائی پر اتر آئی ہے۔

چھٹی قسط

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں حمیدہ خالہ!“ عاصمہ کے چہرے کا رنگ ایک دم سے فق ہو گیا۔ وہ بہت دیر بعد بول پائی تھی۔

”بی بی! میں خود سے جوڑ کر یہ کہانی نہیں کہہ رہی۔ سارا اٹلہ ہی باتیں کر رہا ہے۔ ٹھیک ہے میں جانتی ہوں تمہارا مالک مکان جانتا ہے یا وہ چار اڑوس بڑوس کے گھر اور جانتے ہوں گے کہ تم جلد سے جلد اپنا گھر خرید کر اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے کسی چھت کا بندوبست کرنا چاہتی ہو۔ لیکن سارا اٹلہ تو نہیں۔ تم کل شام میں اس زیر کی گاڑی میں بیٹھ کر گئیں اور رات میں... میں تو گہری نیند سو گئی تھی۔ کم بخت اس بار ڈاکٹر نصر اللہ نے جو دوائی دی ہے مجھے معدے کی اس میں نیند کی کوئی بھی ڈال دی ہے اس نے۔ کھاتے ہی ہوش جاتے رہتے ہیں۔ مغرب کے بعد ہی سو گئی تھی۔ رات میں اچانک پیاس سے آنکھ کھلی تو پانی پینے باہر نکلے۔ اسی وقت تمہارے گھر کے آگے گاڑی رکھنے کی آواز آئی۔ یہ ساتھ تو دیوار جڑی ہے۔ میں نے تو صرف یہی سوچ کر دروازہ کھول کر باہر جھانکا کہ پوچھوں عاصمہ! گھر پسند آ گیا۔ پر وہاں تو گاڑی چلانے والا کوئی اور ہی تھا۔ میرا تودل دھک سے رہ گیا۔ اوپر سے وہ مالک مکان کی بیوی بھی دیکھ رہی تھی۔ سامنے والی فردوس اپنے بیمار بچے کو چپ کرانے کے لیے صحن میں شلہ رہی تھی۔ اب بتاؤ! کون کون چپ رہتا میں اگر نہ بھی بولتی تو؟“ وہ نان اسٹاپ بولتے ہوئے ہنسٹل رہی تھیں۔

”زیر بھائی کی گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ زیر جیسے شیطان کو بھائی بولتے ہوئے جیسے اس کی زبان حلق تک کڑوی ہوئی تھی یہ صرف وہی جانتی تھی۔

انہوں نے فون کر کے اسے کسی دوست کو بلوایا۔ خود انہیں دیر ہو گئی تھی۔ پیچھے مین روڈ پر ہی اتر کر روکھ لے کر چلے گئے تو وہ صرف مجھے گھر کے آگے۔“ عاصمہ بولتے ہوئے بھی جانتی تھی کہ اس کی کہانی کتنی کمزور اور بوری ہے لیکن اسے کچھ تو کہنا تھا۔ حمیدہ خالہ اسے شک بھری نظروں سے دیکھتی رہیں۔ عاصمہ سے مزید کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ وہ نظریں جھکا کر بول رہی اپنے ناخن کھرچتے لگی۔

”بھئی! ہمارا کام تو تمہیں سمجھانا تھا۔ بلکہ سمجھو خبردار کرنا۔ خیر سے بچوں والی ہو۔ پھر اللہ بخشے تمہارے شوہر اور سر کے ساتھ تو ہمارا بہن بھائی والا رشتہ تھا۔ اسی کی لاج کھائے جاتی ہے۔ لوگ تمہاری طرف انگلیاں اٹھائیں گے تو کیا ہمیں خوشی ہوگی۔ دکھ سے رات سے سمجھو! امیرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے اور اوپر سے دن چڑھے پورے محلے میں چہ گونیاں۔ کوئی اور کے تمہیں۔ میں نے سوچا خود ہی تمہیں جا کر نرم لفظوں میں سمجھاؤں۔ کہ تم از کم عدت کے دن کتنی کے ہوتے ہیں۔ وہ تو عورت پر اس کے مرے ہوئے مرد کا حق ہوتا ہے۔ اور کچھ نہیں تو اس غریب کا یہ حق تو بھلا۔ باقی پھر جو تمہارے حق میں آئے ہم کرنا۔ ہم کون ہوتے ہیں روکنے والے“

کہہ کر چادر تھیک کر کے بغیر سلام دعا کے چلی گئیں۔ عاصمہ کا جی چاہا وہیں زمین پھٹے اور وہ اس میں سا جائے۔ جہاں بیٹھی ہے وہاں سے کبھی اٹھ ہی نہ سکے۔ یہ محلے کی وہ عورت تھی جو جب بھی آتی عاصمہ سے محبت و شفقت سے پیش آتی۔ جیسے عاصمہ کی ماں ہو۔ اس سے اسے گھر کی بسوسوں کی بیٹیوں اور بیٹیوں کی ہر چھپانے والی اور نہ چھپانے والی بات کر جاتی اور آج اس کی نظروں میں جتنی حقارت اور ہلکان تھا عاصمہ کے لیے وہ اس کے لیے ڈوب مرنے کو کاٹی تھا۔

پر کیا کیا جائے کہ ڈوب مرنے بھی تو آسان نہیں تھا۔ وہ تو سو بار مرنے کے طریقے سوچ چکی تھی۔ مگر بیروں میں بڑی چار زنجیریں۔

”مما! یہ حمیدہ آئی کو کیا مسئلہ تھا جو اتنا اونچا اونچا آپ سے بولے جا رہی تھیں اور کس طرح کی باتیں کر رہی تھیں وہ۔ مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگا اور آپ پلینز! ان سے کہہ دیں ہمارے گھرنہ آیا کریں۔ مجھے وہ بالکل اچھی نہیں لگتیں۔“ واٹن معلوم نہیں کب سے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ حمیدہ خالہ کے جاتے ہی اس کے پاس آ کر بولا۔

”تم کیوں چھپ کر باتیں سن رہے تھے۔ تمہیں یہ گندی عادت کہاں سے پڑ گئی؟“ وہ الٹا اس کو جھڑکنے لگی۔ واٹن حیران نظروں سے ماں کو دیکھنے لگا۔

”مما! میں چھپ کر باتیں نہیں سن رہا تھا۔ وہ خود اتنا اونچا بول رہی تھیں۔ سب کو صاف سمجھ میں آ رہا تھا۔ وہ ادب والی آئی بھی کھڑکی میں کھڑی سن رہی تھیں۔ مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔“ پہلے وہ وضاحت دینے لگا۔ پھر اس نے بھی بر ملا اپنے جذبات کا اظہار کر ڈالا۔

عاصمہ نے گن اکھیوں سے اوپر مالک مکان کے پورشن کی ادھ کھلی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ اب وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ مگر کھڑکی کے کھلے ہونے کا مطلب تھا کچھ دیر پہلے وہاں کوئی موجود تھا۔

انسان کبھی اتنا بھی مجبور ہو سکتا ہے عاصمہ نے سوچا نہیں تھا۔ وہ دوبارہ سے واٹن کو جھڑک نہیں سکی۔ یونسی بیٹھے بیٹھے خود کو اور بھی چادر میں چھپانے لگی۔

”مما! کل آپ کو وہ گھر پسند آ گیا تھا جو آپ زیر انکل کے ساتھ دیکھنے گئی تھیں؟“ ماں کو خاموش دیکھ کر واٹن کو لہ پوچھنے والی بات یاد آئی جو وہ کل ماں کے آتے ہی پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر عاصمہ کے عجیب و غریب روپے نے اسے کچھ پوچھنے ہی نہیں دیا تھا۔

وہ اسے خالی خالی نظروں سے دیکھ کر رہ گئی۔

”مما! آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔“ وہ ماں کا کندھا ہلا کر اصرار سے بولا۔ عاصمہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

”نہیں۔“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

”کیا نہیں... آپ کو اچھا نہیں لگا وہ گھر؟“ وہ نا سمجھی سے بولا۔

”نہیں۔ بالکل بھی اچھا نہیں تھا وہ گھر اور اب تم مجھ سے مزید کوئی سوال جواب نہیں کرو گے۔ جا کر اپنا ہوم

ورک کرو اور دونوں ہنوں کو بھی کراؤ۔" وہ اب کے ذرا سخت لہجے میں بولی۔

"مگر ماما! آج تو ہم اسکول ہی نہیں گئے۔ کل جو ہومورک ملا تھا وہ ہم نے کل شام میں کر لیا تھا۔" واٹن بولا۔
تو بڑھنے کو اور کچھ نہیں ہے؟ جاؤ! جا کر پڑھو کچھ۔ کرو جو دل کرتا ہے۔ مگر میرے سر پر کھڑے ہو کر یوں انگواڑی نہیں کرو۔ بروقت کچھ نہ کچھ کریدتے رہتے ہو۔ زہر لگنے لگی ہیں مجھے تمہاری یہ عادتیں۔" وہ غصے میں بولی تو بولتی ہی چلی گئی۔

واٹن کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس نے مزید کچھ بولنے کے لیے منہ کھولا اور بند کر لیا۔ وہ سست روی سے اٹھ کر جانے لگا۔ اسے پھر سے کوئی خیال آیا تو رک گیا۔

عاصمہ آہستگی سے چادر ہٹا کر اپنی کلائی کو دیکھ رہی تھی۔

ماما! وہ انکل زبیر آئیں گے آج؟" وہ وہیں رک کر بوجھ بیٹھا۔

"رفع ہو جاؤ یہاں سے اور مت نام لینا آئندہ اس شخص کا۔ ورنہ میں تمہارا وہ خشرکوں کی کہ تم یاد کرو گے چلے جاؤ اب یہاں سے۔ دن بہ دن وضعیت ہوتے جا رہے ہو۔ خود مر گئے۔ میرے لیے یہ چار عذاب چھوڑ گئے اس سے اچھا تو میں بھی ان کے ساتھ ہی چلی گئی ہوں۔" وہ شدید غصے میں بولتی ہوئی خود ہی اٹھ کر اندر چلی گئی۔

واٹن شاکڈ سماں کو بولوں غصے میں چلائے اور پھر جاتے ہوئے دیکھا رہ گیا۔

"ماما کو کیا ہو گیا ہے انہیں اس طرح تو کبھی غصہ نہیں آیا۔ بلکہ ماما کو تو کبھی بھی غصہ نہیں آتا تھا اور انہوں نے یہ کیوں کہا کہ اس انکل زبیر کا نام دوبارہ ان کے سامنے نہیں لوں؟ کیا ماما کا ان سے کوئی جھگڑا ہوا ہے؟ جھگڑا مگر کیوں ہو گا اور انکل نے تو بس بابا کے آفس کی رقم ماما کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دینی تھی۔ شاید اسی لیے گھر والا معاملہ آگے چلا گیا ہو۔ مجھے زبیر انکل سے فون کر کے بات کرنی چاہیے۔" وہ سوچتے ہوئے خود سے کہنے لگا۔

"لیکن اگر ماما کو پتا چل گیا کہ میں نے زبیر انکل سے۔۔۔ اور حمیدہ خالہ بھی کچھ غلط تو نہیں کہہ رہی تھیں۔ ماما رات کو کسی اور انکل کی گاڑی میں واپس آئی تھیں۔" اسے اس نئی سوچ نے پہلے سے بھی زیادہ پریشان کر دیا۔ اس کا چھوٹا سا ذہن اتنی بڑی تھی سلجھانے سے قاصر تھا۔



"آپ نے سیں باتیں ای کی عدیل؟ حد ہوتی ہے کسی بات کی بھی۔ سہی اور عمران نے کیا نہیں کیا۔ اس سے زیادہ وہ کیا کرتے اور ای سے الٹا احسان مند ہونے کے منکر یہ ادا کرنے کے کیسے اتنے بڑے انداز میں اتنی بڑی بات کہہ ڈالی۔" بشری سخت غصے میں تھی۔ عدیل مثال کو پاس لٹائے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

بشری کی طرف بول دیکھنے لگا۔ جیسے اسے بشری کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔

"اور آپ نے بھی امی سے کچھ نہیں کہا۔ عمران اور ای کتنے شرمندہ ہوئے۔ چاہتے تو فوراً انہیں کوئی بھی سخت جواب دے دیتے۔ مگر سچ بات یوں کسی کو ذلیل کرنا ہماری فیملی کا شیوہ نہیں آپ لوگوں کی طرح۔" وہ غصہ میں ہماری اور ہماری کی حدود جتا گئی۔

عدیل کے ماتھے پر ہل سے بڑھ گئے۔

"آپ تھا! اب تم مجھ سے حساب کتاب شروع کرو۔ میرا داغ پہلے ہی پٹی ہو گیا ہے اس ساری بک بک میں۔ اور ای اس وقت کتنی حساب ہو رہی ہیں۔ ہمیں تو کم از کم اندازہ ہونا چاہیے۔ وہ بیماری کے تکلیف دہ مرحلے

سے گزری ہیں۔ پھر فوزیہ کو طے دانی طلاق۔"

"معاف کیجئے گا۔ اس سارے میں کم سے کم میرا میری ماں بھائی کا کوئی قصور نہیں۔ پھر بھی بار بار آپ کی امی صاحبہ ہیں قصور وار ٹھہرائے چلی جا رہی ہیں۔ میں نے سارا زور دے دیا۔ عمران نے ساٹھ ستر ہزار روپے دیئے اور کیا کرتے ہیں؟" وہاں اور بھائی کی ذلت کو ہنسنے نہیں کہا رہی تھی۔

"پلیز باب تم اس ٹاپک کو چھیچ کر دو گی یا نہیں؟" وہ چڑھ کر بولا۔ مثال ڈری ہوئی نظروں سے باری باری کبھی بشری کو دیکھتی اور کبھی عدیل کو۔ اس کا ننھا سا دل دھڑکنے لگا کہ جیسے ابھی ماما پاپا میں لڑائی شروع ہو جائے گی اور اسے لڑائی جھگڑے سے بہت خوف آتا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"جان ایٹ جاؤ تا۔ آپ کو نیند آرہی ہے۔" عدیل نے اسے پکڑ کر لٹانا چاہا۔

"ماما۔ پلیز بابا سے لڑائی نہیں کریں۔" اس نے نرمی سے ماں کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ بشری کو تو جیسے آگ ہی لگ گئی۔

"میں کر رہی ہوں لڑائی؟ جتنی مرضی تمہارے ساتھ جان مار لوں۔ تم چچی تو باپ اور واوی کی نکلو گی۔ کتنی محبت کرتے ہیں نانی اور ماموں۔ تمہاری ہر فرمائش منہ سے نکلنے سے پہلے پوری کرتے ہیں اور تم پھر بھی ان ہی لوگوں کی سازش لیتا۔ ماں کو بھی برا بھلا کہتا۔" وہ غصے میں بغیر سوچے سمجھے بولتی چلی گئی۔

"تمہارا گل تو نہیں ہو گئیں بشری؟" عدیل کو بھی غصہ آ گیا۔

"میں بالکل ہو گئی ہوں؟ دو سروں کا قصور آپ کو نظر نہیں آتا؟ اور یہ ہماری اپنی بیٹی کیسے جان سے پیاری ہے مجھے۔ اور مجھے کہہ رہی ہے کہ میں جھگڑا کر رہی ہوں۔ فساد ڈال رہی ہوں۔"

"سو سو سو ماما میں نے یہ سب کچھ نہیں کہا۔ پلیز سواری۔" مثال ڈر کر رو دینے کو تھی۔

"جاؤ یہاں سے واوی اور باپ کی چچی! پہلے ان کی فیور کرتی ہو پھر میرے ساتھ ڈرامے کرتی ہو۔" بشری غصے میں بالکل بے قابو ہو رہی تھی۔

"بشری! تم ہوش میں تو ہونا۔ سچی کے ساتھ کس لہجے اور زبان میں بات کر رہی ہو۔ اس نے تم سے ایسا کیا کہہ دیا ہے۔ صرف یہی تو کہا ہے کہ جھگڑا مت کرو۔" عدیل کو بھی غصہ آ گیا وہ مثال کو اپنے ساتھ لگا کر بولا۔

"میں جھگڑتی ہوں۔ میں لڑائی کرتی ہوں۔ آپ کی ماں اور بہن کچھ نہیں کرتیں؟" وہ اور بھی غصے میں چلائے لگی۔ عدیل کو بھی شدید غصہ آ گیا۔

"ظلمت۔ ای اور فوزیہ کو بیچ میں کیوں ٹھیسٹ رہی ہو۔ ان کا یہاں کیا ذکر۔ اپنی بات کرو۔" وہ بھی بغیر سوچے سمجھے بولتا چلا گیا۔

"اپنی بات۔ میری بات رہ ہی کون سی گئی ہے۔ ہر بات میں میں تمہاری ماں بہن موجود ہوتی ہیں۔ انہوں نے ہمارا کچھ رہنے دیا ہی نہیں۔ ان کی خوشی سے جو ان کی خوشی سے مراد۔ اس کی مرضی سے سانس لو۔ ان کی اجازت سے بولو۔ سب کچھ وہی دونوں تو ہیں۔ میں ہوں کہاں۔ نہ میری مرضی نہ میری خوشی۔ میری کسی بات کی بھی پروا ہے آپ کو۔ آپ کی ماں نے اتنی بڑی بات بول دی۔ میری امی دل کی مرضی ہے ان پر کیا بتیگی۔ ایک لمحے کو بھی سوچا انہوں نے جو ان کی بیٹی کو طلاق ہوتی ہے تو یہ اس کا نصیب۔ وہ چاہتی ہیں کہ ساری دنیا کی لڑکیوں کو طلاق ہو جائے۔"

"بند کرو اپنی بکواس۔ میں تنگ آ گیا ہوں تمہاری اس بک بک سے۔ مجھے تو یہی سمجھ میں نہیں آتا تم چاہتی کیا

ہو۔ کون سی خوشی، کون سی مرضی تمہاری میں نے پوری نہیں کی۔ اس کے باوجود تم اس طرح کی بات کرو تو پورے تم سے بڑا ناشکر انسان اور کوئی نہیں ہے۔ یہ تو میرا حوصلہ ہے جو میں تمہیں تمہاری اس ضدی فطرت کو اپنے سالوں سے برداشت کر رہا ہوں۔“ عدیل کی کپٹیاں پھڑک رہی تھیں۔

مثال اڑی رنگت اور خوف زدہ نظروں سے دونوں کو لڑتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ وہ آہستگی سے بیڈ سے بھیڑ گئی تھی اور اب بیڈ کے کونے میں چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا وہ دونوں جیتنے ہوئے ابھی ایک دوسرے کو اور پھر مثال کو بیٹا شروع کر دیں گے۔

”تم مجھے برداشت کر رہے ہو۔ میری ضدی طبیعت کو تم برداشت کر رہے ہو؟“ وہ جیسے پاگل ہو جانے کو تھی۔

”ہاں تم جیسی عورت کو دنیا کا کوئی مرد برداشت نہیں کر سکتا سوائے میرے۔“ وہ بھی دودھ بولا۔

”تو مت کرو مجھے برداشت چھوڑ دو۔ دفعتاً کرو مجھے اپنی زندگی سے یہی چاہتی ہے تا تمہاری ماں کہ تم مجھے چھوڑ دو۔ میں تمہاری زندگی سے اور اس جہنم جیسے گھر سے چلی جاؤں تو نکال دو مجھے جھوڑو۔ تمہاری ماں، بن کے کلچے میں بھی ٹھنڈ پڑ جائے گی۔ مجھے طلاق ہو جائے گی تو انہیں سکون مل جائے گا۔ بلکہ تم کیوں مجھے جھوڑو میں خود تم جیسے ماں کے غلام اور بن کے دشمنوں پر چلنے والے مٹی کے مادھو کو چھوڑتی ہوں اور میرے بعد اس گھر میں کوئی عورت اگر تمہارے ساتھ گزارا کر جائے تمہاری بد اخلاق ماں، بن کو جھیل پائے تو میرا نام بدل دینا۔“ وہ غصے میں بولتی اپنی الماری سے کپڑے نکال کر بیڈ پر پھینکنے لگی۔

”کیا کہا تم نے۔ کیا بکواس کی تم نے ابھی۔ کیا سمجھتی ہو تم خود کو۔ اور میں تمہیں بتا رہا ہوں تم نے میری اجازت کے بغیر اس گھر سے کیا اس گھر سے بھی قدم باہر نکالا تو خدا کی قسم میں تمہیں ہمیشہ کے لیے جھوڑوں گا۔ پھر تم مجھے الزام نہیں دو گی۔“ وہ بھی غصے میں پاگل ہو گیا۔ بیڈ سے اچھل کر اس کے مقابل آکر کپڑے چھین پھینکتے ہوئے چلانے لگا۔

”تم مجھے چھوڑو گے؟ میں خود تمہیں چھوڑ رہی ہوں اور میں تمہیں ابھی اور اسی وقت یہاں سے جا کر دکھاؤں گی۔ تم قسم کھا رہے ہو تو اپنی ماں کے ہوتے پوری کرو میں بھی دیکھتی ہوں تمہیں۔ کتنا دم ہے تم میں۔“ وہ ڈرا نہیں ڈری۔ اسے میرے دھکادے کریک میں کپڑے ڈالتے ہوئے بولتی چلی گئی۔

”تم یہاں سے جاؤ گی؟“ وہ خونخوار لہجے میں بولا۔

”ہاں ہاں۔ میں جا رہی ہوں ابھی اور اسی وقت سے اور میں دیکھتی ہوں مجھے کون روکتا ہے۔ چلو مثال! اس نے اٹے سیدھے دو چار جوڑے بیگ میں رکھے۔ بیگ کی زپ بھی بند نہیں کی اور مثال کا بازو کھینچتے ہوئے لے جانے لگی۔

”مثال کو تمہا تھا بھی نہیں لگا سکتی۔ چھوڑو اسے۔“ وہ غصے میں مثال کو کھینچتے ہوئے بولا۔

”مثال میرے ساتھ جائے گی۔ میں اسے تمہاری پھا پھا کٹنی ماں، بن کے درمیان چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔“ وہ لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے جواباً مثال کو کھینچتے ہوئے بولی۔

مثال دونوں کی کھینچا تانی سے پہلے تو ڈری پھر بے اختیار ہو کر رونے لگی اسے اب دونوں کی کوئی بھی بات سمجھ نہیں آرہی تھی۔

”مما۔۔۔ ماما پاپا۔۔۔ پاپا۔“ وہ روتے ہوئے بولنے لگی مگر وہ دونوں سن کب رہے تھے۔

عدیل نے ایک زوردار تھپڑ بشری کے منہ پر جڑ دیا۔

”تم نے میری ماں، بن کو پھا پھا کٹنی کہا۔ تمہاری ماں۔۔۔ وہ کیسی ہے؟ مکار، جاؤ گرنی اور تم نے اپنی ماں جیسی۔“ اس نے بھی ساری مروت، لحاظ و درمیان میں سے اٹھا دیا۔

بشری کو تو عدیل سے اس نو سالہ از دو اجی زندگی کے پہلے تھپڑ نے ہی ہلا کر رکھ دیا تھا کجا یہ خطاب۔ وہ تو جیسے گال پر ہاتھ رکھے ہی پتھر کی ہو کر رہ گئی۔

”اور تمہارے خیال میں میں اپنی بیٹی کو تمہاری اس عیاریاں کی صحبت میں جانے دوں گا۔ کبھی نہیں۔“ اسے بشری کے پتھر ہو جانے کا احساس تک نہیں ہوا تھا۔ اسی طرح چلا کر بولا۔

”اب تو میں یہاں اس گھر میں ایک لمحہ کیا، ایک پل بھی نہیں رکوں گی اور مثال تو میرے ساتھ جائے گی۔ میں اسے کبھی یہاں تم جیسے لوگوں کے درمیان نہیں چھوڑوں گی۔ آؤ مثال چلو میرے ساتھ۔“ عدیل کے اس تھپڑ نے بشری کے دل میں جو رہی سہی محبت کا احساس تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔

وہ بڑی مضبوطی سے آگے بڑھی اور مثال کا بازو کھینچ کر بولی۔

”میں تم سے کہہ چکا ہوں۔ تم اس گھر سے بھی قدم باہر نہیں نکالو گی۔“ عدیل پھر سے اسے دھمکا کر بولا۔

”اور تمہارے خیال میں میں اب یہاں رکوں گی؟ میں جا رہی ہوں۔ تم سے جو ہو سکتا ہے کر لو۔“ وہ اسے سامنے سے برے دھکیل کر دروازے کی طرف جانے لگی۔

عدیل نے یوں دھکیلے جانے پر برا فروختہ ہو کر اسے دیکھا۔

بشری نے عدیل کو نہیں اس کی مردانگی کو دھکا دیا تھا۔ دھتکارا تھا۔ وہ پھنکارتے ہوئے پلٹا اور بشری کو بالوں سے کھینچ کر زور سے بیڈ پر کسی گیند کی طرح اچھال کر پھینک دیا۔ بشری کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی۔

اسے یوں لگا جیسے کسی نے اسے بیڈ پر نہیں ہزاروں فٹ کی بلندی سے اچھال کر پھینکا ہو۔ اور اس کا جسم جیسے ٹیٹے کا پتھر تھا ایک ہی جھٹکے میں چکنا چور ہو کر رہ گیا۔

اس نے ایک چیخ کے بعد دو سری اور دو سری کے بعد تیسری اور پھر وہ گٹھڑی بنتی ہوئی چینی چلی گئی۔

”ارے کیا ہو گیا۔ کیا قیامت آئی۔ گھر کو تم لوگوں نے کیا اکھاڑا سمجھ لیا، کس طرح جنگلی جانوروں کی طرح لڑ رہے ہو۔ غضب خدا کا سارا اٹلہ تم دونوں کے چکھاڑنے کی آوازیں سن رہا ہے۔ شرم کرو۔ کل کے بچے ہو دو نول۔“

تسیم بیگ مسلسل بولتے ہوئے دروازہ پھینکتے ہوئے بولیں جبکہ دروازہ پہلے ہی کھلا تھا۔ ایک ہی جھٹکے سے پورا کھل گیا۔

اندر کا منظر کم از کم ان کے لیے واقعی کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔

مثال منہ کے آگے دونوں ہاتھ رکھے اپنی چیخوں کو روکتے ہوئے بھی روئے جا رہی تھی۔ عدیل کا شدید غصے میں لال بھجھو کا چرو اور بیڈ پر گٹھڑی بنتی بیٹ کو دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں میں جکڑی بشری دنیا و مافیہا سے بے خبر آنکھیں بند کئے بیٹھے جا رہی تھی جیسے اسے کوئی فرق کر رہا ہو۔

تسیم بیگ کے قدموں میں جیسے زمین کے ساتھ جکڑے رہ گئے۔



باہرات کالی تھی اور لمبی بھی بہت تھی۔

وہ بہت دیر سے نکلنے کا بندھے اندھیرے میں روشنی کھونچنے کی کوشش کر رہی تھی کہ شاید دن کی کرن کہیں سے

لیکن اس کمرے میں.... اس کمرے میں ان تین چیزوں کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے۔ خولت جس نے بے اختیار آنکھیں بند کر لیں۔

”حمیدہ خالہ.... حمیدہ خالہ جلدی کریں۔ پلیز میرے ساتھ آئیں۔ دیکھیں ہا نہیں ماما کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ اٹھ ہی نہیں رہیں۔ میری کوئی بات بھی نہیں سن رہیں۔“ واثق حمیدہ خالہ کو بازو سے پکڑے کھینچتا ہوا گھر کے اندر لاتے ہوئے حواس باختہ سا کہے جا رہا تھا۔

”اے لڑکے! دم تو لینے دے مجھے۔ چلیں تک تو نے مجھے ٹھیک سے پروں میں پہننے نہیں دیں۔ آ رہی ہوں ذرا رک تو سہی۔ ایسی کیا آفت آگئی۔“ حمیدہ خالہ پریشان سی گھبراہٹ زدہ اس کے ساتھ کھینچتی چلی آ رہی تھیں اور کمرے تک پہنچتے ہی وہ ٹھٹھک کر رک گئیں۔

کندھے سے ڈھلکتی چادر کو ٹھیک کرنا بھول کر وہیں کھڑی رہیں۔ عاصمہ کا سر تکیے سے لڑھکا ہوا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور دور سے نظر آ رہا تھا اس کی سانسیں بہت خفیف چل رہی ہیں۔

”آئیں نا۔ ابھی جائیں۔ رک کیوں گئی ہیں۔“ واثق انہیں یوں کھڑے دیکھ کر جھنجھوڑ کر بولا۔

”ماما! ہمیں کیا ہوا ہے۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ آپ کو کیا ہوا ہے؟“ واثق ماں کو ہلاتے ہوئے بے اختیار رونے لگا۔

ساڑھے گیارہ سال کا بچہ اس سے زیادہ ہمت نہیں دکھا سکتا تھا۔ حمیدہ خالہ تم گم مگم آگے بڑھ کر عاصمہ کے سینے اور منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر آتی جاتی سانسوں کو ٹٹولنے لگیں۔

”جلدی سے جا۔ میرا بیٹا بشیر گھر پر ہی ہے۔ اس کو بلا کر لا۔ وہ کسی ایسوی لینس کو فون کر کے بلائے گا ابھی سانسیں چل رہی ہیں۔ کیا کھالیا اس نے۔ ان معصوم جانوں کا بھی تجھے خیال نہیں آیا عاصمہ!“ حمیدہ خالہ بتتے آنسوؤں کو چہرے سے رگڑ کر روتے ہوئے بولیں۔

”ایسوی لینس کو فون تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ مجھے نمبر بتا ہے؟ اخبار میں آتا ہے؟ داوانے مجھے بتا رکھا ہے۔“ واثق جلدی سے کہہ کر ماں کے سر ہانے پر ایسیل فون اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔

”مم.... میری امی.... بس وہ بے ہوش ہیں۔ بری کنڈیشن ہے ان کی۔ ایڈریس میں بتاتا ہوں۔ خالہ! آپ ایڈریس بتائیں انکل کو۔“ اس نے کانٹے ہاتھوں سے سیل حمیدہ کو اٹھا دیا۔

حمیدہ خالہ خود کو سنبھالتے ہوئے بمشکل ایڈریس بتانے لگیں۔ فون بند کر کے وہ عاصمہ کو پھر سے جھنجھوڑنے لگیں۔

مگر وہ ہوش و خرد سے بیگانہ تھی۔ اب تو اس کے منہ کے کنارے سے سفید جھاگ سی بھی نکلنے لگی تھی۔

”یا اللہ خیر۔ رحم فرماتا ان معصوموں پر۔ ان یتیموں کا کیا ہے گا اگر ماں بھی چھوڑ کر چلی گئی۔ یہ تو دل جائیں گے۔ تو اس کی جان بخشی کرنا۔ اس کی حفاظت فرماتا، رحم کرنا۔“ وہ گڑگڑا کر لیبوں میں دعا مانگتے ہوئے پاس سمی ہوئی کھڑی اربیبہ اور اربیبہ کے سروں پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔

اسی وقت باہر ایسوی لینس میں موجود عملے نے عاصمہ کو ایسوی لینس میں منتقل کر دیا اور اس کے اہلکار سے ابتدائی طبی امداد بھی دینا شروع کر دی۔

منور ہو مگر نہ رات ختم ہو رہی تھی نہ اندھیرا چھٹ رہا تھا۔ جانے رات کا کون سا پہر تھا جب اس کی اچانک آنکھ کھل گئی تھی۔ بوسیدہ کھڑکی کا پٹ رک رک کر کھینچ رہا تھا۔ یہ اس گھر کا سب سے پرانا اور خستہ حال کمرہ تھا۔ شاید کبھی اسٹور رہا تھا یا اس ٹائپ کی کوئی جگہ جہاں جب گھر کا آلتو فالٹو سارا سامان اکٹھا کر کے اس کمرے میں پھینک دیا جاتا تھا۔

وہ بھی تو اس گھر کا آلتو فالٹو سامان تھی۔ جب اس سامان کو استعمال کرنا ہوتا تھا پونچھ کر گھر کے اندر رکھ دیا جاتا اور جب اس کی ضرورت تمام ہو جاتی اسے دوسرے کاتھ کباڑ کے ساتھ اس بوسیدہ کمرے میں پھینک دیا جاتا۔

اس نے خود بھی اس کمرے کی حالت سنوارنے میں کبھی دلچسپی نہیں لی تھی۔ اسے تو یوں بھی اب کسی بھی چیز میں دلچسپی نہیں تھی۔ نہ چیزوں کو سنوارنے میں نہ بگاڑنے میں۔ اس زندگی میں سب کچھ پہلے ہی کچھ اس ہری طرح سے بگڑ چکا تھا کہ اس میں مزید بگاڑ کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

مگر یہ رات اتنی ایسی کالی سیاہ رات ختم کیوں نہیں ہوتی۔ وہ بیٹھے بیٹھے دیوار سے ٹیک لگائے اکڑ سی گئی تھی مگر لیٹی نہیں کیونکہ دیوار جتنی بے آرام تھی اس کا ٹوٹا پھوٹا بیڈ اور اس پر پھٹا پرانا بستر اس سے بھی زیادہ بے آرام تھا۔

اسے دن کا انتظار اس لیے نہیں تھا کہ اس سیاہ رات کے بعد شاید ہی کوئی امید بھرا دن لظہور ہو گا۔ اسے تو بس اس کھیل میں مڑا آتا تھا وہ گھنٹوں بیٹھی کھڑکی کی آگے پیچھے بھاگتی دونوں سوئیوں کو دیکھتی رہتی اور بہت دیر بعد اسے احساس ہوتا کہ ٹائم تو گزر ہی نہیں رہا۔ وہیں گھبرا ہوا ہے۔

جیسے یہ رات! اس بار میڈیکل آفیس کا تھا۔ یوں اسے یہاں بند رہنے کی بجائے سولہ دن رکنامز گیا۔ یہ اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایک قید خانے سے دوسرے قید خانے میں جانے کی مدت میں جو بیس گھنٹوں کی توسیع ہو گئی تھی۔ کل کا دن لظہور ہو گا اور جب شام کے بعد رات آئے گی تو اس کا سر ایک اور ایسے ہی بے آرام کمرے میں ہو گا۔

اس کمرے میں گھٹن ہے بوسیدگی ہے اور ٹھہرے ہوئے پائپوں جیسا گل لاپن ہے۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

☆ تملیاں، پھول اور خوشبو راحت جیں قیمت: 250 روپے

☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 600 روپے

☆ محبت بیاں نہیں لہنی جدوں قیمت: 250 روپے

مکتبہ، عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، راجپی۔ فون: 32216361

دانش اور حمیدہ ساتھ گئے۔

تینوں بچیوں کو حمیدہ نے اپنے گھر بھجوا دیا۔

عاصمہ کی پل بل بگڑتی حالت ان کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجائے جا رہی تھی۔

”ضرور کوئی بڑی بات ہوئی ہے جو عاصمہ جیسی برواشت اور صبر والی عورت نے یہ آخری حد پار کی۔ یقیناً“

ہوا ہے ایسا۔ وہ آدمی جو عثمان کا دوست تھا۔ جس کا روز کا آنا جانا تھا۔ عاصمہ نے سارے معاملات اس کے سر پر

رکھے تھے۔ اب دو تین دن سے وہ غائب ہے۔ آخری بار جب شام میں یہ اس کے ساتھ گئی تھی اور رات گئے گئی

اور کے ساتھ واپس آئی۔ تو دروازے کی درز سے میں نے خود دیکھا تھا۔ اس کی چال میں کنگڑا ہٹ سی تھی اور

چادر لباس مٹلا ہوا سبال بکھرے ہوئے کہیں۔ ”وہ سوچتے سوچتے بے اختیار سینہ تمام کر رہ گئیں۔

اور خوف زدہ نظروں سے بے سدھ آخری منزل کو جاتی عاصمہ کو دیکھنے لگیں۔



اونٹنی کے باہر شمل شمل کر عدیل کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس معمولی سے جھگڑے کو ان دونوں کا غصہ اس حد تک بردھارے گا کہ بشریٰ اور

جان کے لالے پر جائیں گے۔

نسیم بیگم ابھی اتنی بڑی بیماری سے اٹھی تھیں۔ وہ خود اس پریشانی کو جھیلنے کی حالت میں نہیں تھیں مگر ضد کر

کے وہ بھی عدیل کے ساتھ آئی تھیں اور اب صوفے پر تھکی تھکی سی سردیوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھی تھیں۔

ذکیہ اور عمران بھی پہنچے تھے۔

”کیا ہوا۔ کیا ہو گیا بشریٰ کو؟ صبح تو سیری بات ہوئی ہے، اچھی بھلی اس نے مجھ سے بات کی۔ کچھ بھی نہیں تھا

اسے تو۔“ ذکیہ تو سخت حواس باختہ تھیں۔

نسیم نے عدیل کی طرف دیکھا۔

”ہم نے تو بسن! گھر میں دو نوکرانیاں بھی لگا کر دے رکھی ہیں جو ہلکے بھاری سب کام کرتی ہیں۔ بشریٰ کو تو صرف

یکن میں کھانا دانا ہی دیکھنا ہوتا ہے۔ اللہ جانے باتھ روم میں شب میں سرف میں کون سے کپڑے بھگور کھتے تھے کہ

ایک دم سے باؤں پھسلا اور۔“

وہ رونے لگیں۔

ذکیہ دل تمام کر رہ گئیں۔

”دہ۔۔۔ وہ ٹھیک تو ہے نا۔ کوئی زیادہ مسئلہ تو نہیں ہوا؟“ وہ جانتی تھیں کچھ مسئلہ ہو چکا ہے۔ تب ہی تو دونوں ماں

بیٹے کا رنگ اڑا ہوا ہے مگر پھر بھی خود کو دھوکا دینے کو پوچھنے لگیں۔ ”سیم کچھ بول ہی نہ سکیں۔“

”عدیل۔ عدیل بیٹے! تم کہاں تھے؟ کیوں تم نے اسے غسل خانے میں ایسا کام کرنے دیا۔“ وہ وہائی دے کر

بولیں۔

”سنتی کہاں ہے وہ کسی کی۔ جب کوئی کام کرنے پر اتر آتی ہے تو۔“ نسیم نے دھیسے سے مجرمانہ لہجے میں کہا۔

”وہ اکثر کیا کہہ رہے ہیں۔“ عمران نے عدیل سے پوچھا۔

”ابھی کچھ نہیں بتا رہے۔“ وہ نظریں چرا کر ہولے سے بولا۔

بار۔ بار۔ اس کی نظروں کے سامنے وہ کربہ منظر آ رہا تھا جب اس نے وحشی جانوروں کی طرح بشریٰ کو اٹھا

کر بیڈ پر پٹا تھا جبکہ وہ اس کی کنڈیشن سے واقف بھی تھا۔

مگر پھر بھی جانے کیسے شیطان نے اس غصے نے اسے سب کچھ بھلا دیا۔ اس کی عقل، دل، نالغ سب کو ماؤف کر دیا۔

اسے ایک نئے لمحے کو بھی یاد نہیں آیا کہ اس غصے کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح بھی وہ اس غصے کا انتقام خود اپنے آپ سے لے سکتے ہیں۔ وہ عدو حال ماصونے پر گر گیا۔

بشریٰ کی حالت صاف بتا رہی تھی کہ ان کا ناقابل تلافی نقصان ہو چکا ہے مگر پھر بھی خود کو دھوکا دینے کو اللہ کی رحمت کی امید پر وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگتا ہی چلا جا رہا تھا۔

”اس کا بچہ بچ جائے۔ اسے کچھ نہ ہو۔ بشریٰ ٹھیک ہو وہ زندگی میں کبھی ایسی جمالت کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔ ایسا پاگل غصہ کبھی نہیں کرے گا۔ غصہ اسی لیے تو حرام ہے کہ سب سے زیادہ نقصان دہ کرنے والے کا کرتا ہے۔ میں یہ بات کیسے بھول گیا۔“ وہ پیشانی مٹے جا رہا تھا۔

”مثال گھر رہے؟“ ذکیہ کچھ دیر بعد بولیں۔
 نسیم نے اثبات میں سر ہلادیا اور دل میں شکر بھی ادا کیا کہ مثال گھر رہے ورنہ اگر وہ ثانی کو اصل بات بتا دیتی تو ابھی کے ابھی اسپتال کو میدان جنگ بننے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

اسی وقت باہر کے برآمدے کی طرف سے شور مارتا تھا۔
 اور کچھ لوگ ایک اسٹریچر کو دھککتے ہوئے دو سرے برآمدے کی طرف تیزی سے بھاگنے لگے۔

اسٹریچر عین عدیل کے پاس سے گزرا اور وہ لمحے کے آخری حصے میں شاکڈ سارہ گیا۔
 اسٹریچر پر بے ہوش حالت میں وہی عورت تھی جسے اس رات اس نے اس ویران سوسائٹی سے لٹھری تھی اور وہ عجیب و غریب حالت میں اپنے گھر کے آگے ننگے پاؤں اتری تھی۔

ذکیہ اسٹریچر کے پیچھے گئی تھیں۔ چند کھول باندھیں آگئیں۔
 ”ہائے ہائے! غضب خدا کا۔ کیا زمانہ آگیا۔ قرب قیامت ہے اور کچھ بھی نہیں۔“ وہ ہاتھ ملتے ہوئے واپس آ کر بولیں۔

”کون تھی یہ ذکیہ بن۔ آپ کی کوئی واقف؟“ نسیم لمانعت سے بولیں۔ جانتی تھیں ہوش میں آنے کے بعد اگر بشریٰ نے سب کچھ بول دیا تو پھر کیا ہو گا۔

”پیارے بچوں کی ماں ہے۔ چند ہفتے ہوئے شوہر اور سرسرا کا ایک ڈکیتی میں قتل ہو گیا۔ بے چاری کسمپرسی میں زندگی گزار رہی تھی۔ اب اللہ جانے کیا افتاد پڑی کہ نیند کی گولیاں کھالیں یا کوئی زہر پھاٹک لیا۔ مسائے تو بھی کہہ رہے ہیں کہ کھانے میں کوئی زہر ملی چیز کھائی ہے۔ ظاہر ہے کہ اب ڈاکٹر زکماں ہاتھ میں ڈالیں گے ایسے کیس میں۔“

وہ پھر سے بیٹھ کر آئریشن میٹر کے بند دروازے کی طرف دیکھنے لگیں۔
 ”یہ کم بخت ڈاکٹر کچھ بتا کیوں نہیں دیتے آکر۔ عمران! تم جا کر کہیں سے معلوم تو کرو۔ میرا تو دل ہولے جا رہا ہے۔“ وہ خیال آتے ہی پھر سے گہرا کر بولیں۔

”اے! ظاہر ہے اور کوئی کچھ کیسے بتا سکتا ہے کہ ڈاکٹر زکماں در بیٹھے ہیں۔ باہر آئیں گے تو کچھ بتائیں گے۔“ عمران سستی سے بولا۔
 اور عدیل تو جیسے کچھ سن نہیں رہا تھا۔

اس کا دھیان ہار بار اسٹریچر پر پڑی اس نیم مرده عورت کی طرف جا رہا تھا۔ پھر بچے۔ بیوہ عورت شوہر اور سر کا قتل۔ اس رات اس کے ساتھ کیا جیتی وہ شاید ابھی کوئی بھی نہیں جانتا۔ مگر میری ہمتی جس۔

اگر اس بے چاری کو بھی کچھ ہو گیا تو اس کے معصوم بچوں کا کیا بنے گا۔
 جیسے مثال کا۔ اللہ نہ کرے! اگر بشریٰ کو کچھ ہو گیا تو میری مثال کا کیا ہو گا۔ باپ، وادی، نمائی، دوسرے رشتہ دار لاکھ جان بچھاؤ کر سنے واسلے ہیں ماں سے بڑھ کر تو کوئی بھی نہیں۔ اللہ نہ کرے۔ میں ایسی بے ہوش باتیں کیوں سوچے جا رہا ہوں۔“ اس نے دل میں لالچل پڑھتے ہوئے پھر سے بشریٰ اور بچے کی سلامتی کی دعائیں مانگنی شروع کر دیں۔

”وہ جو گیارہ بارہ سال کا بچہ اسٹریچر کے ساتھ جا رہا تھا۔ وہ اس بے چاری کا اکلوتا بیٹا ہے اور سب سے بڑا۔ باقی نین چھوٹی بچیاں ہیں۔ اللہ اس پر رحم کرے۔ اس کو کچھ نہ ہو۔ ورنہ اس کے بچے تو مل جائیں گے۔“ ذکیہ اور نسیم باتیں کر رہی تھیں۔

اسی وقت اولیٰ کار روانہ کھلا اور ڈیوڈی ڈاکٹر زباہر آگئیں۔ نسیم اور ذکیہ اپنے بھاری جسموں کو بمشکل سنبھالتے ہوئے پھرتی سے اٹھ کر ان کے پاس گئیں۔
 ڈاکٹر صاحب! ہماری بچی۔ میری بشریٰ ٹھیک تو ہے نا؟ کیسی ہے اب اس کی طبیعت؟ اس کا بچہ تو ٹھیک ہے نا؟

ذکیہ ایک ہی سانس میں پوچھتی چلی گئیں۔
 عدیل اور نسیم دونوں پریشان نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھ رہے تھے۔

”اللہ کا شکر ہے، مریضہ ٹھیک ہے۔ اس کی حالت اب تسلی بخش ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔“ ڈاکٹر نے نرمی سے جواب دیا۔
 عدیل نے دل میں لاکھ بار شکر ادا کیا۔

”اور ڈاکٹر صاحبہ! بچہ۔ میرا مطلب ہے وہ ٹھیک ہے ہر طرح سے۔“ نسیم انکباٹک کر پوچھنے لگیں۔
 دونوں ڈاکٹر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”ہمیں افسوس ہے۔ ہم بچے کو نہیں بچا سکے۔ اتنے عرصے کے بعد کنسیو (conceive) کیا تھا انہوں نے تو بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ تقریباً گیارہ ہفتوں کا حمل تھا۔ ہم نے بہت کوشش کی۔ مگر شاید اللہ کو اس کی زندگی منظور نہیں تھی۔ تھوڑی دیر بعد جب بشریٰ اور دم میں شفٹ کر دیں گے آپ ماں سے مل لیجئے گا۔ ابھی بھی اسے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ پلیز جلی کیئر نفل۔ ابھی اسے بچے کے بارے میں نہ بتائیے گا۔ کم از کم آج کا دن رکھے۔“ ڈاکٹر نرمی سے کہہ کر چلی گئیں۔

اور برآمدے میں جیسے موت کی خاموشی چھا گئی۔
 عدیل بمشکل دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ سکا۔
 نسیم اور ذکیہ بھی سنانے میں رہ گئیں۔

اور عدیل کو لگا وہ خود کو کبھی معاف نہیں کر سکے گا۔ اپنے بچے کے قتل کے لیے وہ کبھی خود کو معاف نہیں کر سکے گا اور اگر بشریٰ نے بھی اسے معاف نہ کیا تو وہ کیسے بشریٰ سے نظریں ملا سکے گا۔

اس کی آنکھیں بھینکنے لگیں۔ نسیم عدیل کو دیکھے جا رہی تھیں۔
 * * *

اسے لگا اس نے آج تک اس بوئس کے جتنے بھی پھل اس کے پائے ہیں وہ بالکل بوگس اور بے کار ہیں۔
 محض رفس کاغذ کے کھلے۔

حقیقت میں تو وہ وہیں اس کے تصور اس کے خیال سے کہیں زیادہ خوب صورت ہے۔
مگر نہیں۔ خوب صورتی سے زیادہ اس کے چہرے پر جو گہری اداسی اور آنکھوں میں ہلکورے لیتی دیکھ کر غاروٹی
سارا جاوہان خاموش، فسوہ آنکھوں اور اس گہبہ چہرے میں ہے۔
اس نے ایک کے بعد ایک اس کی آنکھوں سے دیکھا۔ لیکن کوئی ایک خاکہ بھی اس اصل سے
اس پاس نہ گیا جو وہ کچھ دیر پہلے دیکھ چکا تھا۔

اس نے بے اختیار آنکھیں بند کر کے اس فسوں خیز اداس حسن کو سوچنا چاہا۔ اس کے لوچ دار جسم کی خوشبو
اور اس کے اڑتے پیرا، بن کی باس اور اس کی نرم زلفیں یا ہستی سے اس نے سیاہ جلد والی ڈائری کھول کر اس بال کو
نکال کر دیکھا جو اس نے کسی قیمتی خزانے کی طرح سنبھال رکھا تھا۔ وہ ایک نلک اس سنہری بال کو دکھاتا جا رہا تھا۔
”ایسا کب تک چلتا رہے گا۔ میں اس کو اپنے اتنے قریب محسوس کرتا ہوں۔ جیسے وہ بالکل میرے سامنے اس
کری پر بیٹھی ہو اور اسے شاید میرے احساس کی خبر تک نہیں۔ اور اگر اس بے خبری میں وہ مجھ سے دور بہت دور
چلی گئی تو اس بھاری پتھری کی بو۔ چھل زندگی کا بوجھ میں کیسے اٹھاپاؤں گا۔ پھر میرے پاس اس بے کار جیتے رہنے کا کیا
جو اپنے گلے“

وہ مغلوب سا ہو کر کھڑا ہو گیا۔

”مجھے اس سے بات کرنی ہے۔ آج ہی۔ یا کل۔ یا جب بھی وہ مجھے دوبارہ ملتی ہے۔ میں اپنے اس جنون کو
روگ نہیں بننے دوں گا۔ وہ میری ہے۔ صرف میری اور اسے اس کا علم ہونا چاہیے۔“ وہ ایک اس کی طرف دیکھے جا رہا
تھا۔



”یہ نمبر ہے حمیدہ آئی! میں ڈائل کر دوں؟“ واثق نے موبائل حمیدہ کے آگے کرتے ہوئے کہا۔ حمیدہ نے
چشمہ اتار کر موبائل کو قریب کر کے نمبر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے سر ہلا دیا۔
”میرا بچہ! ملادے ذرا جلدی سے۔“ دونوں اسپتال کے برآمدے میں کھڑے تھے۔ عاصمہ آئی سی یو میں تھی۔
ابھی تک ڈاکٹر اس کی زندگی سے پر امید نہیں تھے۔
واثق حوصلہ دکھاتے دکھاتے بھی کئی بار حمیدہ کی گود میں سر چھپا کر رو چکا تھا۔
اس کا دل یہ سوچ کر ہی بند ہونے لگتا تھا کہ اگر ماما بھی پایا اور دادا کے پاس چلی گئیں تو وہ اکیلا تینوں بہنوں کے
ساتھ کیا کرے گا؟ کہاں جائے گا؟

وہ بار بار حمیدہ کے کہنے پر ماں کی زندگی کے لیے بہت دعا میں مانگے جا رہا تھا۔

”حمیدہ آئی! بات کریں۔“ اس نے شاید کال ریسیو ہونے پر سیل حمیدہ کے کان پر لگایا۔

”ارے! تو تم خود پہلے بات کر لیتے ناموں سے۔“ حمیدہ خالہ فون کو ٹھیک سے کان سے لگاتے ہوئے بولیں۔

دوسری طرف ہاسٹم نے کال ریسیو کی تھی۔

حمیدہ نے اپنا تعارف کرانے کے بعد ہاسٹم کا پوچھا۔ رسمی سلام دعا کے بعد حمیدہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی ہاسٹم کو
خدا نخواستہ ہو جانے والے حادثے کے لیے کیسے تیار کرے۔

”اے ہاسٹم بیٹا! تم جس طرح بھی ہو سکتے۔ جلد سے جلد پاکستان آ جاؤ فوراً!۔“ وہ یہی کہہ سکیں۔

”خیر بہت تو ہے نا آئی! عاصمہ تو ٹھیک ہے نا؟“ ہاسٹم گھبرا کر بولا۔

حمیدہ خالہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”بس یہی سمجھ لوئے! اس وقت اسے تمہاری سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ وہ اس وقت بہت اکیلی ہے۔ اگر
اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھو ورنہ۔“ وہ صاف لفظوں میں کہہ نہیں پاری تھیں۔
”ورنہ کیا خالہ۔۔۔ پلیز! صاف بات کریں مجھ سے۔“ ہاشم اور بھی پریشان ہو گیا۔
”واثق کہاں ہے؟ اس سے کہیں مجھ سے بات کرے۔ بلکہ عاصمہ سے بات کرواؤ میں میری۔“ اس نے حمیدہ
خالہ کی باتوں اور انداز سے خائف ہو کر کہا۔

”وہ بچہ بے چارہ تم سے کیا بات کرے گا۔ خود کچھ کرنے کے قابل نہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے خود کو
سنبھال رکھا ہے۔ پر ہے تو بچہ ہی نا! تم بس کسی بھی طرح جلد سے جلد آ جاؤ۔ عاصمہ کو تمہاری سخت ضرورت
ہے۔“ وہ ڈھکے ڈھکے الفاظ میں بولیں۔

”میں آپ کی کوئی بھی بات بالکل نہیں سمجھ پاری۔“ وہ دن پہلے میری عاصمہ سے بات ہوئی ہے۔ وہ بالکل ٹھیک
تھی اور اس نے مجھے بالکل بھی آنے کے لیے نہیں کہا۔“ وہ اب کے دو ٹوک لہجے میں بولا۔
”تو میاں! احادیث تو ہیں، بھر میں بھی ہو سکتا ہے۔ وہ مرجائے گی تو آؤ گے؟“ وہ ایک دم سارا ضبط کھو کر بول پڑیں۔
”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“

”وہ مر رہی ہے۔ ضرورت ہے اسے تمہاری۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جیسے تم بہنوئی کے جنازے کو کندھانہ دے سکتے
تو بہن بھی۔ تمہاری۔ اس کے بچے تو اتنے سمجھ دار بھی نہیں کہ ماں کو آخری کندھانہ سکیں۔“ حمیدہ کا خود
پر ضبط کھو گیا۔ اس نے ہاشم کا جواب سننے بغیر فون بند کر دیا۔
واثق بھی رو رہا تھا۔

حمیدہ خالہ نے بے اختیار اس چھوٹے سے معصوم بہادر بچے کو اپنی آنکھوں میں چھپا لیا اور دونوں رونے لگے۔
آئی سی یو کے اوپر ابھی تک سرخ جتی جل بجھ رہی تھی۔ حمیدہ خالہ واثق کو ٹھپکتے ہوئے اس جتی کو دیکھے جا رہی
تھیں۔



عدیل بشری کے میسڈ کے پاس کھڑا تھا اور بشری نے مستقل اس کی طرف سے رخ پھیر کر ماں کی طرف چہرہ کر
رکھا تھا۔ عمران کے ساتھ بیٹھی نسیم نے بھی کئی بار مخاطب کرنے کی کوشش کی۔ مگر بشری نے سانس کی طرف دیکھا
تک نہیں۔

”یہ کم بخت ضرور بھانڈا پھوڑے گی۔ پھر اس کی فسادن ماں کیا طوفان اٹھائے گی؟ اسپتال میں تماشا لگانے سے
بتر ہے ہی! انحال گھر ہی چلا جائے۔“ نسیم بیگم نے دل میں سوچا۔

وہ کئی بار عدیل کو بھی آنکھوں آنکھوں میں یہ سمجھانے کی کوشش کر چکی تھیں۔ مگر وہ تو ماں کی طرف دیکھ بھی
نہیں رہا تھا۔

”اور بھی جو رو کا غلام ہو جائے گا یہ عدیل تو۔“ وہ غصے میں برہنہ تھیں۔

”میرا خیال ہے ذکیہ بس! اب تو بشری کی طبیعت کافی بہتر ہے۔ آپ گھر چلی جائیں۔ کافی دیر سے آئی ہوئی ہیں۔
تھک گئی ہوں گی۔ میں اور عدیل ہیں نا بشری کے پاس۔“ نسیم نے محبت بھری نظروں سے بشری کو دیکھتے ہوئے
کہا۔ بشری نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

”ارے نہیں بس! اللہ آپ کو زندگی دے۔ ساتی بڑی بیماری سے تو آپ اٹھی ہیں۔ آرام کی تو آپ کو ضرورت
ہے۔ میرے خیال میں تو آپ گھر چلی جائیں۔ میں اور عمران ہیں بشری کے پاس۔“ ذکیہ نے نسیم کے دل کی بات

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شاندار پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ ہریم کوالٹی، نادرل کوالٹی، کپریڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈفری لنٹس، لنٹس کو میسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو امیل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ☆ ایب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

کہہ دی۔

نسیم تو فوراً "جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔"

"ہاں بہت دیر سے طبیعت عجیب سی ہو رہی تھی۔ وہ ہر میں تو دو آئی لیٹا بھی بھول گئی تھی۔ دو آئی تو ڈاکٹر نے اس قدر تاکید کی ہے کہ کھانا کھانا بھول جاؤں دو آئی کھانا نہیں بھولنا۔ چلو پھر عدیل بیٹا! ہم چلتے ہیں۔ شام میں آجائیں گے ذکیہ، بن اور عمران ہیں یہاں۔"

عدیل نے بشری کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے امی! میں آپ کو چھوڑ کر آجاتا ہوں واپس۔" عدیل نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

"عمران! ہم پلیز کھر جا کر ذرا مثال کو لے آؤ۔ اس سے ملنا ہے مجھے۔" بشری روکے کھجے میں عمران سے بولی۔

"ہاں تو اگر عدیل واپس آ رہا ہے۔ تو وہ آتے ہوئے مثال کو لے آئے گا۔ تم مل لیٹا۔ کچی بھی ماں کو دیکھنے کے لیے بے چین ہوگی۔" ذکیہ بھی فوراً ہی بولیں۔

"میں نے کمانا عمران! تم جا کر مثال کو لے آؤ ابھی مجھے اس سے ملنا ہے۔" وہ نروٹھے پن سے عمران سے بولی۔

"افو آئی! عدیل بھائی جا رہے ہیں نا۔ لے آتے ہیں واپسی پہ مثال کو بیسے۔ مجھے ابھی ایک ضروری کام کے لیے نکلتا ہے۔ کھنے بھر میں واپس آجاؤں گا۔" عمران کہہ کر عدیل سے پہلے اسپتال سے نکل گیا۔

عدیل اور نسیم بھی مزید بحث کے بغیر عمران کے پیچھے نکل گئے۔

"تم باتھ روم سے کیسے پھسل گئی تھیں بشری؟ تمہیں اپنی حالت کا پتا نہیں تھا کہ تمہیں کتنی احتیاط کی ضرورت ہے؟" ذکیہ ان دونوں کے جاتے ہی بولی تو بشری نے چونک کر کہاں کو دیکھا۔

"باتھ روم سے۔" اس نے زیر لب دہرایا۔

"یہی بتا رہی تھیں نا تمہاری ساس اور عدیل۔ باتھ روم سے ہی پھسل گئیں نا تم؟" ذکیہ کو بشری کے چونکنے پر کچھ شگ ساہو اتور ہرا کر پوچھنے لگی۔

"امی! ڈاکٹر بچے کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں؟ بچہ ٹھیک ہے نا؟" وہ کچھ بے چین سی ہو کر بولی۔

ذکیہ سے فوری طور پر کچھ بولا ہی نہ گیا۔

کیسے کہتی کہ جس بچے کی آس وہ ابھی تک دکائے بیٹھی ہے، وہ اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی اس سے روٹھ کر چلا گیا ہے۔ اس کی ساری دعائیں سارے جتن بے کار گئے۔ وہ سوچتی رہ گئیں۔

"امی! آپ کچھ بول نہیں رہیں۔" وہاں کی خاموشی یہ پھر سے بولی۔

"بشری! تم آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرو۔ تمہیں ڈرپ لگی ہے اور ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تمہیں آرام کی بھی سخت ضرورت ہے میری بچی! اب اور کچھ نہیں سوچو۔ آنکھیں موند لو کچھ دیر کو۔" ذکیہ بیگم وکھی دل سے بیٹی کا سر سہلانے لگیں تو بشری نے تھکے ہوئے انداز میں آنکھیں موند لیں۔ وہ چاہتے ہوئے بھی ماں سے اس جھگڑے کو شیئر نہ کر سکی جو اس کے اور عدیل کے بیچ بہت دوری لے آیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

عاصم نے آنکھیں کھولیں تو لمحہ بھر کو جیسے ساکت سی رہ گئی۔

یہ تو اس نے نہیں سوچا تھا۔

انتہے لگائی کوئی خواب ہے۔

اس کے سامنے نو سال پہلے باہر جانے والا بڑا بھائی ہاشم کھڑا تھا۔

وہ یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔

ہاشم نے آگے بڑھ کر عاصمہ کے سر پر ہاتھ لگا یا ہی تھا کہ وہ ایک دم سے دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اس کے اتنے مہینوں سے اندر رکے ہوئے گھٹے ہوئے آنسو بھائی کے محبت بھرے ہاتھ کا لمس بساتے ہی جیسے چھوٹ نکلے۔

ہاشم اسے جتنا سنبھالتا جتنا سہمشتا جا رہا تھا وہ اتنی ہی بکھرتی جا رہی تھی۔

”میری بچی! بس کرا بھی تو تو موت کی دہلیز کو ہاتھ لگا کر آئی ہے۔ ابھی تو تیری حالت ایسی بھی نہیں کہ تو اٹھ کر بیٹھ سکے۔ یوں رونے کی تو خدا نخواستہ تیری طبیعت بہت زیادہ نہ بگڑ جائے۔“ حمیدہ کو آگے بڑھ کر اسے سنبھالنا پڑا۔ مگر وہ تو جیسے اپنے آپ میں ہی نہیں تھی۔ ہاشم سے لپٹی اونچا اونچا روئے جا رہی تھی۔

اس کی زندگی کے سارے پیارے رشتے اس کی عزت آبرو سب کچھ تو چھین گیا۔ اسے صبر آنا بھی تو کس طرح۔ ”صبر کر میری بہن۔ حوصلہ کر۔ میں آگیا ہوں ناں میں یوں ہی نہیں دو تین راتوں سے سو نہیں سکا تھا۔ کبھی با خواب میں آتے تو کبھی اماں بے چین سی پریشان گھبرائے ہوئے ہوتیں۔ بار بار کہتے ہمیں عاصمہ کی طرف جانے دو۔ وہ بہت پریشان ہے وہ ٹھیک نہیں ہے۔ میں نیند سے اٹھ اٹھ جاتا۔ اگر حمیدہ خالہ آپ کا فون نہیں بھی آتا تو یقین کریں۔ میں نے اس ہفتے پاکستان ضرور آنا تھا۔ میرے دل کو ایک بل کا قرار نہیں تھا۔ یہی احساس جرم کم نہیں تھا کہ میں عقان اور فاروق انکل کے جنازوں کو کندھانہ دے سکا کہ اب یہ بار بار اماں ابا کے حوالے سے عاصمہ کے خواب۔ مجھے تو جیسے نہ دن میں قرار تھا نہ رات کو چھین۔ آنا تو تھا ہی مجھے۔“

وہ بکھری ہوئی بہن کے بال سمیٹتے اس کی چادر ٹھیک کرتے کہہ رہا تھا وہ ابھی تک روئے جا رہی تھی۔

”ہوا کیا تھا میری بہن! کیا ہوا تھا تمہارے ساتھ کہ تم نے یہ انتہائی قدم اٹھا لیا۔ وہ دونوں تو اپنے خالق کی آواز پر لبیک کہتے بادل ناخواستہ چلے گئے مگر تم تو سمجھ دار تھیں۔ اپنے اکیلے رہ جانے والوں بچوں کا آخری سہارا بھی پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟“ وہ اسے ساتھ لگائے ہوئے اس کی دکھتی رگ چھیڑ بیٹھا۔

”نہیں ہوتا کوئی انسان کسی کا بھی آخری سہارا۔ انسان سے بودا نکلا اور گھٹیا ناقابل بھروسہ سہارا کوئی نہیں۔ کوئی انسان کسی دوسرے کا سہارا بھی بن نہیں سکتا۔ یہ شرک ہے۔ یہ کفر ہے۔ یہ ایمان کی خرابی ہے۔ ایمان کو ریت کی طرح چاٹ جانے والی خرابی۔ خدا کے سوا سارے سہارے جھوٹے دھنگے ہوتے ہیں۔ کوئی کسی کا سہارا نہیں۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں بھائی! مجھ سے ہی غلطی ہوئی۔ میں نے انسان کو سہارا جانا۔ میں نے انسان پر بھروسہ کیا۔ میں نے اپنے ساتھ بڑا ظلم کیا۔ میں خود ہوں اپنے ساتھ زیادتی کرنے والی۔ مجھے مرجانا چاہیے مجھے مرنے دیں۔ مجھے کیوں نہیں مرنے دیا آپ لوگوں۔ اب میں زندہ رہنے کے قابل نہیں ہوں۔“

وہ ہسٹریائی انداز میں چیختی ہوئی ہاشم کی بانہوں میں جھول گئی۔

حمیدہ اور ہاشم پریشان سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔



”نہیں امی! مجھے عدیل کے گھر نہیں آپ کے ساتھ جانا ہے۔ آپ کی طرف۔“ اسپتال سے چھٹی ہو گئی تھی۔ اور کچھ دیر پہلے ڈاکٹر نے بشری سے بات کرتے اس کے بچے کی موت کا بتا دیا تھا۔ اس کے بعد سے بشری کسی رست کی طرح ساکت تھی۔ پھر جیسے ہی ذکیہ بیگم آئیں تو وہ فوراً ”بستر سے اترتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں بولی۔

”بشری! ہم گھر جا رہے ہیں۔ آئی بھی ہمارے ساتھ چل رہی ہیں۔“ عدیل نے نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑتے

ہوئے کہا۔

”ہاتھ مت لگاؤ مجھے۔ تم تمہارے ساتھ جاؤ گی نہیں کبھی نہیں۔ اگر تم نے میرے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش کی تو میں چیخ چیخ کر سارے اسپتال کو اٹھا کر لوں گی۔ سب کو تلوں گی کہ تم اصاب میں کیا ہو۔ تمہارا چہرہ ایک قابل کا چہرہ ہے۔ اپنے ہی بچے کے قابل کا چہرہ۔“ وہ پاکلوں کی طرح چیختی لگی۔ عدیل کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

نسیم بیگم نے اڑی رنگت کے ساتھ سمہن کی طرف دیکھا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو تم بشری! ذکیہ بیگم نے بیٹی کو ساتھ لگا کر سنبھالتے ہوئے کہا۔

”سچ۔ سچ کہہ رہی ہوں جو اتنے دنوں سے صرف اس لیے چھپا رہی تھی کہ میں بد قسمت سمجھ رہی تھی کہ میرا بچہ ابھی زندہ ہے مگر وہ تو اپنے باپ کی درندگی کی بھیینٹ چڑھ چکا اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی۔ امی! وہ مر گیا۔ وہ دیکھ گیا مجھ سے ہم سے اس ظالم شخص نے اسے مار ڈالا۔ مار ڈالا میرے بچے کو۔“

وہاں کے گلے لگ کر بلک بلکے رونے لگی۔

”یہ کیا کہہ رہی ہے نسیم بہن! کیا ہوا تھا کیا چھپایا تھا آپ لوگوں نے ہم سے؟“ ذکیہ بہن پریشان ہو کر ابھی ہوئے کچھ میں پوچھنے لگیں۔

”بہن! میں تو خود ٹھیک سے نہیں جانتی کہ کیا ہوا۔ دونوں میاں بیوی کا آپس کا کوئی جھگڑا تھا۔ میں نے چیخ پکار سنی ان کے کمرے میں گئی تو بشری کی طبیعت خراب ہو چکی تھی۔ کیا ہوا کیسے ہوا۔ مجھے تو یہ پوچھنے کا ہوش بھی نہیں رہا۔ بس فوراً اسے اسپتال لے کر آئی لیکن قدرت کو منظور نہیں تھا اس بچے کی زندگی۔ ہماری جلدی بھی کچھ کام نہ آسکی۔“ وہ لہجے میں زمانے بھر کی منگلو میت بھر کر رہی آواز میں بولیں۔

”جھوٹ بولتی ہیں یہ۔ یہ سب کچھ جانتی تھیں۔ انہوں نے عدیل کو بھڑکایا تھا۔ اس نے مجھے مارا تشدد کیا اور میرا بچہ۔ امی! میرا بچہ چلا گیا۔ امی! وہاں کے ہاتھوں میں بکھر گئی۔ عمران نے عدیل کا گریبان پکڑ لیا۔ ذکیہ بیگم نے بے ہوش ہوتی بیٹی کو دیکھا اور دوسری طرف بیٹے کے ہاتھ میں داماد کا گریبان۔

ذکیہ بیگم کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

بیٹی کو جیسے تیسے بیڈ پر لٹا کر عمران کو پرے دھکا دیا جو گالیاں بکتے ہوئے چیخ رہا تھا۔ عدیل کو بھی غصہ آچکا تھا وہ بھی اٹل رہا تھا۔ نسیم بیگم بھی بیٹے کا ساتھ دے رہی تھیں۔

ذکیہ بیگم کو لگا نسیم بیگم کی کسی وہ بات پوری ہونے جا رہی ہے جو اس نے اسپتال کے بستر پر بیٹھے سنی تھی۔ انہوں نے بے ہوش بیٹی کو دیکھا اور گالوں کے جواب میں گالیاں بکتے عدیل کو۔ کہانی بگڑ چکی تھی۔



عاصمہ تلکے چلنے میں کمرے میں بیٹھی تھی۔

اس کے ارد گرد گھر کا آدھے سے زیادہ سامان بندھا ہوا تھا۔ مگر وہ جیسے ہر چیز سے بے نیاز کھوئی کھوئی بیٹھی تھی۔ اس وقت بیرونی دروازہ کھلا اور ہاشم تھکا ہوا ہاتھ میں پکڑی فائلوں کے ڈھیر کے ساتھ اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

”کس وقت جانا ہے ہم نے یہاں سے بھائی؟“ وہ بے تاثر لہجے میں بولی۔

”شاید کبھی نہیں۔“ ہاشم نے فائلوں کا ڈھیر اس کے آگے پھینک دیا۔ عاصمہ حیران سی دیکھنے لگی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ پیریم کوالٹی، ہائل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے لگی ڈاؤن لوڈ کی جا سکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہیری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

رُخسانہ نگارِ عدنان

ایکٹی سٹا

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشری ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی عمران بشری کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشری اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصلحتاً "بیٹا بہو سے لگاوت دکھائی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشری کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ذکیہ بیگم اپنے بیٹے عمران کے لیے بھی لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔ سب سے پہلے سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشری کی سند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشری دو لہما ظمیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔ عدیل سے شادی سے قبل ظمیر کا بشری کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن زانیہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشری اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشری اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشری کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاڈز کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہیں۔ عاصمہ کو فون کے ذریعے کوئی اطلاع ملتی ہے۔ نئے سن کروہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔

فون پر پتا چلتا ہے کہ شہر آتے ہوئے عفان اور فاروق صاحب ذمیت کی واردات میں قتل ہو گئے۔ عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے وصول کرائی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔



اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقتولین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ نسیم نسیم سے تین لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشری سے ذکیہ نسیم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔ حمیدہ خالہ عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زبیر کا اکیلے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں جبکہ عاصمہ کی مجبوراً ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس کو خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زبیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آتا ہے کہ وہ اتھرائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مزب سے پہلے واپس گھر آجائے سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔ فوزیہ کے طلاق ہو جانے پر نسیم نسیم جذباتی ہو کر سوار اور اس کے گھر والوں کو مورد الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشری کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل طیش میں بشری کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا ابا رشن ہو جاتا ہے عدیل شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے مگر وہ نوزائیدہ رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔ اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے تنگ آکر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آ جاتا ہے۔

ساتویں قسط

وہ رکشے سے بیگ اتار کر رکشے والے کو ٹھسی میں دبے پیسے بری احتیاط سے گن کر دینے کے بعد رکشے کے دروازے کے بعد یونٹی کتنی دیر کھڑی رہی۔ اس کا دماغ ایک دم سے جیسے خالی ہو گیا تھا۔

”میں یہاں کس لیے آئی ہوں؟“ وہ خالی الذہن کھڑی بے بسی سے دور جاتے رکشے کو دیکھتی رہی۔ ”مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“ اس نے بے بسی سے سوچا۔

”تو پھر اور کہاں جاتی میری زندگی میں چو اٹس کتنی کم ہے۔ بلکہ ہے ہی نہیں۔“ دھوپ بہت تیز تھی اور جیسے اس کے سر پر چمک رہی تھی۔ مگر اسے تو نہ گرمی کا احساس تھا نہ سردی کا نہ اس بات کا کہ وہ سڑک کے پتھوں بچ اپنا بوسیدہ بیگ لے لے بے مقصد ہی کھڑی ہے۔

اس نے جھک کر بیگ اٹھایا اور اپنی پشت پر پھیلے سرخ ٹائلوں بوالے خوب صورت وسیع و عریض گھر کو دیکھا۔

”اتنا بڑا گھر کہ جس کے باہر سے گزرنے والے اس کے اندر آنے کی تمنا ایک بار تو ضرور کریں۔ اس اتنے بڑے محل میں میرے لیے ذرا سی جگہ بھی نہیں ہے کہ جہاں میں مہینے کے پندرہ دن گزار سکوں۔“ ڈور بیل بہت دور تک اور بہت دیر تک بجتی رہی تھی۔

وہ بے خیالی ہی کھڑی تھی۔

ساتویں بار کال بیل دیتے ہوئے وہ بے اختیار چونک گئی۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ گھر میں کوئی بھی نہ ہو۔ جیسا کہ پہلے بھی دو چار بار ہو چکا ہے۔ سائی گاڈ! اس کا دل بہت تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔

اس نے دوپٹے کے پلو سے چہرے کو گھڑا لایا۔

”میرے پاس تو واپسی کے لیے کرایہ بھی نہیں ہے۔ اگر واپس جانا ہی پڑا تو کیسے جاؤں گی۔“ اس کا دل سمٹنے لگا تھا۔

اسے لگا وہ اب بھی گرے گی اور۔ بے ہوش ہو جائے گی۔

”بے ہوش ہی کیوں میں مریوں نہیں جاتی۔“ اس نے جھنجھلا کر خود کو ہزار بار کی وی ہوئی بد دعا دہرائی۔ مگر جاتی تھی اس بار بھی یہ بد دعا بے اثر رہے گی۔

”گھر میں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ اسام آباد گئے ہیں سب۔“ اس کا خدشہ درست نکلا۔

چوکیدار سرخ آنکھوں کے ساتھ بغلی دروازے میں کھڑا چہرے پہ زمانے بھر کی بے زاری سجائے اس سے کہہ رہا تھا۔

”کب۔۔ کب گئے؟“ بالکل غیر ضروری سوال تھا جبکہ اسے کچھ اور پوچھنا تھا۔

”دو دن ہو گئے۔ آپ کو پتا نہیں تھا؟“ چوکیدار نے اس کی ملا علمی پر تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہاں۔ نہیں معلوم تو تھا مگر مجھے لگا شاید ابھی کچھ دن ہیں جانے میں۔ خیر آجائیں گے واپس۔ میں اندر تو آ جاؤں بہت گرمی سے باہر۔“ بہت دیر بعد اسے موسم کی شدت کا احساس ہوا تھا۔ بغلی دروازے میں آگے کی طرف بیگ کو دھکنے لگی۔

”مگر وہ جی۔ گھر تو اندر سے سارا لاکھڑا ہے۔ مطلب تالا وغیرہ سب کمروں کو لگا ہے تو آپ۔“ چوکیدار رک رک کر بولا۔ اسے شاید یہ امید تھی کہ وہ سب گھر والوں کی غیر موجودگی کا سن کر واپس چلی جائے گی۔

اس نے کتنی دیر تک کچھ بولا ہی نہ گیا۔

”نہیں وہ میرا کرا۔ مطلب وہ اوپر کی طرف ہے تو۔“

”باہر لاؤنچ سے تالا لگا ہے۔ اندر کی سیڑھیاں بھی اسی میں آتی ہیں تو آپ کیسے جائیں گی اوپر۔“ چوکیدار اس کو سمجھانے والے انداز میں بولا۔ وہ نا سمجھی سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

”لیکن۔ میں تو آگئی ہوں۔ مجھے تو اب۔ میرا مطلب ہے میں واپس نہیں جاسکتی۔ آپ پیچھے ہٹیں۔ میں دیکھ لوں گی جہاں مجھے رہنا ہو گا۔“

اس نے اب کے کچھ بہادری دکھانے کی کوشش کی۔

”کہاں رہیں گی آپ؟“

آپ راستہ تو دیں۔ میں دیکھ لوں گی کیونکہ میں واپس نہیں جاسکتی۔“ وہ درشتی سے کہہ کر بیگ اٹھا کر چوکیدار کو پیچھے کرتے ہوئے اندر چلی گئی۔

چوکیدار پریشان سا اسے اندر جاتا دیکھ رہا تھا۔

وہ اب لاؤنچ کی سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر بیگ رکھے گم صم سی کھڑی تھی۔ بند دروازہ اس کا منہ چڑھا رہا تھا۔ اسے بہت دیر بعد ٹانگوں کے ٹھکنے کا احساس ہوا تو گرنے کے سے انداز میں وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

چوکیدار ابھی بھی منتظر تھا کہ وہ بند دروازہ دیکھ کر واپس لوٹ جائے گی۔

وہ جان بوجھ کر چوکیدار کی طرف نہیں دیکھ رہی۔

اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا کہ اب اسے کہاں جانا ہے جبکہ اس کے پاس پیسے بھی نہیں۔ اس نے پرس کو یونٹی ٹولنا شروع کر دیا۔



”بشری! سو رہی ہو؟“ ذکیہ بیگم دیوار کی طرف کروٹ لے کر لٹی ہوئی بشری کے پاس آکر نرم لہجے میں پوچھنے لگیں۔

جواب میں بشری اسیدھی ہو کر ماں کو دیکھنے لگی۔

”سن لو ناں تمہارا فون ہے۔ اب کیا میں کھڑی رہوں لے کر۔“ ذکیہ نے کچھ بے زاری سے کہا۔ بشری نے کوفت بھرے انداز میں فون لے لیا۔ لمحہ بھر کچھ سوچتی رہی پھر سیل کان سے لگا لیا۔

دوسری طرف عدیل تھا۔

بشری نے عیسیٰ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔

ذکیہ بیگم اسے لجاجت بھرے انداز میں بات کرنے کا اشارہ کرنے لگیں۔ بشری نے ہونٹ بچھتے ہوئے لائن کاٹ کر کے تکیہ کے پاس رکھ دیا۔ ذکیہ پہلے اسے غصے سے دیکھتی رہیں پھر سر پکڑ کر اس کے پاس ہی بیڈ کے کنارے پر ٹک گئیں۔

بشری لا تعلق سی ماں کو دیکھتے ہوئے سامنے دیوار پر لگی پینٹنگ کو دیکھنے لگی۔ سیل فون پھر سے بجنے لگا تھا۔

ذکیہ نے اس بھری نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ وہ اسی طرح لا تعلق بیٹھی تھی۔

فون مسلسل بجنے کے بعد خاموش ہو گیا۔

بشری دوبارہ لیٹ گئی۔

”ایسا کب تک چلے گا بشری!“ ذکیہ نے حتی الامکان لہجے کو نرم رکھتے ہوئے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

”تنگ آگئی ہیں مجھ سے؟“ بشری ماں کی طرف دیکھے بغیر ساٹ لہجے میں بولی۔

”فضول بات نہیں کرو۔ اس میں میری تنگی یا فراخی کی بات نہیں ہے تم جانتی ہو۔“ ذکیہ بیگم چڑے ہوئے لہجے میں بولیں۔

”اس بات کا تعلق تنگی اور فراخی سے تو ہے۔ آپ مائیں یا نہیں مائیں۔“ وہ اسی بے تاثر لہجے میں پھر بولی۔

”آج سترہ دن ہونے لگے ہیں۔“ ذکیہ طویل سے لہجے میں بولیں۔

”مجھے آکر بیٹھے ہوئے؟ بے فکر رہیں کتنی وقت صرف آپ نہیں کر رہیں۔ میں بھی ہر روز صبح اٹھ کر دنوں کو شمار کرتی ہوں۔“ بشری کے لہجے میں تلخی تھی۔

”میری بچی! وہ مرد ذات ہے۔ سترہ دنوں سے وہ مسلسل چکر لگا رہا ہے۔ ہر روز دفتر سے واپسی پر گھر جانے سے پہلے وہ تم سے اور مثال سے ملنے کے لیے آتا ہے۔ بچی کے لیے فرمائش کی ڈھیروں چیزیں پھیل ٹیک چاکلیٹ تھلونے بسکٹ کیا ہے جو وہ نہیں لے کر آتا۔ گھنٹوں تم سے ملنے کی اس لیے انتظار کرتا ہے۔ اگر اس کا دل پھر گیا تم سے تو۔“

ذکیہ حتی الامکان نرم الفاظ میں اسے رک رک کر سمجھانے کی کوشش کرنے لگیں۔

”دل ہی تو پھر گئے ہیں۔ ان کا پھر ہے یا نہیں مگر میرا دل ان سے مکمل طور پر پھر گیا ہے۔ میں اب اس شخص کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی جو میرے بچے کا قاتل ہے۔ میری خوشیوں کا قاتل۔ آپ چاہتی ہیں میں اس کے چہرے چاکلیٹ چار بسکٹ اور تھوڑے سے پھلوں کے عوض اپنے بچے کا خون معاف کر دوں؟ کبھی نہیں ٹھہر کر بھی نہیں!

بشری کے لہجے میں سختی کے ساتھ دکھ کی کڑیاں بھی تھیں جسے صرف ایک ماں ہی محسوس کر سکتی تھی۔

”اس نے یہ سب کچھ جان بوجھ کر نہیں کیا۔ ایک بار نہیں بہت بار وہ تم سے سب سے معافی مانگ چکا ہے۔ میں جانتی ہوں سب جانتے ہیں اسے۔ وہ کتنی نرم، محبت کرنے والی طبیعت کا مالک ہے۔ تم تھوڑا سا دل میں وسعت۔“ ذکیہ کے لہجے میں محبت تھی۔

”آپ کا مطلب ہے میں سخت دل ہوں، پتھر ہوں جھوٹی ہوں۔ ان پر الزام لگا رہی ہوں۔ جو کچھ ہوا وہ سب میری وجہ سے تھا۔ اس میں ان کی کچھ غلطی نہیں؟“ بشری پھٹی ہوئی آواز میں آنسو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

”ایسا میں نے کب کہا۔ غصے میں آگیا تھا وہ۔ طیش میں انسان بہت کچھ بھول جاتا ہے۔ نقصان اگر تمہارا ہوا ہے تو جانے والی اس کی بھی اولاد تھی۔ دوسری اولاد اس کی بھی سب سے بڑی خواہش تھی۔ دکھ اسے بھی اتنا ہی ہے جتنا تمہیں ہے۔“ اب ذکیہ کے انداز میں ترشی تھی۔

”دو نہیں ہے انہیں اتنا دکھ نہ تکلیف۔ وہ اپنے گھر والوں جیسے ہیں اپنی ماں اور اپنی بہن جیسے دونوں پتھروں، بے حس عورتیں ہیں۔ انہیں دل میں جتنی میری گودا جڑنے کی خوشی ملی اور کسی بات کی نہیں۔ اور امی! آپ اس شخص کی باتوں پر پھل رہی ہیں جبکہ اس کی ماں ہر روز اس کے کانوں میں ایک ہی صورت پھونکتی ہوگی کہ بشری جیسی بیوی کو چھوڑ دینا ہی اس کے لیے بہتر ہے اور آپ دیکھیے گا۔ وہ آج یا کل یا چند مہینوں بعد ماں کے کہنے پر ایمان لے آئے گا اور مجھے یہیں بیٹھے طلاق ہوگی اور آپ کو اس بھلی طبیعت کے شخص کی دوسری شادی کا کارڈ بھی موصول ہو جائے گا۔ وہ ایسے ہی ہیں سب بے حس تکینے ٹھکڑیا۔ میں ان لوگوں میں واپس نہیں جاؤں گی اور بے

نگر رہی۔ یہاں بھی بڑی نہیں رہو گی۔ کسی دارالامان میں چلی جاؤں گی۔ آپ پہ مصیبت بن کر بیٹھی نہیں رہوں گی۔“ وہ زور زور سے چلانے لگی تھی۔

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تمہیں سمجھانا دیوار سے سر پھوڑنے کے برابر ہے۔ کوئی بات عقل، تمیز کی تمہاری سمجھ میں ہی نہیں آتی۔ اپنا نقصان اپنا خسارہ لیے بیٹھی چلاتی رہتی ہو۔ خدا نخواستہ اگر اس نے واقعی ماں کے کہنے پر تمہیں چھوڑ دیا تو دماغ ٹھکانے آجائے گا تمہارا پھر کرنا یہ اونچی اونچی باتیں۔ جب بچی کو لے کر اس کی پرورش کے لالے پڑیں گے۔ بچوں کے باپ صرف اپنے ہی بچوں کے ہوتے ہیں۔ تمہیں دو سرا شوہر مل جائے گا

اور اسے دوسری بیوی۔ پر اس بچی کو اپنا باپ نہیں ملے گا۔ اپنی آرزو کی فکر ہے۔ انا کی ضد سوار ہے تم پر۔ اس معصوم کے بارے میں سوچا ہے جو گھنٹوں باپ کے انتظار میں گیٹ کے آس پاس صبح اٹھتی ہی منڈلانا شروع کر دیتی ہے۔ سنو بشری ابلی بی بی بے حس تمہارے سسرالی اور تمہارا شوہر ہے یا نہیں مگر تم ضرور ہو۔“ ذکیہ بھی دوبارہ بولتی چلی گئیں۔ بشری ماں کو دیکھتی رہ گئی۔



مثال دروازے کے پیچھے ماں اور نانی کی باتیں سنتے ہوئے آنکھوں میں آنسو لیے کھڑی تھی۔

”اگر ماما کبھی بھی گھر نہ گئیں اور نانا کہہ رہی ہیں اگر پاپا بھی ان سے ناراض ہو گئے تو ہم کہاں جائیں گے نانو کے گھر سے۔“ اس کا چھوٹا سا ذہن اتنی بڑی کتنی سمجھانے سے قاصر تھا۔

”ہاؤ! عمران نے پیچھے سے اگر مثال کو ڈرا دیا۔

وہ ڈر کر ایک دم سے رونے لگی۔

”ارے رے میری جان، میری پیاری گڑیا لڈر پوک میں تو مذاق کر رہا تھا۔ یونہی تمہیں دیوار سے پیچھے دیکھ کر سوچا۔ تمہیں ڈراؤں مذاق کر رہا تھا مثال جانو! اچھا یا ر سواری چپ تو کرف۔ کیوں اپنی ماما اور نانو سے میری شامت

بلوائی ہے۔" وہ اس کے رونے سے اسے چکارنے لگا۔

"اچھا چلو آؤ جلدی سے تمہیں آؤس کریم کھلا کر لاتا ہوں بلکہ مثال کی پسند کی چاکلیٹ اور کھلونے بھی لے گیا لے گی میری گڑیا!" وہ اس کا چہرہ نرمی سے نشو سے صاف کرتے ہوئے اسے گود میں ذرا سا اٹھا کر پیار سے ہلکانے لگا۔

"نہیں۔ مجھے کچھ نہیں کھانا ماموں!" وہ چہرہ صاف ہونے کے بعد سنجیدگی سے بولی۔

"مثال!" اس کے یوں انکار پر عمران کچھ حیرانی سے بولا۔

"ماموں! میرا دل نہیں چاہ رہا۔" وہ آہستگی سے گود سے اتر گئی۔

"کیا: واپس آؤ، ہو گئی ہو مجھ سے؟" وہ اس کے بال سلجھا کر بولا۔

"نہیں تو۔" وہ بڑے پن سے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"تو پھر ماموں کے ساتھ چلنے سے انکار کیوں؟"

"دل نہیں چاہ رہا ناں ماموں!" اسے واقعی آج کل کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ بس دل چاہ رہا تھا وہ جلدی سے پایا ماما کے ساتھ اپنے گھر چلی جائے۔ نانو کے گھر آئے بھی تو پہلے کی طرح بس ایک دو روز کے لیے یا چند گھنٹوں کے لیے۔

وہ بشری سے اب کچھ اس لیے نہیں کہتی تھی کہ وہ فوراً اسے باپ کی چچی اور جانے کیا کیا کچھ کہنے لگتی تھی۔

پاپا کے سامنے بھی کھل کر اپنی خواہش نہیں کہتی تھی۔ اگر پاپا اسے ساتھ لے گئے تو وہ ماما کے بغیر نہیں رہ سکے گی۔ رہ تو وہ پاپا کے بغیر بھی نہیں پارہی تھی مگر وہ اپنی تکلیف کسی سے بھی نہیں کہہ پارہی تھی۔

اچھا چلو۔ جھولے لینے چلتے ہیں۔" عمران نے اسے ایک اور ہلا دیا۔

ماموں! مجھے نہیں جانا۔ میرا ہوم ورک بھی رہتا ہے۔ ابھی وہ بھی کرنا ہے اور ایک نیسٹ بھی ہے کل میرا دل کی تیاری بھی کرنی ہے مجھے۔" اسے بھی بڑوں کی طرح جان چھڑانے کے لیے بہانے بنانے آتے جا رہے تھے۔

"جان! اس کی تو اب فکر ہی نہ کریں۔ آپ کے ماموں یوں چٹکیوں میں ہوم ورک بھی کروادیں گے اور نیسٹ کی تیاری بھی۔" عمران چٹکی بجا کر مزے سے بولا۔

"چلو اب مزید ایکسکووز ختم کریں آپ اور جلدی سے چلیں میرے ساتھ۔ جھولے بھی لیں گے اور آؤس کریم بھی چلے گی۔ سچ میرا بھی بہت دل چاہ رہا ہے آؤس کریم کھانے کو اب چلو فناٹ۔ میں آپ سے کہہ کر آتا ہوں۔" وہ کہہ کر اندر جانے لگا۔

"ماموں! مجھے نہیں جانا ناں۔ میں نے آپ سے بولا بھی ہے پھر آپ کیوں بار بار کہے جا رہے ہیں۔" وہ ایک دم زور سے بولی۔

عمران کے آگے بڑھتے قدم وہیں ٹھنک سے گئے۔

اس طرح مثال نے کبھی بات نہیں کی تھی یوں چیخ کر بد تمیزی سے۔ وہ تو بڑی تمیز والی محبت کرنے والی بچی تھی۔ سب کا ادب کرنے والی۔

"کیا ہوا ہے اس طرح بد تمیزی کیوں کر رہی ہو۔ اگر آپ نے نہیں جانا تو مت جاؤ لیکن بات کیا ہے ماموں کی نہیں بتاؤ گی۔" وہ جھک کر اسے پیار کر کے بولا۔

"ماموں! مجھ سے بچنے والے ہیں نا؟"

"ہاں کیا ہوا۔ کہیں اور جانا ہے آپ نے چھ بچے؟" وہ نرمی سے بولا۔

"بایا آنے والے ہیں نا مجھے ان کا انتظار ہے۔" وہ مغلوب سے لہجے میں بولی۔ عمران ہونٹ بھیج کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر ایک جھٹکے سے اسے چھوڑ کر اندر چلا گیا۔

مثال بے بسی سے عمران کو جاتا دیکھتی رہی۔

ہسپتال میں دونوں میں جو تپ کھائی ہوئی تھی۔ اس کے بعد عمران نے عدیل سے بات نہیں کی تھی۔ عدیل گھر بھی آتا تو وہاں کے مجبور کرنے پر سرسری انداز میں سلام کر کے گزر جاتا تھا۔

عدیل نے بھی اس کی خفگی کی پروا نہیں کی تھی۔ عدیل کو اس وقت سوائے بشری کی خفگی اور کسی کی پروا تھی بھی نہیں۔

بشری جس نے اتنے دنوں سے اسے اپنی شکل نہیں دکھائی تھی۔ کبھی کبھی تو اس کا خون اپنی اس ذلت اتنی بری طرح سے کھولتا کہ جی چاہتا وہ بستوں سے بشری کا اپنا اور مثال کا خاتمہ کر دے۔

گھر جاتا تو ماں اور بہن کے طعنے کان کے طنز اس کا سینہ چھتی کرنے لگتے۔ سسرال میں آتا تو بشری کا نہ ملنا اسے اور بھی اپنی نظروں میں گرا جاتا۔ وہ سب کچھ صرف مثال کے لیے برواشت کر رہا تھا۔

باہر گاڑی کا بارن بجا اور مثال بھاگتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اس کے پیپا آگئے تھے۔



"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ ہاشم بھائی؟" عاصمہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

"کون تمہاری کمینہ زبیر۔ کچھ نہیں چھوڑ کر گیا۔ سب کچھ لے اڑا ہے۔ تم اندھی تھیں۔ انسانوں کی تمہیں ذرا بھی پہچان نہیں۔ ایسا اندھا اعتماد تو کوئی اپنے سگوں پر نہیں کرتا تھا۔ تم نے ایک غیر شخص پر کر ڈالا۔"

وہ غصے میں بولتا چلا گیا۔ عاصمہ بے بسی سے بھائی کی شکل دیکھتی رہی پھر نظریں جھکا کر یوں بیٹھ گئی جیسے اب کبھی نہیں بولے گی۔

باہر شام ڈھل رہی تھی۔ چڑیاں اپنے گھروندوں کو لوٹ آنے کے بعد شور کر رہی تھیں۔ اس کا دل بے اختیار خواہش کرنے لگا کہ کاش وہ کوئی چیز یا کوئی سوخت سے ٹوٹا کوئی بے جان پتیا کوئی چیونٹی۔ کب کی پیروں کے نیچے آکر مسکی جا چکی ہوتی۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

- ☆ تئلیاں، پھول اور خوشبو راحت جیس قیمت: 250 روپے
- ☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 600 روپے
- ☆ محبت بیاں نہیں لہنی جدوں قیمت: 250 روپے

شمارے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

مگر وہ تو اشرف المخلوقات میں سے تھی۔

غم جھیلنے اور غم سے نپٹنے کا سلیقہ خدا نے اپنی اسی مخلوق کو دیا ہے۔ اس نے غم سے بوجھل پلکیں اٹھا کر ہاشم کو دکھا۔

ہاشم کا موڈ سخت آف تھا۔

وہ بھی ٹھیک تھا بے چارہ جس دن سے آیا تھا مسلسل بھاگ دوڑ میں لگا تھا۔ بڑی مشکل سے عفان کے ہنسی سے دوبارہ فائل نکلائی۔ پھر سے حساب کتاب لگوا دیا۔

جمع تفریق ضرب تقسیم۔ ہر طرح سے التامیدھا ہیر پھیر کر کے بھی حساب کر لیا۔ سارا خسارہ عاصمہ کے حصے میں آ رہا تھا۔

وہ عفان کے سارے واجبات اپنے اکاؤنٹ میں پہلے ہی ٹرانسفر کروا چکا تھا۔ اور عاصمہ نے بہت سی جگہوں پر آنکھیں بند کر کے سائن کرتے ہوئے اس شیطان کے لیے آسانیاں پیدا کر رہی تھیں۔

”عفان کا تو ایک دھیلا نہیں چھوڑا اس نے تمہارے اور بچوں کے لیے غضب خدا کا ایسا بھی کوئی ظالم انسان ہو گا۔ تیریوں کا مال لے اڑا۔ یقیناً زندگی میں بہت ذلیل و رسوا ہو گا لیکن۔ اس وقت تو وہ تمہارے لیے ہر راز میں بند کر گیا۔ میرے ہاتھ لگ جائے۔“ ہاشم مٹھیاں بھیج رہا تھا۔

وائف گم صدم کبھی ماں کی طرف دیکھتا اور کبھی ہاموں کے ایک ایک لفظ کو بغور سنتے ہوئے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے بہت کچھ سمجھ میں آ رہا تھا اور بہت کچھ تھا جو وہ سمجھتے ہوئے بھی سمجھنا نہیں چاہ رہا تھا۔

”بھائی! اس کے گھر کا ایڈریس؟“ عاصمہ بہت مدہم آواز میں بولی۔

”کچھ نہیں بچا۔ وہ کہیں کوئی اپنا پتہ نشان نہیں چھوڑ کر گیا۔“

”عفان کے ساتھ وہ کتنی بار گھر آیا تھا؟“ ہاشم اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھ رہا تھا۔

”دس۔ چار بار۔ شاید۔“ نظروں کے ساتھ عاصمہ کی آواز اور بھی پست ہوئی جا رہی تھی۔

”اور بیوی بچوں کے ساتھ؟“ وہ پھر سے بولا۔

عاصمہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”کوئی بھی نہیں جانتا۔ اس کی فیملی تھی بھی یا نہیں۔ عفان کے پاس نے بھی اپنے ذرائع سے کافی بھاگ دوڑ کروا کے پتا چلانے کی کوشش کی ہے مگر وہ شیطان گدھے کے سر سے سینک کی طرح غائب ہے۔“

کمرے میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔

ایک کے بعد ایک بڑی اور بڑی خبریں آ رہی تھی۔

ہاشم تو خود یہاں آ کر پھنس چکا تھا۔ اب نہ تو وہ عاصمہ اور بچوں کو یونہی بے یار و مددگار چھوڑ کر جاسکتا تھا اور نہ اپنے پیسے اتنی موٹی رقموں سے سکا تھا کہ ان کے سر پر چھت بھی آجانی اور مستقل آمدنی کی کوئی صورت بھی۔

”میں نے آپ یہاں بلوا کر تاحق پریشان کیا ہے بھائی!“

عاصمہ کو کچھ تو کہنا ہی تھا اور یہ سب کچھ جو غلط اور الٹ ٹھیک ہوا تھا اسی کی وجہ سے تو تھا۔

ہاشم نے کچھ کوفت سے اس کی طرف دیکھا مگر جواب میں کچھ نہیں کہا۔ عاصمہ عدل موس کر رہی تھی۔

”یہاں۔۔۔ یہ مالک مکان کافی اچھے ہیں۔ انہوں نے گھر خالی کرنے کو نہیں کہا۔ چند ماہ میں یہاں اور گزار سکتی ہوں پھر عدت کے بعد کوئی چھوٹی موٹی کسی اسکول میں نوکری کر لوں گی اور گھر بھی کوئی چھوٹا سا دیکھ لوں گی۔“

نے رک کر ہاشم کے ماتھے بڑے تلوں کو شمار کرنے کی کوشش کی۔

”محلے والے بھی کافی اچھے ہیں۔ خیال رکھنے والے اور تعاون کرنے والے۔ بچوں کے اسکول میں بھی میں نے

بات کر لی ہے۔ وہ ان کی فیس میں بھی کچھ رعایت کرویں گے۔“ وہ رک کر بولی۔

”تم جو کہنا چاہتی ہو صاف کہو۔“ ہاشم بے زاری سے بولا۔

”آپ واپس چلے جائیں۔ میری وجہ سے اتنی تکلیف نہ اٹھائیں۔“ وہ اٹک کر بولی۔

”تمہارا کیا خیال ہے میں تمہارے لیے یہ سب کچھ کر رہا ہوں؟“ وہ کھلے لہجے میں بولا۔

عاصمہ سن کر رہ گئی۔ اسے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔

”یہ معصوم سوال کرتی آنکھیں اور اپنے مرے ہوئے بہنوئی کی بے چین روح۔ یہاں ہے عفان میرے خواب میں آیا رات کو۔ میں نے دیکھا وہ سارے گھر میں پریشان پھرتے ہوئے کبھی کمرے کے دروازے بند کرتا ہے اور کبھی کھڑکیاں۔ یوں جیسے اسے تم لوگوں کی حفاظت کے خیال نے پریشان کر رکھا ہے۔ اور تم کہتی ہو تم یہاں محفوظ ہو؟“ وہ بڑبڑا کر بولا۔

عاصمہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

اس نے اتنے دنوں سے ایک بار بھی عفان کو یاد کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

وہ عفان کی یاد سے آنکھیں مٹا ہی نہیں سکتی تھی۔

کوئی بھی اس کے مرے ہوئے شوہر کا نام لیتا اس کا دھڑکتا دل لمحہ بھر کو تھم سا جاتا۔ جیسے وہی عفان کو مارنے والی ہے۔

موت کے بعد مارنے والی۔

کوئی مرنے کے بعد بھی مرتا ہے؟

اس نے عفان کو یہ دو سری موت دی تھی تو کیسے اس کا ذکر سن پاتی۔

ہاشم اٹھ کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

”تم فکر مند نہیں ہو۔ میں آیا ہوں تو ان شاء اللہ تمہارے اور بچوں کے لیے کچھ کر کے ہی جاؤں گا۔ نہ کچھ ہو سکا تو پھر میں خود دو چار سالوں میں واپس آنے کی کوشش کروں گا۔“ وہ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”تم نے خود کو سنبھالنا ہے عاصمہ! تمہاری اس حالت کی وجہ سے بچے بہت پریشان ہیں۔ دیکھو! باپ اور دادا تو اللہ نے ان سے چھین لیا اب وہ ماں اور باپ دونوں کو تم میں تلاش کریں گے۔ تمہیں بہت حوصلہ رکھنا پڑے گا۔“ وہ وائف کو اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے کر پاس بٹھاتے ہوئے بولا۔

”مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے ہاشم بھائی۔ میں مرجانا چاہتی ہوں۔ میرا زندہ رہنے کو دل نہیں چاہتا۔“ اس کے ضبط کے بندھن پھر ٹوٹنے لگے۔

وائف کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

”ان چاروں کو کس کے حوالے کر کے جاؤ گی؟“ ہاشم اسے دیکھ کر بولا۔

”جس کے حوالے وہ دونوں کر کے گئے ہیں۔“ وہ رندھی آواز میں بولی۔

ہاشم تاسف سے اسے دیکھنے لگا۔

”مجھے تم سے ایسی باتوں کی امید نہیں تھی عاصمہ!“ وہ دکھ بھرے لہجے میں کہہ گیا۔

معاشی مسائل تو بہت سے تھے لیکن عاصمہ کا ٹوٹا ہوا وجود اور اس کا یوں بات بات پر بکھر جانا اور مرے کی باتیں کرنا زندگی میں ریچی لیٹی سے مسلسل انکاری ہونا۔ وہ تو بچوں سے بھی اکثر بے نیاز بیٹھی رہتی۔ ہاشم کو یہ چیز بہت پریشان کر رہی تھی۔

اس معاملے میں اسے لگتا وہ بھی ہمت چھوڑ بیٹھے گا اور سب کچھ یونہی چھوڑ کر واپس چلا جائے گا۔ لیکن کیا

اسے واپس جا کر چین آجائے گا۔ سکون مل سکے گا؟

”خاصہ! تمہیں کیا ہوا ہے۔ کچھ ہے جو میں نہیں جانتا۔ تم اتنی مایوس، اتنی ناامید کیوں ہو۔ اللہ کی ذات پر بھروسہ کیوں کمزور پڑ گیا ہے۔ تم تو بہت بہادر تھیں، بہت ہمت والی پھر ایسی باتیں کیوں کرنے لگی ہو۔“ وہ اس کے سر پر دوپٹا ٹھیک کرتے ہوئے نرمی سے پوچھنے لگا۔

خاصہ کو اسی لمحے احساس ہوا کہ اس طرح تو وہ خود کو ساری دنیا کے سامنے تماشا بنا رہی ہے۔ جس اللہ نے رات کے اندھیرے میں اس کی تار تار ہوئی عزت کا پردہ رکھا ہے، وہ اسی چادر کو سارے میں پھیلا کر گڑگھار ہی ہے۔ اس کا مسلسل رونا دھونا، زندگی سے بے زار ہونا بچوں سے لے لعلق ہونا کوئی آنکھوں کا اندھا بھی ہو گا تو وہ بھی کسی نہ کسی طرح معاملے کی تہ تک پہنچ جائے گا۔

وہ خود ہی ٹھٹک کر رہ گئی۔

”بتاؤ مجھے۔ کیا ہوا ہے؟“ ہاشم نرمی سے پوچھنے لگا۔

خاصہ نے جلدی سے چادر سے اپنا چہرہ رگڑا لیا۔

”نہیں اسے یوں خود کو انشا نہیں کرنا جو زیادتی اس کے ساتھ ہو چکی ہے، وہ دامن اٹھا کر سب کے سامنے خود کو بے لباس نہیں کرے گی۔ اس کی زندگی تو برباد ہو ہی چکی ہے۔ اس کی اس بے صبری سے اس کے بچوں کی زندگی میں سب کچھ فنا ہو جائے گا۔ خاص طور پر اس کی تینوں بچیوں کی زندگی میں کچھ نہیں بچے گا۔ صرف ایک بے کردار ماں کی کہانی کے سوا!“

اسے یہ سب نہیں کرنا۔

”واثق! دیکھو بچن میں ہندیا کے نیچے چولہا جل رہا ہے، جا کر بند کرو۔“

وہ جواتے دنوں سے نہیں سنبھل رہی تھی۔ ایک لمحے نے اسے سمیٹ لیا تھا۔ بہت کچھ ابھی باقی تھا۔ بہت کچھ ابھی بھی جوڑا جا سکتا تھا۔ اس کے دل کو اتنے دنوں میں پہلی بار امید سی بندھی تھی۔

”پاپا!“

گاڑی میں بیٹھتا ہوا عدیل وہیں ٹھٹک کر رہ گیا۔

مثال اس بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے پاس واپس آیا۔

جی میری جان! آپ کو میرے ساتھ چلنا ہے؟“ وہ اس کے اس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

مثال نے نفی میں سر ہلا دیا۔ عدیل اسے دکھتا چلا گیا۔ وہ کتنی کمزور سی ہو گئی تھی۔

”آپ کو کیا کہنا ہے مثال مجھ سے؟“ وہ اس کی مسلسل چپ رہ پوچھنے لگا۔

”پاپا! ہم یہاں نانو کے گھر تک اور رہیں گے۔“ وہ رگ رگ کر بولی۔

اگرچہ وہ پہلے بھی ادل بدل کر یہی سوال عدیل سے کئی بار کر چکی تھی مگر وہ اسے کوئی بھی تسلی بخش جواب نہیں دے سکا تھا۔ اب بھی عدیل گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

”پاپا! مجھے جواب دیں نا!“ وہ اس کا کندھا ہلا کر بولی۔

”جان۔۔۔ آپ ماما سے یہ بات کیوں نہیں پوچھتیں؟“ وہ اس کے سنہری بال سہلا کر بولا۔

”مجھے ماما سے ڈر لگتا ہے۔ میں ان سے یہ سوال۔۔۔ کوئی بھی سوال نہیں پوچھ سکتی۔“ اس نے بہت دیر میں

سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا تھا کہ کہیں اس کی بات سے پاپا کچھ اور نہ سمجھ لیں۔ عدیل کے لب بھینچ سے گئے۔

”وہ آپ کو مارتی ہیں؟“ وہ توقف سے بولا۔

مثال نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”تو پھر آپ کو ماما سے کیوں ڈر لگنے لگا ہے مثال! اور میری جان ماما سے تو کوئی بھی نہیں ڈرتا بلکہ بچے تو اپنی ہر بات صرف اپنی ماما سے شیر کرتے ہیں۔ آپ بھی اپنی ماما سے نرمی سے پیار سے یہ بات پوچھو۔“ عدیل نے اسے سنبھالایا۔

مثال نے پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

”ماما بہت جلدی شاؤٹ کرنے لگتی ہیں یا پھر رونے لگتی ہیں یا پھر مجھے کہتی ہیں۔ چلی جاؤ یہاں سے یا پھر کمرہ لاک کر لیتی ہیں، پھر نانو بھی انہیں بلاتی ہیں تو وہ باہر نہیں آتیں۔“ مثال رک رک کر باپ کو ماں کی ذہنی حالت سے آگاہ کر رہی تھی۔

عدیل فوری طور پر کچھ نہیں بول سکا۔ اسے معلوم تھا بشری اسی طرح کر رہی ہوگی۔

لیکن اب تو اس واقعہ کو بہت دن گزر بھی چکے۔ اب تو اسے سنبھل جانا چاہیے۔ اور کچھ نہیں تو مثال کی ذہنی تکلیف کو سمجھنا چاہیے کہ بچی اس ساری صورت حال سے کس طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہی ہے۔ اسے بشری سے اس بچکانہ رویے کی امید نہیں تھی۔

امیدیں تو ہمیں خود سے بھی بہت ہوتی ہیں کہ ہم بہت میچور ہو چکے ہیں مگر بعض اوقات ہم اکثر ایسا رو عمل کر جاتے ہیں کہ بعد میں ہمیں خود پر رونا آتا ہے جیسے اس معمولی سے زبانی جھگڑے میں عدیل نے بشری کے ساتھ جو سلوک کیا۔ کیا وہ بچکانہ نہیں تھا۔ وہ ٹھنڈا سانس لے کر رہ گیا۔

”ماما کہاں ہے اب تمہاری؟“ وہ مثال سے بولا۔ آج بھی وہ ڈھائی گھنٹے بیٹھا رہا تھا۔ مگر بشری نے ملنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

ذکیہ نے عدیل کو بہانے سے ٹالا کہ بشری۔۔۔ کی طبیعت اچھی نہیں تھی۔ نیند کی گولی لے کر سو رہی ہے اور بھی بہت کچھ۔

عدیل سمجھ رہا تھا مگر خاموش تھا کہ بہر حال اس سارے معاملے کو بگاڑنے میں عدیل کی غلطی زیادہ تھی۔ مگر ایسا اور کتنے دن چلے گا۔ وہ خود بھی تھک چکا تھا۔ روز آئس سے آکر یہاں پوچھنے بے مقصد بیٹھے رہنا۔ اتنے دنوں میں بشری ایک بار بھی اس کے سامنے نہیں آئی تھی نہ اس کا نون سنتی تھی۔

کئی بار اس کے خون میں غصہ کے زبردست ابال اٹھے۔

اس نے بھی سوچ بھی لیا کہ اب وہ نہیں آئے گا اس ضدی عورت کو منانے کے لیے۔

مگر پھر مثال، مثال کی معصوم صورت اسے جیسے ہی آئس ٹائم ختم ہوتا کھینچ کر یہاں لے آتی۔ مگر وہ بچی ان دونوں کی اس لڑائی سے کس قدر سہم چکی تھی۔ اگر اس کے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہو جاتا۔ بشری کو ماں ہوتے ہوئے اس بات کی نزاکت کا احساس ہونا چاہیے تھا۔

”ماما سو رہی ہیں تمہاری؟“ وہ اس کے ساتھ چلتا ہوا اندر چلا آیا۔

”نہیں۔۔۔ اپنے روم میں ہیں۔“ مثال ادھر ادھر دیکھ کر محتاط لہجے میں بولی کہ اگر کسی نے سن لیا کہ مثال نے

عدیل کو بشری کے بارے میں بتایا ہے تو کہیں اس کی پٹائی نہ ہو جائے۔

”اوکے جان! ایک منٹ یہاں رکو۔ میں ابھی آپ کی ماما سے بات کر کے آتا ہوں۔ اوکے“ وہ سر ہلا کر رہ گئی اور عدیل اندر چلا گیا۔

عاصمہ نے سارے زیورات لاکر ہاشم کے سامنے رکھ دیے وہ کتاب بردھتا وہیں ٹھنک کر رہ گیا۔
 ”میں نے اتنی ہزار کی ایک کمیٹی بھی ڈال رکھی ہے جو تجھے اگلے مہینے مل جائے گی۔ اس کے علاوہ پندرہ ہزار اور بھی ہیں۔“ وہ چہرے پر گہری سنجیدگی لیے ہوئے تھی۔
 ”لیکن یہ سب کس کے عاصمہ؟“ ہاشم نرمی سے بولا۔
 عاصمہ لمحہ بھر کو کچھ بول نہیں سکی۔

دل ضدی اسی بچکانہ خواہش پر اڑا ہوا تھا کہ اس کے بچوں کے سر پر اپنی بچت ہونی چاہیے۔
 ”بھائی۔ کیا یہ ممکن نہیں۔۔۔ چھوٹا سا بھلے ایک کمرے کا گھر میرا۔ میرے بچوں کا بھی ہو۔۔۔ بھلے یہ زیور بک جاتے اور جو کچھ بھی ہے۔ بلکہ چار لاکھ جو چچا اسلم دے گئے تھے۔ وہ بھی پڑے ہیں اس کے علاوہ۔“ وہ جلدی جلدی بولی۔

”دیکھو! اپنا گھر ہونے سے زیادہ یہ اہم ہے عاصمہ! تم ہمت کرو بہادر بنو۔ خود کو سنبھالو ورنہ کل کو کوئی بھی چال باز لیٹر اپھر سے تمہارے گھر کے کاغذ لے اڑے گا اور تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔“ ہاشم اسے جانے کیا جتانے کو بولا۔ عاصمہ سر جھکا کر رہ گئی۔

وہ پھر سے خود کو کمزور لمحوں کے حوالے نہیں کرنا چاہتی تھیں۔
 ”ہمت سمجھوتے کیے ہیں ان کچھ دنوں میں۔ یوں جیسے میں کئی سال آگے نکل آئی ہوں۔ دعواتو نہیں کرتی لیکن کوشش کروں گی۔ آئندہ ہمت محتاط رہوں گی۔“ وہ رک رک کر یوں آہستہ سے بولی جیسے یہ خود کو باور کرا رہی ہو۔

ہاشم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
 ”یہ تو بہت اچھی بات ہے بلکہ مجھے خوشی ہے کہ تم نے بالآخر خود کو سمجھا لیا ہے۔ خود کو کپوز کر لیا ہے۔ بجائے اس کے کہ کوئی تمہیں سنبھالنے بجے بہت ڈسٹرب ہیں تمہارے اس رویے کی وجہ سے۔“ وہ بولا۔
 ”میں سمجھ رہی ہوں بھائی! وہ آہستگی سے بولی۔

”شفار انکل کی گریجویٹی کی رقم اللہ کا شکر ہے اس بد معاش کے ہاتھ لگنے سے بچ گئی اور کچھ رقم جو تمہارے پاس ہے۔ سہرحال میں کوشش کرتا ہوں اتنے میں کوئی نہ کوئی چھوٹا موٹا گھر تمہارے لیے دیکھ سکوں۔“ وہ بولا۔
 ”ایچو۔ سکی عاصمہ! میں پندرہ دن سے زیادہ یہاں رک نہیں سکتا۔ مجھے مزید چھٹی نہیں ملے گی۔“ وہ رک کر بولا۔ عاصمہ پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

”لیکن تم پریشان نہیں ہو میں تمہیں اور بچوں کو یوں چھوڑ کر تو نہیں جاؤں گا۔ صبح دو تین ڈیلرز نے مجھے کچھ گھر دکھائے ہیں اس کے بعد ان شاء اللہ میں تمہیں دکھاؤں گا اور ہم ایک دن میں سب کچھ فائل کر لیں گے تو ان شاء اللہ ہفتہ دو دن میں یہ کام ہو جائے گا۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ عاصمہ کے لہجے میں پھر سے آس امید تھی
 ”تم فی الحال یہ زیور اور رقم وغیرہ سنبھال کر رکھو۔ آج کل حالات بالکل بھی اچھے نہیں ہیں۔ کوشش کروں گا جلد سے جلد یہ معاملہ سمپل ہو سکے۔“ وہ زیور کے ڈبے اسی بھیلے میں ڈالنے لگا جس سے عاصمہ نے نکالے تھے۔
 ”بھائی! میں آپ کی بہت شکر گزار رہوں گی۔“ عاصمہ نم آواز میں کہنے لگی۔
 ہاشم نے اس کو روک دیا۔

میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں میں یہ سب کچھ تمہارے لیے نہیں مان معصوم بچوں کے لیے کر رہا ہوں اور میں نے بھی سوچ لیا ہے میں سال دو سال میں وہاں سے سب کچھ وائینڈ اپ کر کے پاکستان آ جاؤں گا۔
 میں تمہارے پاس کسی کو ہونا چاہیے جب تک بچے چھوٹے ہیں۔“ عاصمہ سر ہلا کر رہ گئی۔
 اسے معلوم تھا یہ سب کچھ اتنی جلدی ممکن نہیں مگر وہ خاموش رہی۔



کہا سمجھتی ہو تم خود کو ایسی کون سی قیامت ٹوٹ گئی ہے کہ جس کا ازالہ ہی ممکن نہیں۔ ”بشری کے گمان میں ہی نہیں تھا کہ عدیل یوں اچانک کمرے میں آ کر اسے اس طرح جھنجھوڑا لے گا۔
 لمحہ بھر کو تو وہ شاکڈرہ گئی۔ کچھ بول ہی نہ سکی۔

”تم اگر میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں تم نے کوئی فیصلہ کر لیا ہے تو میرے سامنے اگر مجھ سے بات کرو یوں نہ چپا کر بیٹھ گئی ہو جیسے۔“

”منہ میں نہیں تم چھپاؤ گے اگر میں سارے میں۔“
 ”بنا دو سارے میں چیخ چیخ کر ساری دنیا کو بتا دو۔ تمہارے ساتھ کچھ ایسا انوکھا نہیں ہوا ہے وہ بچہ صرف تمہارا نہیں تھا میرا بھی تھا۔ جتنا اس کے جانے کا تمہیں دکھ ہے مجھے بھی اتنی ہی تکلیف ہے۔ تم یہ سب ڈراما کر کے کیا بات کرنا چاہتی ہو۔“

بشری اس کے انداز پر ایک دم سہم کر رہ گئی۔ وہ اسے پھر سے اس دن والا عدیل لگا تھا جب یہ منحوس واقعہ ہوا
 ماور فوری طور پر کچھ بول ہی نہ سکی۔
 ”اتنی خود غرض اتنی بے حس ہو گی تم یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ چھوٹی سی معصوم بچی تمہاری اس ضد اور ہمت دھری سے کس طرح سہم کر رہ گئی ہے۔ تمہیں کچھ احساس ہے؟“ وہ اس کے سامنے یوں تن کر کھڑا تھا کہ اس کے پاس فرار ہونے کا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔

”وہ خوش ہے یہاں میرے ساتھ۔“ وہ نظریں چرا کر کمزور آواز میں بولی۔
 ”خوش۔ خوشی کا مفہوم جانتی ہو تم؟“ وہ پھر سے اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔
 ”چھوڑو مجھے اور جاؤ یہاں سے میں نے تم سے کوئی بات کرنی ہے نہ کچھ کہنا ہے۔“ وہ اسے نفرت سے دیکھ کر لڑتے بولی۔

عدیل سر و نظریوں سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔
 ”تم جیسی عورتیں اس قابل ہوتی ہی نہیں کہ انہیں اتنی محبت دی جائے کہ وہ اپنی اوقات ہی بھول جائیں۔“
 ”ایک دم اسے بیڈ پر دکھاوے کر نفرت سے بولا۔

”گورم جیسے مرد جن میں مردانگی صرف یہ ہے کہ عورت پر ہاتھ اٹھایا جائے اسے کمزور سمجھ کر جب چاہے مارا دیا جائے اور جب دل چاہے اس کے پاس چل پڑے نفرت ہے مجھے تم جیسے مردوں سے۔“ وہ بھی جواباً ”نور لڑتے چلائی۔

عدیل وہیں رک کر رہ گیا۔
 ”نفرت ہے تمہیں مجھ سے؟“ وہ ایک قدم آگے بڑھ کر بولا۔
 ”ہاں۔ ہاں نفرت ہے مجھے تم سے۔۔۔ چلے جاؤ تم یہاں سے۔“ وہ ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہوئی۔ اسی طرح چلا کر بولی۔

عدیل نے زور سے ہونٹ بھیج لیے۔
 اس کے منہ سے وہ کچھ نکلنے والا تھا جو سب کچھ ختم کر ڈالتا پھر ان دونوں کے درمیان کچھ بھی نہیں بچتا۔
 ”تو پھر کیا چاہتی ہو تم بولو۔“ وہ اس کی طرف بڑھ کر بولا۔
 ”میں تم سے علیحدگی چاہتی ہوں۔“ وہ بیڈ سے اتر کر ایک طرف جا کھڑی ہوئی۔
 عدیل اسے دکھ بھری نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔
 اسے حیرت سی ہوئی۔ یہ وہ عورت تھی جس پر وہ آج تک اپنا سب کچھ لٹا چلا آیا تھا۔ اپنا دل اپنی دولت اپنی ہر
 خوشی اس نے اس کی خواہش کے تابع کر رکھی تھی اور وہ کیسے چند لمحوں میں خود کو پرانی کر بیٹھی تھی۔
 ”علیحدگی چاہیے تمہیں؟“ وہ سینے میں اکتے درد کو دبا کر بولا۔
 ”ہاں علیحدگی چاہتی ہوں میں تم سے۔ میں تم جیسے جنگلی انسان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی جسے یہ احساس
 نہیں کہ عورت کے ساتھ کیسے رہا جاتا ہے۔“
 ”کسی اور کو پسند کرنے لگی ہو؟“ وہ تخی سے بولا۔
 ”عدیل! وہ تڑپ اٹھی تھی۔
 ”میں تمہیں چھوڑوں گا مگر مثال کی شکل دیکھنے کو بھی ترس جاؤ گی تم۔ یہ بات یاد رکھنا۔“ وہ اس کی کمزوری کو
 جانتا تھا اس کو جتا کر بولا۔
 ”مثال کا تو تم نام نہیں لو گے وہ صرف میری بیٹی ہے اور میری ہی رہے گی۔ میں تم جیسے شخص کے خوالے اپنے
 نہیں کروں گی اور تمہاری ہاں ہوں۔“
 ”خاموش! اب ایک لفظ اور نہیں بولنا میں بھی پھر ملاحظہ اٹھاؤں گا۔“ وہ دھاڑ کر بولا۔
 ”اورہ! تو تم نے اب تک لحاظ رکھا ہوا تھا۔ خوب!“ وہ طنز بولی۔
 ”میں مثال کو ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔“ عدیل نے مڑتے ہوئے کہا۔
 ”تم مثال کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤ گے ورنہ میں اتنا شور مچاؤں گی کہ تمہارے لیے یہاں سے نکلنا مشکل ہو جائے
 گا۔“ وہ تیزی سے اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔
 عدیل اسے دیکھتا چلا گیا۔
 یہ وہی صورت تھی جس پر وہ دل و جان سے فدا تھا۔ جس کے لیے وہ نسیم اور فوزیہ کا ہر طعنہ سہہ جاتا تھا اور اس کا
 دل چاہتا تھا کہ دنیا جہاں کے سارے خزانے اس عورت کے قدموں میں ڈھیر کر دے اس کی کوئی بھی خواہش
 نہ رہے۔
 ”اچھا بس کرونا اب غصہ جانے دو۔ یہ دیکھو! میں تم سے کتنی بار تو معافی مانگ چکا ہوں پھر سے مانگ رہا ہوں وہ
 میرا بھی بچہ تھا مجھ سے واقعی بہت زیادتی ہو گئی میں اللہ سے بھی معافی مانگ رہا ہوں۔
 پلیز بشری! میری جان! میرے ساتھ چلو گھر ابھی۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اتنے دنوں سے کانٹوں کے
 بستر پہ ہوں مجھ پر رحم کرو۔“ وہ ایک دم سے بکھل گیا تھا۔ بشری کی کمزور شکل نے اس کا دل کھلا دیا تھا۔ بشری کی
 دل پل بدلتے روپ کے اس مرد کو جیرانی سے دیکھتی رہ گئی۔
 ”میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مثال ہم دونوں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میری جان آجاؤ واپس ہمارے دنیا
 ایک دوسرے کے بغیر ناممکن ہے اور حوری ہے تم ہو تو سب کچھ ہے ورنہ سب کچھ بالکل ادھورا ہے۔“
 وہ بے اختیار اسے اپنے ساتھ لگا کر بولا۔
 ”چھوڑو مجھے۔“ بشری نے کمزوری سے مزاحمت کی۔

”تمہیں چھوڑوں گا تو خود کیسے زندہ رہوں گا۔“ اس نے اور بھی گرفت مضبوط کی۔
 ”مجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا عدیل!“ وہ اسے برے دکھیل رہی تھی اور وہ اسے اور بھی قریب کرتا جا رہا تھا۔
 ”تو میں تمہارے ساتھ رہ لوں گا۔ تمہیں منالوں گا۔ راضی کر لوں گا۔ تمہارے بغیر سب کچھ بے رنگ ہے
 نہیں بھی زندگی ہے نہ خوشی بشری! چلو واپس ہماری بچی ہم دونوں کی وجہ سے کتنی ڈسٹرب ہے میرے گھر کا وہ
 خالی کمرہ جو صرف تمہاری ہی سنتا چاہتا ہے تمہاری آواز کو ترس گیا ہے۔ پلیز بشری! چلو میرے ساتھ۔“ وہ اسے
 اور بھی بانسوں کے گھیرے میں لے کر لٹاتا چلا گیا۔
 ”مجھے وہاں نہیں جانا۔“ وہ خود کو آزاد کرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی۔
 ”تم جہاں کہو گی میں تمہیں لے چلوں گا۔ بس مجھے چھوڑنے کی اور جانے کی بات نہیں کرو۔ تمہارے بغیر یہ
 جہاں کے دن کیسے گزرے ہیں کاش! میں تمہیں بتا سکتا۔“ وہ اس کے بکھرے بال سلجھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
 ”اتنے دنوں سے تو میرا خیال آیا نہیں۔“
 شاید عورت اسی کا نام ہے وہ اتنے دنوں سے اس چیز کی منتظر تھی جو اسے اسی طرح چھوڑ کر اپنا حق جتا کر
 اسے منالے۔ اس کے ساتھ زبردستی کرے۔
 عورت کو سمجھنا کتنا ناممکن ہے مگر اتنا بھی ناممکن نہیں۔
 عدیل بشری کو کھینچنے دیکھ کر مسکرایا۔
 ”کتنی کمزور ہو گئی ہو۔ کیا میرے بغیر رہ سکتی تھیں؟“ وہ پھر سے اسے دیکھ کر مسکرایا۔
 ”مگر عدیل! مجھے وہاں نہیں جانا آپ کے ساتھ۔“ وہ اس کی بانہیں زری سے ہٹا کر بولی۔
 ”کیا مطلب؟“ عدیل پہلی بار چونکا۔
 بشری نے عدیل کو جا چستی نظروں سے دیکھا۔
 ”مجھے یہ بات کہنی چاہیے یا نہیں۔“ اس نے لمحہ بھر کو سوچا اور پھر یہ بازی کھیل لینے کا سوچ لیا۔
 ”کہہ بیگم نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اس سے مناسب موقع اور کوئی نہیں ملے گا اپنی بات منوانے کا۔“
 ”مجھے الگ گھر چاہیے۔“ وہ رک کر بولی۔
 عدیل لمحہ بھر کو جیسے گنگ سا رہ گیا۔ اسے بشری سے اس فرمائش کی توقع نہیں تھی۔
 ”ورنہ میں آپ کے ساتھ کبھی نہیں جاؤں گی۔“ وہ حتمی کلمے میں بولی۔
 * * *

چھوٹا سا حن جس کی بمشکل ایک پلنگ اور دو کرسیاں آسکتی تھیں۔ آگے چھوٹا سا کچن اور دو چھوٹے کمرے
 ناصحہ کی امیدوں سے بہت بڑھ کر تھا یہ گھر۔ اس کا اپنا گھر۔
 وہ آنسو بھری بے یقین نظروں سے دیکھتی چلی جا رہی تھی۔
 باہر کی طرف سے اوپر جاتی سیڑھیاں تھیں اور اوپر بھی اس طرح دو کمرے، کچن اور باتھ روم تھا۔
 وہ تو حن میں ہی رک کر رہ گئی تھی۔
 ”عاصمہ! آؤنا کمرے تو دیکھ لو۔“ ہاشم اسے وہیں سے دیکھ کر بولا۔
 ”مما! آجا میں نا جلدی ہے دیکھیں تو۔ کمرے کتنے پیارے ہیں تھوڑے چھوٹے ہیں لیکن ہمارے پہلے والے
 کمرے بہت اچھے۔“
 واثق اور اریبہ بہت خوش تھے۔

اس کا تو دل چاہ رہا تھا۔ میں زمین پر سر ٹیک کر سجدہ شکر بجلائے۔

اس کے قدم زمین نے جکڑ لیے تھے۔ واقع اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا۔ وہ سحر زدہ سی گھر کو دیکھتی جا رہی تھی۔
 ”تا کچھ گنوا کر بالا خرا سے اپنا گھر مل ہی گیا۔“ اس نے دوپٹے کے کونے سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔
 ”عاصمہ! اس گھر کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ بہت ہوا دار ہے۔ لوگ بہت اچھے ہیں خیال زنگینوں سے۔
 تمہارا اور بچوں کا یہاں بہت جلد دل لگ جائے گا۔ اچھا ہے نا گھر۔“ وہ مسلسل بولتے ہوئے رک کر پوچھے۔
 ”بہت اچھا بھائی! میرے بچوں کی چھت ہے ان کے لیے جائے امان! کیوں اچھی نہیں ہوگی۔“ وہ گل کر
 مسکرائی۔

دو دن بعد اس کی عدت ختم ہو رہی تھی۔ سامان سارا ایک ہو چکا تھا۔ ہاشم اسے یہ گھر ایک نظر دکھانے کے لیے
 لایا تھا۔
 ”اور بھائی! یہ پچھلے گھر سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔“
 ”ہاں۔“

”بچوں کے اسکول بھی زیادہ دور نہیں اور گھر بھی بہت پر رونق جگہ ہے۔“ وہ بہت خوش تھی۔ اور بے فکر
 بولے جا رہی تھی۔ بچوں کے ساتھ ادھر ادھر کمروں میں پھر رہی تھی۔
 ہاشم بہن کو دیکھ کر خوش تھا۔ اس کے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔
 پورے طور پر نہ سہی اس نے کچھ حق تو ادا کر ہی دیا تھا۔
 ”اور میں نے اسلم سے بات کر لی ہے۔ بہت اچھی فیملی دے گا۔ وہ اوپر کرائے پر دینے کے لیے۔ آمدنی کا ایک
 ذریعہ یہ بھی ہو جائے گا۔“ ہاشم اسے تفصیل بتانے لگا۔ دونوں بہن بھائی بہت خوش تھے۔



عدیل کا سوچ سوچ کر دل غ تھکنے لگا تھا۔

وہ بشریٰ کو یہ ناممکن سی خواہش کیسے پوری کر سکتا تھا۔ الگ گھر بوڑھی ماں اور بہن کو اکیلا چھوڑ کر وہ کہاں سے
 گ۔ اور جب نسیم بیگم کو پتا چلے گا تو وہ کتنا ہنگامہ مچائیں گی۔
 وہ رات بھر ٹھیک سے سو نہیں سکا۔
 اس نے بشریٰ کو بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر اس کی ایک ہی ضد تھی۔ ورنہ وہ اس سے علیحدگی کے لیے تیار
 تیار تھی۔

وہ صبح بغیر ناشتہ کیے آفس چلا گیا۔

واپس پر چاہتے ہوئے بھی وہ بشریٰ سے ملنے نہیں جا سکا۔

بس یوں ہی سڑکوں پر بے مقصد گاڑی دوڑاتا رہا۔

راستے میں دو بار مثال کی کال بھی آئی مگر وہ بچی کو آفس میں کام کا سامانہ کر کے ٹال گیا۔

بشریٰ کو وہ کچھ ٹائم دینا چاہتا تھا۔

بلکہ ٹائم تو شاید اسے چاہیے تھا کہ نسیم بیگم کو آج کل پھر فوزیہ کے رشتے کی بے چینی لگ گئی تھی۔ دن میں دو دن
 تین تین رشتہ دیکھنے والیاں آ رہی تھیں۔

ان کی خاطر مدارات میں ساری تنخواہ اٹھنے لگی تھی۔ مگر وہاں کو منع بھی نہیں کر سکتا تھا۔

”اس دور کا مرد کتنا کمزور کتنا بے بس ہے۔“ وہ یوں ہی ایک پارک میں جا کر بیٹھ بیٹھ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر

سے نکالا۔

نسیم بیگم کی کال تھی۔ وہ نظر انداز نہیں کر سکا۔ وہ صبح بھی ماں سے ملے بغیر گھر سے نکل آیا تھا اور اب بھی گہری
 نام ہو چکی تھی۔ وہ دل کی مریضہ تھیں۔ فکر مند ہو سکتی تھیں۔ ان کی طبیعت کا یوں بھی پتا نہیں چلتا تھا۔
 ”ہی! آفس میں کام تھا۔ اس لیے لیٹ ہو گیا۔“ اس نے نرمی سے ماں سے کہا۔
 ”ہاں وہ تو تمہیں مہینے بھر سے ہی ہے۔ رات گئے ہی آتے ہو مگر آج تم ابھی اور اسی وقت گھر آؤ ورنہ۔“ وہ
 غصے میں لگ رہی تھیں۔

”خیر تو ہے نا۔ آپ کی طبیعت تو اچھی ہے نا۔“ وہ گھبرا گیا۔

”میری طبیعت کو گولی مارو۔ بس تم فوراً گھر آ جاؤ۔ مجھے بات کرنا ہے تم سے ابھی۔“ وہ ٹیلے لہجے میں بولیں۔

”جی۔ اچھا۔ میں آ رہا ہوں۔ تھوڑی دیر میں پہنچتا ہوں۔“ اس نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

”اب جانے امی کو کون سا نیا شو شاسو جھا ہو گا۔“ وہ آگے بڑھ کر نکل آیا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں امی۔“ وہ بھونچکا سا رہ گیا۔

”یہاں میری لاش پڑی ہوگی تو ہی اس گھر کے دو گھر نہیں گے۔ عدیل! میں تجھے بتا رہی ہوں۔ اگر تو بیوی بچی کو
 لے کر کہیں گم ہو تو میں مانی خدا کی قسم اپنی جان دے دوں گی۔ یہ بات تو میری لکھ لے۔“ نسیم بیگم سخت غصے میں
 تھیں۔ بغیر سوچے سمجھے بولتی چلی گئیں۔

”امی! کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے اور میں کیوں کروں گا ایسے۔“ وہ ماں کے تیور دیکھ کر گھبرا
 گیا۔

”مجھے بے وقوف نہ بنا تو۔ مجھے سب پتا چل گیا ہے۔ ماں بھٹی کیا چکر چلا رہی ہیں۔ یہ تو یوں ہی بیٹھے بیٹھے میرے
 جی کو بے چینی سی ہوئی کہ بسو میری بیٹی کے برابر ہے، میں جا کر بشریٰ کا حال تو پوچھ کر آؤں تو چل پڑی کہ آئیل مجھے
 ارے۔“ وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر بولیں۔

”اور وہ دونوں ماں بھٹی تو جیسے تیار تھیں۔ فوراً ہی مجھے کہہ دیا کہ بشریٰ تو تب ہی واپس آئے گی جب عدیل اس
 کے لیے الگ گھر لے کر دے گا اور عدیل گھر لے بھی رہا ہے۔ ایک ماں ہی بے خبر ہے۔ باقی تو سب کو پتا ہے۔“ وہ
 لانے لگیں۔

”امی! ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ یقین کریں۔“ وہ روہانسا ہو کر بولا۔

”کھا میرے سر پر ہاتھ رکھ کر میری قسم کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھ کر بولیں تو
 عدیل بے بسی سے دیکھتا رہ گیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سانچہ ارحام

آپ کی پسندیدہ مصنفہ بہن عنینہ محمد بیگم کی والدہ محترمہ مخضریٰ علالت کے بعد اس دار فانی کو الوداع کہہ گئیں۔
 اللہ وانا الیہ راجعون
 والدہ کی شفقت اور محبت سے محرومی بہت بڑا صدمہ ہے۔ ہم عنینہ محمد بیگم کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں اور اللہ
 تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ عنینہ اور دیگر اہل خانہ کو صبر جمیل سے نوازے اور مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا
 فرمائے۔ آمین۔
 قارئین سے بھی دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

لیکھی سنگی

عدیل اور فوزیہ نسیم نسیم کے بچے ہیں۔ بشری ان کی بیوی ہے اور ذکیہ نسیم کی بیٹی ہے۔ عمران بشری کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ نسیم کی تو اسی اور نسیم نسیم کی بیوی ہے۔ بشری اور نسیم نسیم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم نسیم کے بچے ہوئے لگاوت رکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ نسیم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشری کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑا ہے۔ سہ ماہی سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشری کی مندر فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشری دو لہنا نظیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل نظیر کا بشری کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن زاہدہ اور ذکیہ نسیم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشری اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم نسیم کو بتانے سے منع کرتا ہے۔ بشری اور عدیل ایک جہتے گئے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشری کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ مگر بیوی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہیں۔ عاصمہ کو فون کے ذریعے کوئی اطلاع ملتی ہے جسے سن کر وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔

فون پر پتا چلتا ہے کہ شہر آتے ہوئے عفان اور فاروق صاحب ذکیہ کی واردات میں قتل ہو گئے۔ عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹ سے سات لاکھ روپے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم اس کیوں ٹھیں :-

- ✧ ہرائی بینک کا ڈائریکٹ اور ریٹیریوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤن لوڈنگ سے پہلے ای بینک کا پرنٹ پر یو یو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی جینک اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ایب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہرائی بینک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ پیریڈک الٹی، نادر الٹی، کیریڈ کو الٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن حنفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے مگنی ڈاؤن لوڈ کی جا سکتی ہے

✧ ڈاؤن لوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤن لوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہر ویب سائٹ پر آئیٹس اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤن لوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety



وصول کپاتی ہے۔ زہیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی ہمدردی رہا ہے۔ اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقتولین کو دکھانا ہے۔ زاہد، نسیم بیگم سے ہیں لاکھ روپے سے شرط نوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشری سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔ حمیدہ خالہ عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زہیر کا ایکنے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں جبکہ عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مو نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس کو خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زہیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آجاتا ہے کہ وہ استثنائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے۔ شرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے۔ سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔ رقم سمانہ ہونے کی صورت میں نوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر سوادرا اس کے گھر والوں کو موردا الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشری کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل ٹیٹس میں بشری کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا اپارشن ہو جاتا ہے۔ شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے۔ مگر وہ نوزیہ ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چل جاتی ہے۔

اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دکھاتا ہے جسے سبہ ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے تنگ آکر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آجاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو بتا چلتا ہے کہ زہیر نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے رستے بند کر دیے ہیں اور اب مفروز ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم عاصمہ کو ایک مکان دلا پاتا ہے۔ بشری اپنی واپسی الگ گھر سے شرط لگاتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل سخت پریشان ہے۔

۸۔ زکویٰ قیظ

عدیل سے جواب میں کچھ بولا ہی نہیں گیا۔
"بالکل سچ بول مجھ سے۔ جھوٹ نہیں منوں گی میں عدیل! وہ اس کی خاموشی پہ اور بھی چمک کر بولیں۔
"امی! ایسا کچھ نہیں ہے آپ جانتی ہیں۔" عدیل نے نرم کعبے میں کہتے ہوئے کہاں کا ہاتھ سر سے ہٹانا چاہا۔
"مجھے کوئی چکر نہیں دینا۔ بغیر کئی پٹیا ہی سیدھی بات کر مجھ سے۔" وہ بھی سخت لہجے میں مضبوطی کے ساتھ ر پر ہاتھ جما کر بولیں۔
"ہاں امی! اس نے ایسا کہا ضرور ہے۔" وہ تھک کر بولا۔
"دیکھا امی! میں نہیں کہتی تھی۔ یہ بات جھوٹ ہو ہی نہیں سکتی۔" نوزیہ جو دوسری طرف خاموش بیٹھی اس متاظرے کا مزہ لے رہی تھی غموراً "بھی سیر ہو کر بولی۔
"عدیل! تو ایسا نکلے گا۔" نسیم کی آنکھوں میں افسوس اور بے یقینی کے مارے آنسو ہی آگئے۔
"امی! میری پوری بات سن تو لیں آپ۔" وہ سخت جھنجھلا کر بولا۔
"کیا رہ گیا ہے اب سننے کو بانی۔" تجھے اس دن کے لیے پال پوس کر جوان کیا تھا کہ تو بوڑھی ماں اور جوان ملا چار ہن کو چھوڑ کر چلتا ہے۔" وہ باقاعدہ رد نے لگیں۔
"امی! خدا کے لیے روئیں نہیں آپ کی طبیعت بگڑ جائے گی۔" وہ رہا ہنسا ہو کر بولا۔
"جب قسمت بگڑ چکی ہو تو پھر طبیعت کی کس کو فکر ہوئی ہے۔ عدیل! تو نے دلاری بیوی کی فرمائش کو سرا آنکھوں پر رکھتے ہوئے ایک بار بھی ہم دونوں کے بارے میں نہیں سوچا۔" وہ روئے جاری تھیں۔

"افوہ! میری بات تو پوری سن لیں۔ آپ کو تو بس ہر دوسرے تیسرے کی الٹی سیدھی بات یہ کلن دھرنے کی بات سے سوائے میری بات کا یقین کرنے کے" اب کہہ جھلاتے ہوئے سمت ناراض لہجے میں کہہ اٹھا۔
"نسیم بیگم کچھ غصے لگیں۔ اس طرح تو وہ ہم دونوں سے باغی ہو جائے گا یوں ہر وقت کے روئے دھونے اور مظلومیت کے ڈرامے سے۔" انہوں نے فوراً پھرے کے تاثرات بدلتے ہوئے آنسو صاف کیے۔
"تجھے یہ تو یقین مجھے خود سے زیادہ ہے۔ بلکہ سچی بات کہوں تو خدا کے بعد میرے بچے تو ہی تو ہمارا سہارا ہے۔" ذکیہ نے جس دھرنے سے دعویٰ کیا کہ عدیل تو بشری کے لیے علیحدہ گھر دھونڈ بھی چکا ہے تو یقین کر مجھے لگا میرا دل ابھی کا ابھی بند ہو جائے گا۔ کیا کروں عدیل! تجھ میں تو میری جان ہے یہ سوچ کر کہ خدا نخواستہ تو میری آنکھوں سے دھار چلا جائے گا۔ میں تو اسی دن مر جاؤں گی۔ سچ کہتی ہوں۔" انہوں نے پھر سے آنکھیں آنسوؤں سے بھر لیں۔

"امی! میں نے کوئی الگ گھر نہیں دیکھا اور نہ میرا ایسا کوئی ارادہ ہے۔" ماں کی پل پل بدلتی حالت اسے اندر ہی اندر کچھ پریشان کر رہی تھی۔
"تو سب وہ دونوں جھوٹ بول رہی تھیں کیا؟" نوزیہ لقمہ دینے سے باز نہیں رہ سکتی تھی۔ "حالانکہ امی نے ان سے کہا بھی کہ وہ ہمارے ساتھ گھر چلیں مگر انہوں نے اس نے صاف انکار کر دیا کہ وہ تو اب اپنے نئے گھر میں ہی جائیں گی۔"
"اگر یہ بات سچ تھی تو پھر امی کا غصہ غلط نہیں تھا۔" عدیل نے دل میں سوچا۔
"امی! بشری نے مجھ سے یہ مطالبہ ضرور کیا ہے لیکن میں نے اسے ہاں یا نہ کچھ بھی نہیں کہا ابھی۔" عدیل نے ہارے ہتھیار پھینک دیے۔ سب سچ کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔
"نو معاملہ لفظی لفظی کر رکھا ہے تم نے مگر وہ تمہیں زیادہ خود کھائے گی تو تمہان بھی جاؤ گے۔" وہ تیز لہجے میں بولیں اور ساتھ ہی اپنے سینے اور بائیں بازو کو ہولے ہولے اپنے دوسرے ہاتھ سے سہلانے لگیں۔

عدیل پریشان ہو گیا۔
"یہ اتنا آسان نہیں ہے۔" وہ بھی کہہ سکا۔
"تو پھر وہ کیا اب عمر بھر ماں کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھی رہے گی ماں بھی وہ جو زمانے بھر کا قندہ ہو۔"
"مجھے خود کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" وہ بے بسی سے بولا۔ نوزیہ اور نسیم بیگم نے ایک دوسرے کو دیکھا۔
"تو کیوں اتنا لاچار ہو رہا ہے۔ کیا ہر ضد اسی کی مانی جائے گی۔ ہر فرمائش اسی کی پوری ہوگی۔"
"تو کیا کروں پھر آپ ہی بتائیں۔" وہ ہمیشہ کی طرح آخری فیصلے کے لیے ماں کی رائے کا محتاج تھا۔
"نسیم بیگم کو بیٹے کی لاچارگی سے بڑی کمسنی سی خوشی محسوس ہوئی اور دل کو اطمینان بھی کہ بیٹا ابھی پوری طرح سے انہوں سے نکلا نہیں ہے۔
"ایک بار مردوں جا کر اسے طلاق کی دھمکی دے۔ نہ سر پر پاؤں رکھ کر دڑی آئی تو میرا نام بدل دینا۔" وہ اسی لہجے میں بولیں جو ان کا خاصہ تھا۔
"امی! یہ تھک نہیں ہوگا۔" وہ کمزور لہجے میں بولا۔
"کیا مطلب کیا تھک نہیں ہوگا۔" وہ اتنے رنل ڈالتے ہوئے خفگی سے بولیں۔
"وہ پہلے ہی خود مجھ سے علیحدگی کا مطالبہ کر چکی ہے۔ اگر میں نے بھی ایسا کہہ دیا تو معاملہ اور بگڑ جائے گا۔" وہ لگے سے بولا اور ان دونوں نے ناسف سے عدیل کو دیکھا۔

”اس نے تجھ سے علیحدگی مانگی اور تو اس کے پاؤں پر گیا؟“ وہ اسے غیرت دلانے کو آخری حربے کے طور پر بولیں۔

”ایسی بات نہیں امی! میں نے اسے سمجھایا تھا۔ مثال کی وجہ سے وہ ان گنی گمراہ گھر سے مٹا لے پر۔“
 ”الگ گھر کس سے؟ ہم دونوں ماں بیٹی سے اتنی نفرت کرتی ہے کہ ہماری شکلیں نہیں دکھنا چاہتی تو تم تک سے عدیل! تو ایک کام کر اپنا گھر بچا۔ اپنی بیوی کی بات مان اور اس کو الگ گھر لے دے اور ہم دونوں پہ لعنت بھیجے۔ عاقبت کس نے دیکھی ہے جو اس کو سنوارنے کے جتن کریں تو کس اپنی دنیا سدھا رہا۔ اس کو راضی کر لے باقی سب خیر ہے۔ جا میرا بیٹا! نہ پریشان ہو ہم ماں بیٹی کسی نہ کسی طرح جی لیں گے۔ تجھے خوش رہنا چاہیے۔ تیرا گھر بنا رہے ہیں اور کچھ نہیں چاہیے۔“ رندھی آواز میں کہہ کر وہ نوزیہ کا سہارا لے کر جانے لگیں۔
 ”امی پلیز رکھیں۔ میری بات تو سنیں۔ میں نے ایسا کچھ نہیں سوچ رکھا امی!“ عدیل ماں کی جذباتی باتوں پر روہانسا ہو کر رہ گیا۔ سیم بیگم ان سنی کرتی نوزیہ کے ساتھ چلی گئیں۔
 عدیل سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

ایک بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی ماں اور بیوی کو ایک ساتھ راضی رکھنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ تو پھر اسے کس کو ناراض کرنا ہو گا۔ یہ فیصلہ بہت مشکل تھا۔ پل صراط پر چلنے سے بھی زیادہ مشکل۔



”اپنا اور بچوں کا بہت خیال رکھنا عاصمہ! میں ہر روز نہ سہی دوسرے دن فون کر کے تم لوگوں کی خیریت پوچھتا رہوں گا۔“ ہاشم کی فلائٹ کا نام ہونے کو تھا۔ وہ گھڑی بویکھ کر ریف کیس اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔
 عاصمہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے ہاشم نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ دیا۔

بہت حوصلہ کرنے کی ضرورت ہے تمہیں۔ اللہ نے تم پر بہت بھاری بہت بڑی ذمہ داری ڈال دی ہے۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ ان شاء اللہ تمہیں ضرور سرخرو کرے گا۔“ وہ رندھی آواز میں اسے ساتھ لگا

کر رہی سے بولا۔ بچے ان دونوں کے گرد کھڑے تھے۔

”اوپر اچھے لوگ ہیں۔ ڈیلر نے گارنٹی دی ہے کہ کرائے کے معاملے میں تنگ نہیں کریں گے۔ تمہیں ان شاء اللہ زیادہ پریشان نہیں ہوگی۔ میں خود بھی جتنی توفیق ہو سکی بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ بھجواتا رہوں گا۔“

وہ جانتی تھی ہاشم کے لیے یہ آسان نہیں ہو گا پھر بھی وہ سہلایا کر رہی۔
 ”واثق ماشاء اللہ بہت سمجھ دار ہے۔ بس دو تین سال کی وقت ہے پھر ان شاء اللہ یہ سب کچھ سنبھالنے کے قابل ہو جائے گا۔ کیوں واثق بیٹا؟“

”جی ماموں! وہ کچھ شرا کر بولا۔ ہاشم نے ہنس کر اسے گلے لگا لیا۔

”کچھ چاہیے عاصمہ! تو میں وہاں جا کر تمہیں بھجوا سکوں؟“ جاتے جاتے اسے خیال آیا تو رک کر پوچھنے لگا۔
 ”نہیں بھائی! کچھ بھی نہیں۔ اپنا گھر مل گیا۔ کچھ تھوڑا بہت آمدنی کا بھی بندوبست ہو گیا ہے۔ ہم تھوڑے میں آسانی سے گزارہ کر لیں گے۔ آپ ہماری بالکل بھی فکر نہیں کیجیے گا۔“ وہ اب کے ذرا مضبوط لہجے میں بولی۔ آخر بھائی نے اس کا اتنا ساتھ دیا تھا۔ وہ جاتے جاتے اسے رو کر کیوں رخصت کرے کہ وہ اس کی طرف سے پریشان صورت لے کر جائے۔

”اللہ ضرور تمہارے لیے اور بھی آسانی کرے گا۔ میں بھی دو ایک سالوں میں واپسی کی کوشش کروں گا۔“

باتیں کرتے دلوں بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔



”مثال کی خاطر۔۔۔ پلیز۔“ اس نے آخری کوشش کے طور پر بشری سے ہلکی لہجے میں کہا۔
 ”نہیں۔“ وہ پہلے دن کی طرح پھر سخت ہو چکی تھی۔
 ”بشری! عدیل کی کہہ سکا۔

”نہیں۔“ وہ اسی قطعیت سے بولی۔

عدیل اسے دیکھ کر رہ گیا۔ خاموشی کا بہت لمبا وقفہ دونوں کے درمیان آ گیا۔
 ”اگر مجھے ان دونوں کے ساتھ ہی رہنا ہے تو پھر اسی ایک کمرے میں کیوں نہیں۔“ وہ تنہی سے بولی۔
 ”تم سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”بہتر ہے یہ کوشش تم کرو۔“ وہ سرد لہجے میں کہہ کر جانے لگی۔ عدیل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”پلیز بیٹھ جاؤ۔“ کوئی بھی اس کی بات ماننے کو سمجھنے کو تیار نہیں تھا۔

بشری کچھ دیر کھڑی رہی پھر کچھ سوچ کر بیٹھ گئی۔

”بتا ہے بشری! آج کل میرا کیا جی چاہ رہا ہے۔ میں خود کو ختم کر لوں۔ تمہیں بھی سکون مل جائے گا اور امی اور نوزیہ کی بھی مشکل آسان ہو جائے گی۔“ وہ ٹھکے ہوئے لہجے میں کہہ کر خاموش ہو گیا۔ بشری نے اسے تند نظروں سے دیکھا مگر کچھ بولی نہیں۔

”میں ان دونوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ بہت دیر بعد جیسے خود سے بہت لڑ چکنے کے بعد وہ بولی سکی تھی۔

”تم علیحدہ رہو گی ہر طرح سے۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ اوپر کا بورڈنگ اس کی میزبیاں بھی اگر تم کوئی تو میں باہر سے نکال دوں گا۔ دو کمرے ہیں اور پاتھ بھی ہے شان وار سا بچن تمہاری پسند کا بنا دوں گا۔ تمہارا امی اور نوزیہ سے کچھ واسطہ نہیں ہو گا۔“ وہ ہر طرح سے اس کو منارہا تھا۔
 بشری اسے شکایتی نظروں سے دیکھنے لگی۔

”پلیز۔ چند سالوں کی بات ہے۔ نوزیہ کی شادی ہو جائے گی۔ امی بیمار رہنے لگی ہیں۔ میں کیسے ان دونوں کو چھوڑ کر چلا جاؤں۔ کبھی رات کو ان کی طبیعت خراب ہو گئی تو۔“

”اور یہ بات میری تم لکھ لو۔ ان کی طبیعت رات ہی کو خراب ہوا کرے گی۔ وہ ہمیں کبھی بھی اوپر سکون سے نہیں رہنے دیں گی۔“ وہ پھر سے غصے میں آ کر بولی۔

”ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ وعدہ۔“ وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر محبت سے دبا کر بولا۔

بہت دنوں بعد عدیل کو سکون بھری چند سانس ملی تھیں۔ جیسے سر بردھری کوئی چٹان کھسکی ہو۔

”اگر ایسا نہ ہوتا تو؟“ بشری بے یقین سی تھی۔

”پھر میں تمہیں واقعی الگ گھر لے دوں گا۔ وعدہ ہے میرا۔ اب تو یقین کر لو۔“

”آئی مان جائیں گی؟“ بشری کو ہاتھ تھام سیم بیگم اس بات سے بھی ضرور ہنگامہ کر سکی۔

”تم فکر نہیں کرو۔ میں امی کو مثالوں کا کم از کم اس کے کیسے یہ بات کافی ہوگی کہ میں گھر چھوڑ کر نہیں جا رہا۔ وہ مل جائیں گی۔ بس مجھے ایک ہفتہ دے دو بچن۔ بنوانے کے لیے پھر میں تمہیں لے جاؤں گا۔“

وہ بہت پر جوش تھا۔ بشری ناخوش سی! عدیل محسوس کر رہا تھا مگر وہ اب اسے چھیڑ کر مزید کسی نئی بحث کا آغاز

نہیں کرنا چاہتا تھا۔
”وہ کھونا مثلاً کتنی ڈسٹرب ہے۔ اسے شروع سے ہم دونوں کے ساتھ رہنے کی عادت ہے۔ کتنی کمزور ہو گئی ہے۔“

”ہوں!“ وہ نے زار سے لہجے میں اپنی ہتھیلی پھیلا کر دیکھنے لگی۔
”اچھا چلو مثال کو بلاؤ ہم تھوڑی آؤنگ کر کے آتے ہیں۔ تمہیں کچھ شاپنگ کراؤں گا۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہو کر بولا۔

”عدیل! میرا دل نہیں چاہ رہا۔“ وہ کوفت سے بولی۔
عدیل اسے دیکھ کر رہ گیا۔ ”اس عورت کو خوش رکھنا کتنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔“ وہ دکھ سے سوچ کر رہ گیا۔
ابھی تو نسیم بیگم کو منانے کا ایک اور مرحلہ باقی تھا۔ وہ بھی اس تقسیم پر آسانی سے تو راضی نہیں ہو سکتی تھی۔
”ماما! آؤں کریم کھانے چلتے ہیں۔ بیٹا سے کہیں نا۔“ مثال اندر آگیاں سے لپٹ کر بولی۔
وہ آج کل یوں بھی بہت خوش تھی کہ اس کے ماں باپ بہت سارے دنوں کے بعد پھر سے اکٹھے بیٹھنے لگے تھے۔ باتیں کرتے تھے۔ لڑتے تھے مگر ساتھ ساتھ تھے۔

”آپ چلی جاؤ جانو! میرا موڈ نہیں ہے۔“ بشری مثال کو پیار کرتے بولی۔ مثال اسے واقعی پہلے سے بہت کمزور لگی۔
”نہیں ماما! آپ بھی چلیں ہمارے ساتھ۔“ وہ ماں کا منہ جوم کر ضد سے بولی۔

”مثال! بشری نے منع کرنا چاہا۔“
”مما چلیں گی تو موڈ بھی اچھا ہو جائے گا آپ کا اور پھر ہم ڈھیر ساری شاپنگ بھی کریں گے۔ پیپا کا ڈالرش خالی کر دیں گے تو مزہ آئے گا۔“ وہ شرارت سے بولی۔

دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر بے اختیار ہنس پڑے۔
”چلو آپ لوگ گاڑی میں بیٹھو جا کر تمیں آلی ہوں۔“ وہ خود بھی اتنے دنوں سے گھر میں پڑے پڑے اتنا چکی تھی، مسکرا کر بولی۔
عدیل مثال کی انگلی پکڑ کر باہر جانے لگا۔

”خوب اچھا سا تیار ہونا۔ ہم ڈیز بھی باہر ہی کریں گے۔“ وہ جاتے جاتے رک کر بولا۔
اس کی نظروں میں محبت کا خاص پیغام تھا کہ بشری کچھ شرما کر نظریں جھکاتے ہوئے مسکرائی تھی۔
بہت دنوں بعد بہت اچھا سا محسوس ہوا تھا اسے۔ عدیل کو۔ پھر اس کی طرف دیکھا رہا۔

”پاپا! اب چلیں نا ماما آ رہی ہیں تیار ہو کر۔“ مثال اس کا ہاتھ ہلا کر بولی تو دونوں باہر نکل گئے۔
”امی ٹھیک کتنی تھیں۔ اس سارے جھگڑے میں سب سے زیادہ نقصان میرا ہی تو ہونا تھا اور وہ دونوں ماں بیٹی جو کچھ چاہتی ہیں میں خود ان کو وہ سب کچھ پورا کر کے دکھا رہی تھی۔ اپنا گھر اجاڑ کر انہیں خوش کر دیتی تھی۔“

وہ نئی سوچوں کے ساتھ جلدی جلدی تیار ہونے لگی۔



وہ کوفت بھری نظروں سے گردن موڑ کر انہیں دیکھ رہی تھی۔

چالی ہلکا سنو والا بھی کوئی ست الوجود انسان تھا۔ کتنے بھر سے اس سے تالے کی چابی نہیں بن سکی تھی۔
چوکیدار پوری مستعدی سے اس کے سر پر کھڑا تھا۔ دیکھتے ہوئے کو آئے تھے اسے اس طرح سیر نہیں ہونے پڑے۔
ہوئے سارے بھوک بھی لگ رہی تھی اور پیاس بھی۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ اسے اب یہ دونوں چیزیں بہت دیر تک برداشت کرنے کی عادت ہو گئی تھی۔

بالآخر چالی بن گئی اور لاؤنج کا دروازہ کھل گیا۔
اگر اس دوران کھروالے آجاتے تو اس سے آگے کیا ہوتا، وہ بالکل بھی سوچنا نہیں چاہ رہی تھی۔
”دوسرو پے سانگ رہا ہے چالی بنانے کے۔“ چوکیدار منتظر نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کے پاس آکر بولا۔

”ہاں۔۔۔ اچھا میں لاتی ہوں اندر میرے کمرے میں ہے پرس۔“ وہ حقیقتاً ہبو کھلا گئی تھی۔ اپنا ہوسیدہ بیگ ہتھ لپی اندر چلی گئی۔
گھر اسی طرح سجا سجا شاندار تھا جیسا سولہ دن پہلے وہ چھوڑ کر گئی تھی۔

اس نے ایک گھرا سانس لے کر گھر کے اپنے پن کو محسوس کرنے کی کوشش کی مگر ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔
اودھ کھلے دروازے سے چوکیدار اور چالی والے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ آہستگی سے ماسٹر بیڈ روم میں داخل ہوئی۔
”شکر ہے یہ کمرالاکڈ نہیں ہے۔“ اس نے صاف تھمرے بچے سجائے کمرے کو طمانیت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے سوچا۔

اس نے کبھی چوری نہیں کی تھی لیکن آج اسے یہ کام بھی کرنا تھا۔ اسے معلوم تھا اگر اس گھر میں رقم اگر کہیں سے مل سکتی ہے تو وہ اس کمرے سے۔
اس نے ایک ایک کمرے کے ڈرائنگ ٹیبل کی درازیں بسائیڈ ریگس اور پھر الماری کھول کر دیکھ لیں۔ کہیں بھی کچھ نہیں تھا۔

وہ ہانپوس ہونے کے ساتھ ساتھ سخت پریشان ہو چکی تھی۔
”اگر پیسے نہ مل سکے تو۔۔۔ چوکیدار شاید مجھے رہنے نہ دے یہاں اور اگر اس نے اپنے مالک کو فون کر کے مورخاں بتادی تو۔۔۔ ظاہر ہے وہ سخاوتاً اپنے مالک سے لیتا ہے۔ مجھ سے تو نہیں۔“

الماری میں لٹکا ہلکا ہینڈ بیگ امید کی آخری کرن تھا اس کے لیے۔ وہ تیزی سے بیگ کی اندر باہر سے تلاشی لینے لگی۔

اندرونی جیب میں ایک ہزار کا اور ایک پانچ سو کا نوٹ موجود تھا۔ اس کی جان میں جان آگئی۔ تیزی سے نوٹ لے جاتے ہوئے وہ رک گئی۔
پھر مڑ کر الماری میں بیگ کو اس جگہ پر لٹکا چیریں ترتیب سے رکھیں درازیں ڈھنگ سے بند کیں اور دروازے پر رک کر کمرے کو آخری نظر سے دیکھنے لگی۔ کہیں کچھ گڑبڑ تو نہیں۔ کمرے کے لیے کی طرح لگ رہا ہے نا۔

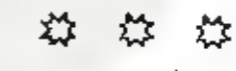
اس کی جھکتی نظریں بے اختیار میز کے سائیڈ ریگ پر پڑی مسکرائی تصویر پر رک گئیں۔
اس کے قدم کسی نے جکڑے لیے۔
وہ کچھ دیر یوں کھڑی رہی پھر آگے بڑھ کر تصویر اٹھا کر دیکھنے لگی۔

”سوری۔“ تصویر واپس رکھتے ہوئے وہ آہستگی سے بولی اور آنکھوں کے کونے صاف کرتی تیزی سے باہر چلی گئی۔
”یہ دو چالی والے کو دے کر باقی کے پیسے آپ رکھ لیں۔“ اس نے چوکیدار کو پانچ سو کا نوٹ تمہا کر کہا۔

”میں جی! وہ کچھ حیران ہوا۔
بخشش۔ اس کی توقع سے یا تو بہت زیادہ تھی یا بہت کم۔
”پلیز اگر فون آئے تو اس ڈیلی کیٹ چال کاندھ تائیے گا۔ وہاں آئیں گے تو میں خوب بات کر لوں گی۔“ اس نے تین سو روپے کی بخشش کا مطلب اسے سمجھایا۔

”جی ہسٹر!“ وہ سر ہلا کر چالی دو اے کے پاس چلا گیا۔
ایک مہینے سے پہلے تو وہ لوگ واپس نہیں آئیں گے لیکن یہ کوئی حتمی بات بھی نہیں۔ وہ اس سے پہلے بھی آ سکتے ہیں۔ مجھے رہائش کے لیے اوپر والا کرا بھی استعمال میں رکھنا چاہیے جس کا بیرونی دروازہ کس کھلا رہ گیا تھا اور لاؤنجنگی یہ ڈیلی کیٹ چالی میرے میں بھی کام آ سکتی ہے کیونکہ یہ تو ان لوگوں کا معمول ہے۔“ اس نے چالی کو مضبوطی سے گھسی میں بند کر لیا۔

”لیکن ایسا کب تک ہوتا رہے گا۔ اب مجھے کچھ نہ کچھ تو اسے بارے میں سوچنا چاہیے۔ زندگی صرف تیس دنوں کا نام تو نہیں۔ پندرہ دن اور پندرہ دن ادھر۔ اس سے آگے بھی بہت کچھ ہے اور اچھا ہے یہ لوگ گھر یہ نہیں۔ مجھے اس خاموشی اور تنہائی میں اپنے لیے اب کوئی فیصلہ کرنا ہی ہو گا اس سے پہلے کہ یہ سب لوگ میرے بارے میں کوئی فیصلہ کریں۔ اگرچہ ایسی فرصت شاید ہی کسی کو نصیب ہو پھر بھی مجھے خود سے کچھ سوچنا ہو گا بلکہ کرنا ہو گا۔“ وہ اوپری کمرے تک آتے آتے بہت کچھ سوچ چکی تھی۔



”ارے آپ سچ کہہ رہی ہیں خالہ۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ عاصمہ متون کر رہی بے یقین سی ہو گئی۔
”بھئی وہ کہتے ہیں نا کبھی کبھو ناسکے بھی کام آجاتا ہے۔ سمجھو! آج ہم جیسا کھو ناسکے بھی چل پڑا۔“ حمیدہ خالہ خاصی خوش مزاج ہوتی جا رہی تھیں۔

”یوں نہ کہیں خالہ! آپ خدا نہ کرے جو کھو ناسکے ہوں۔ کم از کم میرے لیے تو مبارک ہیں اور خیال رکھنے والی ہیں ورنہ جیسے آثار چڑھاؤ ان چند مہینوں میں آئے اور جو کچھ میرے ساتھ بیٹا تو آپ گواہ ہیں میرا ساتھ کس سے لیا ہر سوائے آپ کے اور کون تھا۔“ عاصمہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ پچھلے گزرے دنوں کا خوفناک نقشہ اس کی نظروں کے سامنے پھر سا گیا تھا۔

”ساتھ دینے والی تو اللہ کی ذات ہے۔ تم ایسی باتیں نہیں سوچو مجھے تو بس یہی فکر تھی کہ تم خدا نہ کرے کسی بڑی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ۔“ وہ سر ہلا کر بولی۔

”کیا مطلب؟“ وہ کچھ چونکی۔
”کبھی ایسے ہوتا ہے۔“ آوی کسی بڑی افتاد سے ٹٹکنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے کسی ان دیکھی دلیل میں جاگتا ہے۔ بس یہی ڈر تھا مجھے تمہاری حالت سے۔“ وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں بہت کچھ بتا گئیں۔

عاصمہ سے کچھ دیر بولا ہی نہیں گیا۔
”چائے تو لیں آپ ٹھنڈی ہو رہی ہے اور یہ مٹھائی تولی نہیں آپ نے ابھی تک۔“ بست دیر کی خاموشی کے بعد عاصمہ کو خیال آیا تو کہنے لگی۔

”تو پھر تم کل چلو گی میرے ساتھ؟“ خالہ حمیدہ چائے کا برتا سا گھونٹ بھر کر بولیں۔ ”وہ کچھ لو سنہ کوئی انٹرویو کا چکر نہ کسی اور امتحان کا ڈر ہمیں سیدھا جاؤ ملو اور نوکری کا پکا کاغذ لے لو۔ سارے بات تو میں کر آئی ہوں۔“

”مگر خالہ پھر بھی۔ میری تعلیم صرف الف اے ہی تو ہے اور مجھے کبھی کسی اسکول میں بچوں کو پڑھانے کا تجربہ نہیں رہا۔“ اندیشے تو اسے فوراً ہی گھیرنے لگتے تھے کوئی بھی نیا کام کرنے سے پہلے۔ حسب عادت پریشان ہو کر بولی۔

”کچھ نہیں کرنا تم کو۔ اپنے بچوں کو بھی تو خیر سے پڑھاتی ہو نا وہاں بھی چھوٹے بچوں کو پڑھانا ہے چار سال سے اسکول کھول رکھا ہے میری بیٹی کی منہ نہ اب تو بہت چلنے لگا ہے۔ اتنی بڑی بلڈنگ لے لی ہے۔ اب نئی استائیاں رکھ رہی تھی تو مجھے تمہارا خیال آگیا۔ میں نے نویدہ سے بات کی اس نے اپنی منہ سے پوچھا تھا۔ اسے حالات بتائے تو اس نے فوراً سے کہہ دیا کہ بس آجائیں۔ سیٹ کرنا ہمارا کام ہے تو پھر ڈر کیسا۔“ وہ پوری طرح اسے تسلی دے کر بولیں۔

عاصمہ سر ہلا کر رہ گئی۔
”لیکن خالہ! یہ چھوٹی اور وہ۔ اس کو کس کے حوالے کر کے جاؤں گی۔“ اسے پھر سے نئی پریشانی نے گھیرا اور یہ بات تو حقیقت بھی تھی۔

”اللہ مالک ہے۔ تم ایک بار جا کر مل تو لو۔ بات بن گئی تو اس کا بھی کوئی حل سوچ لیں گے اسکول گھر سے زیادہ دور نہیں صبح کے دو تین گھنٹے میں رکھ لوں گی۔ تم تفریح کے ٹائم آکر بیٹی کو کچھ کھلا پلا جایا کرنا تو کسی نہ کسی طرح ہی جائے گی۔“ وہ اسے ڈھارس دینے کو بولیں۔

عاصمہ نے عجیب سے انداز میں سر ہلایا۔
”اچھا کل میں سویرے ہی آؤں گی۔ تم بس تیار رہنا میں تمہیں لے چلوں گی پھر جو بات بنے گی دیکھ لیں گے۔“ وہ جانے کو جوتیاں سیدھی کرنے لگیں۔

”خالہ! کچھ دیر تو اور رکھیں اتنے دنوں بعد آئی ہیں۔“ وہ ذہنی نئے ہمسایوں سے اتنی گھل مل نہیں سکی تھی خالہ حمیدہ سے برسوں کی جان پہچان تھی۔

”پھر لگاؤں گی چکر تو دیر تک بیٹھوں گی۔ تم بھی ذرا یہ آمدنی اور خرچ کی فکر سے آزاد ہو جاؤ تو پھر بیٹھیں گے کسی دن دیر تک۔ یوں بھی چھوٹی سیکے گئی ہوئی ہے۔ بڑی بیٹھی مجھے کوس رہی ہوگی۔ گھر سے تو میں سبزی لینے نکلی تھی۔ اس نے ہنسیا بھی چڑھائی ہوگی۔“ وہ چادر لپیٹ کر جانے کو تیار ہو گئیں۔

”لو بھول گئی میں۔ ذرا جانے سے پہلے ایک چکر اوپر تمہارے کرائے داروں کا تو لگا آؤں کیسے لوگ ہیں تھوڑا آکا پچھا تو معلوم ہونا چاہیے۔“ وہ جاتے جاتے بیڑھیوں کی طرف جانے لگیں۔

”خالہ! ادھر سے راستہ بند ہے۔ مطلب دروازہ لگا کر بھائی نے تالا لگوا دیا ہے۔ باہر کی طرف سے بیڑھی نکلوا دی ہے۔ وہاں سے چلی جائیں آپ۔“ عاصمہ انہیں روک کر بولی۔ حمیدہ لمحہ بھر کے ٹھنک کر رہ گئیں۔ پھر سر ہلا کر جیسے ہاتھ کے اس قدم کو سرانے لگیں۔

”بہت سمجھ دار سے خیر سے تمہارا بھائی اللہ اسے لمبی زندگی دے۔ کیسی عقل مندی کا کام کر کے گیا۔ چلو میں باہر سے ہو کر چلی جاؤں گی۔ تم دروازہ بھینٹ لو۔“ وہ کہہ کر چلی گئیں۔ عاصمہ دروازہ بند کرنے لگی۔



اتنا شاندار کچن ایسا ہی سجا جایا گھر۔ بشری کے قدم تو آخری بیڑھی رہی رک گئے۔ صرف ایک ہفتے میں اس طرح اور کے کھنڈر پورشن کو سیٹ کر دیا۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ سارے پورشن میں نیارنگ و

دوغن ہچکتے روشن دود دیوار نے پینٹ شدہ دروازے کھڑکیاں۔ اس کے سلمان سے سجا اس کا شاندار بیڈ روم اور ڈرائنگ روم سامان سے بھرا کچن سہ تو مہوت بس دیکھے جا رہی تھی۔
مثیل کسی تھلی کی مانند گھر کے اس نئے سبب بننے سے میں اڑتی پھر رہی تھی۔
”کیسا لگا تمہیں یہ سب کچھ؟“ عدیل نے شاید اس سے پوچھا تھا سو دیکھنے میں اتنی مگن تھی کہ جواب میں کچھ کہہ ہی نہ سکی۔

”یہ سب ایک منٹے میں تو نہیں ہو سکتا نا عدیل؟“ وہ سزا کر شک بھری نظروں سے اسے دیکھ کر بولی۔
”مجبت یہ سب کچھ ایک گھنٹے میں بھی کروا سکتی ہے۔“ وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پیارے لہجے میں بولا۔
بشری تو جیسے اس پر مرستی۔
ابھی کچھ دیر پہلے جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو حسین بیگم اور فوزیہ نے کیسی کٹھلی کھا جانے والی نظروں سے اس کا استقبال کیا تھا۔ اس کے سلام کا جواب معلوم نہیں حسین بیگم نے دیا تھا یا نہیں مگر ان کے ہونٹ ہلے تھے شاید کوئی کوسناویا ہو۔ بشری لہلہ میں یہی سوچا۔

کیسا سرد رویہ تھا دونوں کا۔
بشری کچھ ریٹھان ہو گئی کہ ہو سکتا ہے عدیل نے اسے صرف اوپر والے پورشن کا جھانسا دیا ہو۔ ایسا کچھ بھی نہ ہو۔ وہ کن انھیوں سے عدیل کو دیکھنے لگی۔
وہ خود بھی ہاں۔ سن کے رویے کی سرد مہری کو محسوس کر گیا تھا۔

”میرا خیال ہے۔ میں سامان اور چھوڑ آتا ہوں بلکہ آجاؤ بشری! اتم بھی دیکھ لو۔ کچھ نہ تو نہیں گیا۔ مثیل۔ بابا کی جانی۔ آؤ ناں!“ وہ دور کھڑی مثیل کو پاس بلا کر اسے پیار کرتے ہوئے ساتھ لگا کر تھیں کرتا اور کی طرف چل پڑا تو بشری کی جیسے رکی ہوئی سانسیں بھال ہو گئیں۔
وہ حسین بیگم اور فوزیہ کی طرف دیکھے بغیر بڑے فخریہ انداز میں چلتی عدیل کے ساتھ میڈھیوں کی طرف بڑھ گئی۔
”امی! دیکھ رہی ہیں اس کا غرور، غرور اور داغ۔ بھائی نے ہی بیوہ غرق کیا ہے اس کا سارا۔“ بشری نے خود اوپر جاتے ہوئے فوزیہ کی جگن بھری بریڑا ہٹ سنی تھی۔

اس کے دل کو عجیب سا سکون ملا تھا۔ اسے لگا وہ میڈھیوں پر قدم نہیں رکھ رہی ان ہاں بشری کے دلوں پر ہیر رکھ کر اوپر چڑھ رہی ہو۔ انہوں نے تو جلنا ہی تھا انہیں کب امید تھی کہ بشری واپس آجائے گی۔
وہ مسکراتی ہوئی اوپر آگئی۔

”تھینکس عدیل! تھینک یو سوچی۔“ وہ خوشی سے مغلوب لہجے میں اس کے ہاتھ گرم خوشی سے اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی وہ اس کے ہاتھ دھاتے ہوئے اسے پاس کھینچنے لگا۔

”خالی تھینک یو؟“ اس کے ریشمی بالوں کو سر کا اس نے سرگوشی کی۔
”انہوں مثیل دیکھ لے گی ر“ وہ اسے معنوی حقل سے پرے دھکیل کر بولی۔
”وہ اپنا روم دیکھنے گئی ہے اور ہاں ابھی اس کے روم کی بہت سی چیزیں رہتی ہیں۔ میں نے سوچا وہ ہم مثیل کی مرضی سے خرید لیں گے کیا خیال ہے۔“

”بالکل۔ وہ خوش ہو جائے گی۔“ بشری چمک کر بولی۔
”اتنے دن ہماری بیٹی ہم دونوں کی وجہ سے اتنا ناخوش رہی۔ اب تو ڈھیر ساری خوشیوں پر اس کا حق ہے۔“
عدیل بشری کی محبت میں بولا۔

”اور ہمارا بھی۔“ وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر محبت بھرے لہجے میں بولی۔
”اب تو خوش ہو نا بشری؟“ وہ بشری کے رد عمل سے بہت مطمئن تھا جیسے اس نے دنوں سے سر پر پڑا کوئی پہاڑ سرک گیا ہو۔

”بہت زیادہ۔ عدیل! آپ نے آئی کو کیسے متایا اس علیحدگی کے لیے؟“ اسے خیال آیا تو پوچھنے لگی۔
”یہ مت پوچھو۔ ایک بہت مشکل جنگ لڑی تھی میں نے پہلے تم سے پھر امی اور فوزیہ سے۔ تم تو جانتی ہو انہیں کیسے جذباتی کرنا آتا ہے پھر کج کل جس تو اتر سے وہ فوزیہ کے لیے رشتے دیکھ رہی ہیں ان کا یہ کہنا تھا کہ لڑکے والے یہ اعتراض ضرور اٹھائیں گے کہ ایک ہی بھابھی اور وہ بھی علیحدہ رہتی ہے بشری تم پلیز ناجب بھی ایسی چویشن ہو تم بھی شو کرنا کہ ہم اکٹھے ہی رہتے ہیں پلیز! اتنا تو کر سکتی ہو میں میرے لیے میری کچھ بچت ہو جائے گی امی اور فوزیہ سے۔“

اسے بے اختیار اپنے پیارے شوہر پر رحم سا آیا۔
”سب کچھ بیلنس رکھنے کے چکر میں تو ہی کس طرح سے بھنس جاتا ہے۔“ وہ دل میں سوچ کر رہ گئی۔
”عدیل! میں نے تو پہلے بھی کبھی ان کے ساتھ برا نہیں کیا۔ کبھی ان سے یا فوزیہ سے بد نہیںی نہیں کی۔ جب تک ان دونوں کی طرف سے انتہا نہیں ہوئی تو پلیز! آپ بالکل ٹینشن نہیں لیں۔ ایسا اگر کوئی موقع آئے گا تو میں آپ کو ایس نہیں کروں گی۔“

وہ اس کے لیے اتنا کچھ کر سکتا تھا تو کیا وہ اس کے بدلے میں یہ معمولی سی موت بھی نہیں دکھا سکتی تھی۔
”تھینکس تم واقعی بہت اچھی ہو بشری!“ وہ سچ مغلوب سا ہو گیا۔

”جی! میرے کمرے میں تو صرف ایک بیڈ بڑا ہے وہ بھی پرانے والا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ میں اپنے نواز کماں رکھوں گی سنہ کوئی ریک ہے نہ کپ بورڈ کچھ بھی تو نہیں۔“ مثیل رو ہالسی ہو کر ان کے پاس آکر بولی۔
”میری جان! بس کج کی رات صبر کر لو۔ کل میں آفس سے آؤں گا دیکھ ایڈ بھی ہو گا پھر ہم اپنی مثال کے لیے اس کی پسند سے ڈھیر ساری شاپنگ کریں گے۔“ عدیل اسے اپنے ساتھ لپٹا کر پیار کرتے ہوئے بولا۔
مثال چند منٹوں میں کھل سی گئی تھی۔

”اللہ میری بیٹی کو کبھی کوئی دکھ نہ دکھائے۔ یہ ہمیشہ خوش رہے اسی طرح ہنستی مسکراتی بشری نے یک تک مثال کو دیکھتے ہوئے بے اختیار اس کے لیے دل سے دعا کی۔

”پراس کریں کل مجھے سب کچھ مل جائے گا وہ بھی میری پسند کا۔“ وہ باپ کے آگے نھٹا سا ہاتھ پھیلا کر بولی۔
”پراس میری جان! پہلے تمہیں ہم نے اپنی ڈارلنگ سے کوئی جھوٹا وعدہ کیا ہے۔“ وہ اس کے ہاتھ کو پیار سے قہقہے ہونے بولا۔

”او کے اتنا وعدہ تو میں کر ہی لوں گی۔“ وہ سخی بن کر بولی تو دونوں ہنس پڑے۔



وہ بے یقین نظروں سے ہاتھوں میں پکڑے اس بے داغ سفید لفافے کو دیکھا جا رہا تھا۔ وہ اتنا بے یقین تھا کہ ٹھیک خواہش کے باوجود اس لفافے کو کھول کر بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔
”کیا یہ اندر سے خالی ہوا تو؟“ یہ اندیشہ اسے بے حرکت کیے ہوئے تھا۔
”ایسا ہمیشہ تو نہیں ہو سکتا۔“ کسی نے نرمی سے اسے تسلی بھی دی تھی۔

اجرت بہت معمولی ہوگی۔ یقیناً آپ کو اپنے مسئلے کے حل کے مقابلے میں کم ہی لگے گی۔" میڈم قاطرہ اس واقعہ کوئی رحمت کا فرشتہ ہی لگتی تھیں۔

دو دن وہ تو یہ سوچ سوچ کر ہول رہی تھی کہ دورہ کر کہاں چھوڑے گی۔
حمیدہ خالہ کی پیشکش اپنی جگہ گمروہ ان سے مانوس نہیں تھی پھر حمیدہ خالہ کی دونوں بہنوں اس سخاوت پر یقیناً "ناگ منہ چڑھائیں اور یہ سلسلہ زیادہ دن تک نہیں چل سکتا تھا۔
آیا سے بھی وہ آتے ہوئے مل آئی تھی۔ بہت اچھی کم گو اور جرے سے نہایت سلجھی ہوئی خاتون تھی۔ عاصمہ کے دل کو بہت اطمینان سا ہوا۔

"مما! کتنی سیلری دیں گے اسکول والے آپ کو؟" واثق نے اس کو اپنے خیالوں سے چونکا دیا تھا۔
"سیلری تو ابھی زیادہ نہیں پھر دورہ کی دیکھ بھال کے لیے آیا کو بھی دینی ہوگی کچھ رقم لیکن واثق! کچھ نہ ہونے سے یقیناً بہتر ہے۔ کچھ کرایہ آجایا کرے گا پھر شام میں 'میں ٹیوشن کر لوں گی۔ میرے خیال میں ہمارے لیے یہ کافی ہوگا۔" اس نے مسکرا کر بیٹے کو تسلی دی۔
"دیس نائکس۔۔۔ تھری کلاس تک کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے میں میں بھی آپ کی ہیپلپ کر دوں گا۔" وہ دہرا نہ انداز میں بولا۔

"اوکے میری جان! یوں بھی تمہاری ہیپلپ کے بغیر تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتی۔" عاصمہ پیار سے اس کے کمال بکھرا کر بولی۔
"اوہ می! آپ کو ایک چیز دکھانی تھی مجھے میں آتا ہوں ابھی۔" وہ اٹھ کر تیزی سے اندر کمرے میں چلا گیا۔
عاصمہ مسکرانے لگی۔ اس نے ایک گہرا سانس لے کر اپنی جنت کو دیکھا۔

کچھ دن پہلے تک وہ کس درجہ مایوس ہو چکی تھی کہ اسے لگتا تھا زندگی کے دامن میں اب اس کے لیے کوئی خوشی نہیں رہی۔ وہ خدا کی رحمت سے مایوس ہو گئی تھی اور مایوسی کفر تک لے جاتی ہے تب ہی تو وہ بار بار حرام موت کے بارے میں سوچتی تھی اور اس پر عمل بھی کر بیٹھی تھی۔

آج اگر وہ بھی نہ ہوتی تو اس کے بچے اٹھ جانے کہاں بڑھکے کھا رہے ہوتے۔ اس نے لرز کر سر جھٹکا اور بچوں کو کھانے کے لیے آوازیں دینے لگی۔

واثق اسے اپنی شان داری ڈرائنگ دکھا رہا تھا جس پر برہنہ ہل صاحب نے آج خود اپنے سائن کے ساتھ اسے فون پر سٹیٹیکسٹ دیا تھا اور سالانہ مقابلوں کے لیے اس کا نام بھی فائنل ہو گیا تھا۔

"ناشاء اللہ میری جان! کتنی خوب صورت ڈرائنگ تمہاری۔ بالکل اپنے پاپا کی طرح ہے۔ پاپا کی ڈرائنگ کتنی اچھی تھی۔" عاصمہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"مئی! میں نے بابا سے ہی تو سیکھی تھی اس طرح چیزیں کو ڈرا کرتا۔" وہ پیار سے ماں کے آنسو صاف کر کے بولا تو وہ مسکرانے لگی۔

"مما۔۔۔ ماموں کا فون ہے۔ آجائیں جلدی سے۔" اربہ سیل ہاتھ میں لیے دوڑتی ہوئی ماں کے پاس آئی تو ناصحہ جلدی سے فون سننے لگی۔



انہوں نے مثال کے لیے متسماری شاپنگ کی تھی۔

لیکن وہ ابھی بھی وہ لغافہ نہیں کھول رہا تھا۔ اس کا سیل فون بجنے لگا۔

اس نے گہرے سکوت سے نکل کر سیل کی باسکرین پر چمکتا نمبر دیکھا۔

"کوئی اور بھی تو ہے جو اس لغافے کا بھید جاننے کا مجھ سے بھی زیادہ مشتاق ہے۔ مجھے اب مزید انتظار نہیں کروانا چاہیے کہ کبھی کبھی حد سے بڑھا انتظار جان لیوا بھی ہو جایا کرتا ہے۔"

اس نے کلر ریسیو نہیں کی۔ سیل واپس جیب میں رکھ دیا۔ اور آہستگی سے سحرزادہ انداز میں لغافے کی مہوٹائی اندر رکھا بڑا کانڈیوں باہر نکالا جیسے وہ کوئی جبرک مقدس تحریر ہو۔

اس کے لیے تو وہ واقعی بہت مقدس بہت جبرک تحریر تھی کہ جیسے وہ اس کی تمام تر جدوجہد کا حاصل ہو۔
"حاصل" وہ جیسے خود رہنا۔

اور پھر کھلے کانڈی کی تحریر نظروں دوڑاتا بے اختیار ہنستا چلا گیا۔

وہ ارد گرد موجود لوگوں کی موجودگی سے بے خبر تھی دیوانے کی طرح ہنس رہا تھا۔ اس کا سیل فون پھر سے بجنے لگا تھا۔

اس نے پھر زور سے ہونٹ بھیج لے۔ کچھ جھینپتی ہوئی نظروں سے لوہرا دھو دیکھا اور دل میں اپنی دیوانگی کو کوسا۔ احتیاط سے لغافے میں وہ متبرک کانڈی والا اور سیل پر آئے نمبر کو دیکھتے ہوئے کچھ سوچ کر اس نے کلر ریسیو کر لی۔

"میں بس ابھی پہنچ رہا ہوں آؤ مجھے گھنٹے میں تو بتاتا ہوں۔" سامنے سے آتی مطلوبہ بس کو دیکھ کر اس نے جلدی سے کال ختمائی اور اس کی طرف تیزی سے چل پڑا۔



"سچ ماما؟" واثق اور اربہ خوش ہو کر ایک ساتھ بولے تھے۔

"بالکل سچ میری جان! عاصمہ کے لمبے میں خوشی کی کھنک تھی۔

"وہ کھو جب آدمی دل میں مصیبتوں سے لڑنے کا ایک ارادہ کر لیتا ہے تو پھر اللہ میاں بھی اس کے لیے راستے کھولتے جاتے ہیں اور اس کی مشکلیں آسان ہوتی جاتی ہیں۔" اس نے کھانا نکالتے ہوئے دونوں کو آسان الفاظ میں سمجھایا۔ بچوں نے نثریہ انداز میں ہاں کو دیکھا۔

"یہی ماں تھی جو چند مہینے پہلے تک اس بری طرح سے ٹوٹ کر بکھری تھی جیسے کوئی کلرنگ کی گڑیا ہو اور لگتا تھا اب کبھی جڑے گی نہیں لیکن وہ نہ صرف جڑ چکی تھی بلکہ ان چاروں کو ایک شان دار مستقبل دینے کے لیے دل میں بہت سے ارادے بھی باندھ چکی تھی اور اپنی ہمت کو بھی جواں کر چکی تھی کہ اب اسے ہر مشکل کو اپنی ہمت اور ارادے سے زیر کرنا تھا۔

وہ دستر خوان پر کھانا لگاتے ہوئے خود کو بہت مطمئن محسوس کر رہی تھی۔ آج جب میڈم نے اس کو بہت سرسری سے انٹرویو کے بعد سلیکشن کا بتایا تو وہ خوشی کے مارے رو ہی پڑی تھی۔

اس سے کتنی دیر تک کچھ بولا ہی نہیں گیا۔
حمیدہ خالہ نے اسے شوکارے کر خود شکر یہ ادا کرنا شروع کیا تو وہ بھی جیسے ہوش میں آگئی۔

پھر وہ کا مسئلہ کیسے چٹکیوں میں حل ہوا۔
"ہمارے اسکول میں ایک اور بچہ بھی ہے ان کا بھی چھوٹا بچہ ہے جسے ہماری آیا زسری میں ایک طرف بنے کات میں لٹا کر اس کا خیال رکھتی ہے۔ آپ بھی بچی کو لے آیا کیجیے گا وہ آپ کی نظروں کے سامنے بھی رہے گی۔"

بھرے چہرے کو دیکھتی تو رنگ نہ جاتی، مگر کچھ سمجھ نہ پاتی پھر سر جھٹک کر وہاں سے گزر جاتی۔



آج دو تاریخ تھی۔

اسے گئے ہوئے تیسرا دن۔ ابھی اس کی وہاں ہی میں بارہ دن تھے۔ بارہ دن کیسے گزرے گے اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن اس بار اس نے تیرہ کر لیا تھا کہ وہ مزید اس ایک طرفہ آگ سے اپنا آب نہیں جلائے گا۔

"اس بار میں اس سے ضرور اظہارِ محبت کروں گا۔ یہ نہ ہو کہ اگلی بار وہ جائے تو پھر بھی واپس نہیں آئے جبکہ میں تو اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا، لیکن اب اور انتظار نہیں۔"

وہ گہری سوچوں میں گم ڈیڑھ گھنٹہ اسٹور کی بیڑھیاں چڑھنے لگا اور بے دھیانی میں کسی سے یوں ہی کھرایا کہ نکرانے والا اس پر آگرا۔ کبھی کبھی بھی دونوں بیڑھیوں کے ایک طرف سے پہلو سے جاگے اور اسے لگا اس کا دل بند ہو جائے گا۔

اگر وہ اس لمحے کوئی اور دعا کرتا تو وہ بھی قبول ہو جاتی شاید قبولت کی گہری بالکل پاس ہی تو تھی۔ جیسے وہ اس رات کی طرح اس کے بازوؤں میں تھی۔

"اسے اتفاق کہیں گے نہ حسین اتفاق بلکہ قسمت خوش قسمتی کہیں گے کہ قسمت ہم دونوں کو ملانا چاہتی ہے۔ اس لیے بار بار راستے میں ایک دوسرے کے اتنے قریب لے آئی ہے کہ۔"

وہ اسے دیکھتے ہوئے بے خود سا اکتا چلا گیا اور وہ جوتھ میں پکڑے دونوں شاپرز کے گرنے پر ہی خواہ اس باختم تھی اس جانے پہچانے چہرے کو اتنے قریب دیکھ کر ایک دہرائے ہوئے منظر کو پھر سے ان ہی جزئیات کے ساتھ دہراتا پاک۔ جیسے اس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔

"چھوڑو مجھ۔" وہ اسے پوری قوت سے پرے دھکیل کر درشتی سے بولی۔

"نہ چھوڑوں تو۔" کہانا یہ قسمت کا لکھا ہے کہ ہم دونوں کو بہت جلد ایک ہونا ہے۔" وہ شوخی سے اس کے چہرے پر نظریں جما کر بولا۔

"تو آئی آواز آئی اور وہ اسے تھپڑ مار کر پرے دھکیلتی تیزی سے دونوں شاپنگ بیگ اٹھا کر اندھا دھندھا گتی بھیڑ میں گم ہو گئی۔

اور وہ خسار پر ہاتھ رکھے ساکت سا اسے دور جاتے دکھتا چلا گیا۔
یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔



بشری اجیران نظروں سے ساس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

وہ اب شاپنگ بیگ سے سیاہ رنگ کا خوب صورت کڑھا ہوا سوٹ نکالنے کے بعد مثال کا سرخ رنگ کا سویٹر دکھا رہی تھیں۔ جس سے خوب صورت موتی لگے تھے۔

"یہ تو مجھے اپنی مثال کے لیے اتنا پسند آیا انہوں نے تو دکان دار سے قیمت بھی نہیں پوچھی۔ بس کہہ دیا تھا کہ اسے پیک کرو۔" اس سویٹر میں میری مثال تو کوئی شہزادی لگے گی۔ تمہیں کیسا لگا یہ سوئٹرز؟" وہ اب بہت پیار بھرے انداز میں پوچھ رہی تھیں۔

"مگر ابھی کس لیے؟" وہ کچھ رکھائی سے بولی۔ دوسرے لمحے اسے احساس ہوا تو فوراً ہلجھ پدل کر بولی۔

خود بشری نے اسے نئے گھر کے لیے مزید بہت سی چیزیں خریدی تھیں۔
عدیل نے بشری کے لیے ایک خوب صورت سی ساڑھی بھی بلای۔ اس کی محبت بشری کے لیے جیسے اور بھی بڑھ گئی۔ بشری اس کے والمانہ جذبات پر جیسے دل ہی دل میں مغرور ہوئی جا رہی تھی۔ آج کل صرف بشری اور مثال ہی برتو جو بے رہا تھا۔

صبح آفس جاتے ہوئے ماں اور فوزیہ سے کھڑے کھڑے دو چار باتیں کرناں سے دواؤں کا نسخہ لیتا۔ ان کی کچھ اور ضرورت کی چیزیں پوچھ کر خدا حافظ کہہ کر چلا جاتا۔

بشری اور کھڑکی سے دیکھتی رہتی۔
عدیل بھی یہ بات جانتا تھا۔ اس لیے وہ کم سے کم ٹائم ماں اور بہن کو دیتا۔ یوں بھی دونوں اس سے ابھی تک ناراض تھیں۔ وہ ٹھیک طرح سے بات نہیں کرتی تھیں۔ عدیل نے بھی منانے کی کوشش نہیں کی اور نہ لبا پوڑا جھگڑا شروع ہو جاتا۔ انہیں نظر انداز کرنے میں ہی عافیت تھی۔ اس کا ٹوٹا ہوا گھر جڑ گیا تھا۔ اسے اب کسی کی پروا نہیں تھی۔

بشری ابھی نیچے نہیں اترتی تھی۔
عدیل کی محبت نے اسے بے خوف کر دیا تھا اور نہ پہلے تو وہ ہر کام نسیم بیگم سے پوچھ کر کرتی تھی۔ ماں ایک مصیبت ابھی بھی باقی تھی کہ آئے دن نسیم بیگم کسی نہ کسی رشتے دیکھنے والے کو بلائے رکھتیں جس کے لیے بشری کو مارے باندھے نیچے اتر کر جانا بھی پڑتا اور نمائی انداز میں ساس اور نند سے بات چیت بھی کرنا پڑتی۔

"ہاں نہیں اس مصیبت کا کب نصیب کھلے گا تو میری جان چھوٹے گی۔" وہ جل کر سوچتی۔ لیکن ابھی تو فوزیہ کے نصیب کے سلسلے میں نہ کسی کی دعا اثر کر رہی تھی نہ بددعا۔ وہ ہنوز ماں کے سینے پر پتھر کی کبوتر جہاں تھی۔

نسیم بیگم اسے دیکھ دیکھ کر آہیں بھرتیں۔ عدیل کی بے رخی کا غم بھی تازہ تھا۔ پھر سو کے بے خوف، بے لحاظ انداز انہیں اور بھی آگ لگاتے مگر وہ خاموش تھیں۔

ان کی خاموشی سے بشری کچھ پریشان تو تھی شروع میں مگر اب وہ سمجھ چکی تھی کہ نسیم بیگم نے سمجھو ما کر لیا ہے مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ سمجھو ما کرنا نسیم بیگم کی فطرت میں نہیں ہے، انہیں صرف مناسب وقت کا انتظار تھا۔

فوزیہ خود ہر وقت سر جھاڑ منہ بہاڑھی پھرتی رہتی سلسلے سے اب کسی کی پروا نہیں تھی حتیٰ کہ خود اپنی بھی نہیں رہی تھی۔ خود کو بنانا سنوارنا سب فراموش کر چکی تھی۔

دو چار دفعہ نسیم بیگم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر فوزیہ کے منہ توڑ جواب پر انہوں نے اسے کچھ کہنا موقوف کر دیا۔

دونوں ماں بیٹی یوں چپ تھیں جیسے بولنا ہی بھول چکی ہوں۔ نیچے والے پورشن میں ہر وقت سناٹا رہتا جی کہ کسی برتن کے گرنے یا بچنے کی آواز بھی نہیں آتی تھی۔

کہانا ایک دن پکنا۔ دونوں ماں بیٹی دو تین دن چلا لیتیں یا بازار سے منگوا لیتیں۔ آج کل تو توئی بوی بھی زیادہ تر منہ ہی رہتا۔

اوپر والے پورشن سے آتی نہیں قہقہوں اور زندگی سے بھرپور شور کی آوازیں دونوں کی سامعیتیں ڈستی رہتیں۔

فوزیہ آنسو بھری شکایتی نظروں سے ماں کو دیکھتی ماں نظریں چرا کر کہیں اور ہی دیکھنے لگتی۔

نسیم بیگم فیصلہ کر چکی تھیں۔ صرف ٹھوک بجا کر اس کو صبح وقت پر کرنے کا فیصلہ کرنا ابھی باقی تھا۔ فوزیہ کے مقابلے میں نسیم بیگم کے چہرے پر آج کل خاصا اطمینان اور گہرا سکون تھا۔ آتے جاتے بھی بشری اس سکون

”بس سمجھیں ہوئی گیا۔“ لڑکی تو امی کو پسند آئی گئی ہے۔ اس ہفتے لڑکی والے فائنل بتا دیں گے تو ہم کوئی رسم کر لیں گے۔ بشری نے تفصیل سے بتایا۔
 ”اللہ بہتر کرے والا ہے۔ میں تو فوزیہ کے ماوسے کے بعد ایسی ڈری ہوں سوچ گیا ہے کہ کبھی نیچے بیچی کا رشتہ ایسی جگہ نہ کرو جن لوگوں کو آپ ٹھیک سے جانتے نہ ہوں۔ بڑے بڑے فریب و صحرے کے ہورے ہیں کن کل اللہ سب کو ایمان میں رکھے۔“
 ”جی۔ آپ صحیح کہتی ہیں۔ یہ کباب تو لیں ای امیں نے کل ہی بنائے ہیں۔“ اس نے دوسری پلیٹ پیش کی تو وہ خاموشی سے کچھ سوچتے ہوئے کباب کھانے لگیں۔



”مما ایلا آگئے ہیں۔“ مثل ہو ہو کر عمل کر چکی تھی۔ جب نیچے گاڑی گاڑی رکنے کی آواز آئی تو وہ شور مچاتی باہر آ کر لوٹی اور خود سیریلوں کی طرف بڑھ گئی۔
 بشری نے جلدی سے چائے کا پانی چولہے پر رکھا اور خود اپنی لب اسٹک کو فریش کرنے بزدوم میں چلی گئی۔ چائے کا پانی پک پک کر سوکھ گیا مگر عدیل اوپر نہیں آیا۔ مثال بھی باپ کے پیچھے نیچے چلی گئی تھی۔ اس نے بھی آکر کچھ نہیں بتایا۔ نیچے بھی مکمل خاموشی تھی۔
 بشری کو پہلے تو سخت گرفت اور غصہ آیا پھر وہ کچھ پریشان ہو گئی۔ عدیل نیچے اتنا ٹائم کبھی نہیں لگا تھا۔ وہ سیم بیگم کی طبیعت کی خرابی کا سوچ کر نیچے جانے کو بھی کہ عدیل اور مثال ہنستے باتیں کرتے اوپر آگئے۔ ”خیر تو تھی۔ آپ نے نیچے اتنی پور لگا دی؟“ وہ سخت لہجے میں کہہ اٹھی۔
 ”ہی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ فوزیہ کو بھی بخار تھا۔ انہیں پوچھنے بیٹھ گیا کہ ماموں کا فون آگیا سکر سے۔ ان کی بیٹی کی شادی ہے تو اسی سلسلے میں انہوں نے امی کو فون کیا تھا۔ اس میں کچھ ٹائم لگ گیا۔ چائے تیار ہے؟“ وہ بتا رہا تھا مگر اس کی آنکھوں میں کمری سنجیدگی تھی۔ بشری کو لگا کچھ اور بھی ہے جو عدیل یا تو بتانا بھول گیا ہے یا اسے بتانا نہیں چاہتا۔
 ”ہاں۔ میں بس لے کر آئی ہوں۔ آپ فریش ہو جائیں۔“ اس نے بحث کرنا ضروری نہیں سمجھا اور کچن میں چلی گئی۔

”میرا مطلب ہے مثال کے پاس تو پہلے ہی کافی ڈرہس ہیں اور سوئٹرز بھی۔ تو آپ یہ اتنا منگائیں لے آئیں بھلا۔“ وہ رک رک کر لہجے کو متوازن کرتے ہوئے کہہ گئی۔

”آئے ہے میری شہزادی کے پاس ہزاروں ہوں بھلے۔ دادی کے لیے کا تو کوئی مقابلہ نہیں جس محبت اور خوشی سے میں لے کر آئی ہوں اس کا کیا جوڑ۔“ وہ جوش میں بولتے ہوئے کچھ غصہ کر لیں۔
 ”نہیں امی! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ بشری کو فوراً ”معذرت خواہانہ انداز اختیار کرنا پڑا۔“
 ”اور مجھے تو لگتا ہے۔ تمہیں اپنا بھی سوٹ پسند نہیں آیا۔ حالانکہ یہ فوزیہ اتنے دل سے تمہارے لیے خرید کر لائی تھی کہ امی! بھابھی امی گھر میں ہیں۔ بھلے علیحدہ ہو گئی ہیں۔ ہم نے ان کی خوشی کو متایا نہیں۔ انہیں کوئی گفت نہیں دیا تو وہ دل میں کیا سوچتی ہوں گی۔“

سیم بیگم نئی سی کہانی اسے سن رہی تھیں۔ جو اس نے پہلے نہ کبھی سوچی تھی نہ سنی تھی۔
 ”نہیں۔ امی سوٹ تو بہت اچھا ہے بہت خوب صورت۔“ وہ بے چارگی سے کہہ گئی۔
 ”بلکہ میں تو کہتی ہوں کہ یہ کل فوزیہ پر بہت نیچے گا آپ اسے دے دیں۔ اس نے پستان میں نے پستان تو ایک ہی ہے۔“ اس نے طریقے سے سونٹ لوٹانا چاہا۔

”مودہ اتنی چاہ سے تمہارے لیے لے کر آئی اور تم ان اس کو واپس کر رہی ہو۔“ وہ خفا ہو گئیں۔
 ”اور اس نصیب ساری بریہ سیاہ رنگ کہاں جتا ہے۔ میں نے تو یوں بھی اسے یہ رنگ کبھی پہننے نہیں دیا۔ یہ تو پرست اٹھتا ہے۔ اب بحث نہیں کرو اور رکھ لو تمہیں پسند تو اپنی ملازمہ کو دے دیتا۔ ہم نے تو تمہیں تحفہ دیا ہے۔ اب تمہیں نہیں اچھا لگا تو۔“ وہ دل گرفتگی سے بولیں۔

”ہی ایسے تو نہ کہیں سوٹ تو اتنا اچھا ہے اور بانی چیزیں بھی۔ میں تو صرف آپ کی تکلیف کے خیال سے کہ رہی تھی اور میں ملازمہ کو کیوں دینے لگی۔ کل میں نیلر کو دے آؤں گی اور خود اپنے لیے بنواؤں گی۔“ وہ فوراً لہجہ بٹاش کر کے بولی سیم بیگم مسکرانے لگیں۔

”اور چائے تو میں بھول ہی گئی۔ آپ کے لیے رکھ کر آئی تھی چولہے پر ابھی لائی۔ فوزیہ کو بھی تو اڑتی ہوں وہ بھی آجائے اور۔“ وہ جاتے ہوئے بولی۔

”بخار ہے اسے تو وہ اے کر سوئی ہے۔ تم بس میرے اور اپنے لیے آؤ۔“ وہ فوراً بولیں۔
 بشری لوازمات کی بڑے اٹھا کر آگے رکھنے لگی۔ سیم بیگم نظر پھرا کر اطراف میں دیکھنے لگیں۔

ہر طرح کی سہولت۔ سجا سجا یا خوب صورت ڈرائنگ روم، نئے کارپس، خوب صورت پردے، چینی ڈیکوریشن، ہیسن۔ وہ تو جیسے آہ بھر کر رہ گئیں۔

”یہ مٹھائی لیں نا امی! وہ محبت سے مٹھائی پیش کرنے لگی۔
 ”یہ کون لایا تھا؟ جہاں سے عدیل لاتا ہے وہ والی مٹھائی تو نہیں لگتی۔“ ذرا سا چکھ کر ہی وہ فوراً بولیں۔
 ”جی۔ یہ امی لے کر آئی تھیں۔ کل ذرا پیر کے لیے آئی تھیں۔ جب آپ اور فوزیہ مارکیٹ گئی ہوئی تھیں۔ امی پہلی بار میرے گھر۔ مطلب یہاں آئی تھیں اس لیے مٹھائی لے کر آئیں۔“ اس نے کچھ تیزی سے کچھ رک کر مٹھائی کا حدود اور بتایا تو سیم بیگم کو اپنے اندھیرے میں چلائے تیر کو نشانے پہ لگتے دیکھ کر عجیب سی خوشی محسوس ہوئی۔

”عمران کا رشتہ ہو گیا؟“ ذرا دیر بعد یوں ہی پوچھنے لگیں۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

☆ تئلیاں، پھول اور خوشبو راحت جہیں قیمت: 250 روپے

☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 600 روپے

☆ محبت بیاں نہیں لہنی جدوں لہنی جدوں قیمت: 250 روپے

شائع ہوئے ہیں

خوبصورت سرورق
خوبصورت جہان
مضبوط جلد
آؤٹ لیٹ

منزلت: 6، مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

”یہ کیا جو اس سے ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ تم نے ان ماں بیٹے کا وہ منہ کیوں نہیں توڑ دیا۔ یہ منحوس پیغام اٹھا کر ادھر کیوں لے آئیں؟ ذکیہ بیگم اور عمران دونوں ایک دم سے بھڑک اٹھے۔

بشری بے بسی سے دونوں کو دیکھنے لگی۔
 ”امی! میں کیا کرتی۔ عدیل کا لہجہ اتنا خوفناک سا تھا، یقین کریں میں ڈر گئی۔ کچھ بول ہی نہ سکی۔“ وہ بے چارگی سے بولی۔

”یہی تمہاری کمزوری ہے۔ جس کا وہ لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔“ ذکیہ بیگم بھی بولیں۔
 ”اور ای! میں تو یہ مر کر بھی نہیں ہونے دوں گا۔ صاف صاف انکار کر دوں ان لوگوں کو جسے کوئی شوق نہیں قربانی کا بکرا بننے کا۔“ عمران تو بول بھی بے لحاظ سا تھا۔ بغیر کسی موت کے کہہ کر چلا بیٹا۔
 ”امی! بشری نے بے چارگی سے ماں کو دکھا۔

”تم فکر نہیں کرو۔ میں اس کا ایسا حل تمہیں دوں گی کہ وہ لوگ کچھ بول ہی نہ سکیں گے۔“ ذکیہ بیگم اسے تسلی دیتے ہوئے بولیں۔ بشری ماں کو دیکھتی رہ گئی۔



عمران مثال اور بشری کو گیٹ کے باہر ہی اتار کر چلا گیا۔ بشری بدوقت مٹھائی بھاری ٹوکری اٹھائے گھر کے کھلے گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ عدیل کی گاڑی کھڑی تھی۔

بشری نے عدیل کو آنے سے منع کیا تھا کہ اسے عمران ڈراپ کر جائے گا۔ اس کی توقع کے عین مطابق عدیل ماں بہن کے ساتھ نیچے لاؤن جی میں بیٹھا تھا۔ بشری چہرے سے ہشاش میسراہٹ لے سب کو سلام کرتی اندر داخل ہوئی۔
 ”پاپا! مثال! چھل کر باپ کی گود میں چڑھ گئی۔

تینوں کے چہرے ایک دم سے اجنبی ہو گئے تھے۔ بشری کو کچھ ایسا ہی لگا۔ اس نے مٹھائی کی رنگین ٹوکری سینٹل نیبل پر رکھی اور اپنا بیگ ایک طرف صوفے پر ڈال کر بیٹھنے لگی تھی کہ عدیل کھڑا ہو گیا۔
 ”کیا ہے یہ؟“ اس کا لہجہ اتنا سرد تھا کہ بشری کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔

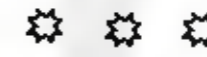
”یہ۔ عدیل! عمران اور حتا کی رسم تھی آج۔ مطلب وہ لوگ آئے تھے شکر ڈالنے تو یہ مٹھائی ای! لے دی۔ رشتے طے ہو گیا، عمران کا۔ اگلے سنڈے کو منگنی ہے اور ایک ماہ بعد شادی۔“
 وہ رک رک کر بے ربطگی سے کچھ جوش سے بتانے لگی اور اس کا جواب پورا ہونے سے پہلے عدیل نے ایک زبردوار تھپڑ بشری کے منہ پر بڑھ دیا۔

وہ تپور اگر کرنے لگی تھی کہ مثال نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
 ”تم سے میں نے کہا تھا کہ تم عمران اور فوزیہ کے رشتے کی بات نہ صرف کر کے آؤ گی بلکہ ملے کر کے آؤ گی اور تم مجھے یہ بکواس سنار ہی ہو۔ تمہاری ماں اور بھائی نے میں اتنا ہکا لیا ہے مجھے۔ انہوں نے میری بات کو سمجھا کیا۔ اب اس کا مطلب میں تمہیں سمجھاؤں گا۔“ اس کے چہرے پر صرف وحشت تھی۔

باقی آئندہ ماہ ان شاعراں

”ارے اتنا زبردست سیٹھ۔ یہ کس کا ہے عدیل! فوزیہ کے لیے لائے ہیں؟“ بشری خوب صورت گولڈ کا لاکٹ بیٹھ کر بے اختیار تعریف کرتے ہوئے پوچھ بیٹھی۔
 ”فوزیہ کا جب وقت آئے گا تو اس کے لیے بھی لے آؤں گا۔ ابھی تو تمہارا کافی قرض ہے مجھ پر۔ وہ تھوڑا تھوڑا کر کے اتارنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولا تو وہ بے یقین سی دیکھتی رہی۔
 ”تمہارے لیے ہے جان! عدیل نے دھیرے سے اس کی تاگ کی لوک کو چنگلی میں پکڑ کر لایا تو وہ بے وجہ ہی ہنس پڑی۔

”مائی گاڈ! یہ تو بہت زبردست ہے۔ یو آر سو سوٹ عدیل! اچھا جلدی سے پہنائیں مجھے۔“ وہ ہمیں اس کے آگے کر کے بولی تو وہ محبت سے اسے پہنانے لگا۔
 سرخ یا قوت اس کی دودھیا گروں پر عجب ہمارا دکھا رہا تھا۔ عدیل دیکھا رہ گیا۔ اس کی بے خود نظموں سے بشری بول ہی مسکراتے لگی۔



”بھی جانا ہے؟“ وہ حیران ہو کر بولی۔
 ”ہاں ابھی میرے ساتھ۔ تمہیں شام کو واپسی پر پک کر لوں گا۔ مثال کی تو بولیں بھی آج چھٹی ہے۔“
 ”مگر عدیل! مجھے تو تیار ہونا پڑے گا۔ اس عیلے میں چلی جاؤں کیا۔ آپ لیٹ ہو جائیں گے۔“ وہ اپنے رات کے کپڑوں کو دیکھ کر بولی۔

”تم تیار ہو جاؤ۔ میں بیٹھ کر لیتا ہوں۔“ وہ تھل سے بولا۔
 ”کیا امی کا فون آیا ہے۔ انہوں نے مجھے بلوایا ہے۔“ وہ فکر مند ہو کر بولی۔
 ”اونہوں نو مورا کو ٹیچن، پلیز تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ سب کچھ راستے میں بتا دوں گا۔“ عدیل کے دو ٹوک انداز سے سمجھ گئی کہ اب وہ مزید کچھ نہیں بتائے گا۔

دس منٹ میں تیار ہو کر وہ عدیل کے ساتھ ذکیہ بیگم کی طرف جانے کے لیے گاڑی میں بیٹھ چکی تھی اور وقتے وقتے سے عدیل کے سنجیدہ چہرے کی طرف دیکھتی رہی تھی۔
 ”اب سنو میری بات غور سے۔“ وہ بہت دیر بعد بولا تھا۔ بشری کا دل اس کے لہجے سے ہی پھر بے طمہ ہو چکا تھا۔
 لگا۔ اس کی بات اور بھی سما دینے والی تھی۔ اتنی کہ وہ اس کی بات ختم ہونے پر شاکندھی کوئی سوال بھی نہیں کر سکی۔

گاڑی اس کی ماں کے گھر کے آگے رک چکی تھی۔ عدیل اس کی طرف کا دروازہ کھول چکا تھا۔
 ”میں شام میں تم دونوں کو پک کر لوں گا۔ اگلے ٹیک گیر جاؤ۔“
 اس نے خود ہاتھ پکڑ کر بشری کو گاڑی سے اتارا اور مثال کو پار کر کے دوبارہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے پر بڑی جان دار مسکراہٹ تھی۔ بشری جیسے پتھر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ مثال نے ڈور نیل بجائی گیٹ کھلا اور مثال ہی بولتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی۔



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں نہیں :-

رُحسانہ نگار عدنان



- ✧ ہرائی بینک کا ڈائریکٹ اور ریٹیریوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بینک کا پرنٹ پر یو یو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ✧ ایب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہرائی بینک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ ہریم کوالٹی، ہائل کوالٹی، کمپرینڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج لکھانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشری ان کی سو سے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشری کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نوای اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشری اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بھو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصطفیٰ صاحبہ سے لگاؤ رکھتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشری کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑا ہے۔ سب سے پہلے سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشری کی سند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشری دہ لہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔ عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشری کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن زلمیہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشری اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشری اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشری کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عنان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عنان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹ اور گاڈس کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عنان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آرہے ہیں۔ عاصمہ کو فون کے ذریعے کوئی اطلاع ملنی ہے جسے سن کر وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ فون پر پتا چلتا ہے کہ شہر آتے ہوئے عنان اور فاروق صاحب ذہنیت کی وادعات میں قتل ہو گئے۔ عنان کے قریبی دوست زہیر کی مدد سے عاصمہ عنان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹ سے سات لاکھ روپے

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ڈورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جا سکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

کوشش کر رہی ہو۔

”ہم خود اپنی ماں کے پاس پیغام بہن کر جاؤ گی۔ بس“ وہ جیسے سارے مسئلے کا حل نکال کر چنکی نہ بجاتے ہوئے بھی مزہ سارے کر بولا۔

”ہاں تو ڈھنٹائی اور سبے شری بے غیرتی دیکھو۔ ان لوگوں کی کون سی فرمائش نہیں پوری کی میرے بیٹے نے۔ ان کی بیٹی کی۔ پھولوں کی بیج پر ہنسا رکھا ہے نواب زادی کو۔ کسی ملکہ رانی کی طرح لاڈ اٹھاتا ہے۔ کہیں کوئی کمی چھوڑی عدیل نے۔“

عدیل کے روتے نے نسیم کو جیسے نئی زندگی عطا تو انائی دے دی تھی۔ وہ ایک دم سے کھڑے ہو کر یوں دھاڑ کر بولیں۔ جیسے بیس سال پہلے ان کی دھاڑ اور گھن گرج سے پورا سسرال کانپا کرتا تھا۔ آج تو اتنے سالوں بعد ایسا تاجمایا میدان ملا تھا کھل کر کھیلنے کو۔

”تو کیا گی ہے میری فوزیہ میں؟ اللہ نہ کرے کوئی عیب ہے اس میں؟ کوئی کجی؟ کوئی لنگڑی لولی ہے؟ اندھی کلنی ہے یا خدا نخواستہ ہاتھ پیروں میں کوئی نقص ہے؟ ایسی تابع دار فرماں بردار، سکھو خاموش طبع ہر وقت بیوں کی جی حضوری کرنے والی میری بے زبان بیٹی۔ ابھی تو اس کی معصومیت کا قہر اللہ ان ظالموں پر بھی ضرور نازل کرے گا۔ جنہوں نے اس باکرہ پر گھر بیٹھے ایسا داغ لگایا۔ خدا ان کی نسلوں کو برباد کرے گا۔ کچھ سلامت نہیں بچے گا ان کل نہ گھریا نہ عزت و آبرو نہ جان دمال۔ کیڑے پڑیں گے جیتے جاگتے ان کے جسموں میں۔“ وہ قہر بھرے انداز میں بغیر سوچے سمجھے دیکھے بھالے بولتی جا رہی تھی۔

”اے۔ قسم لے لیں۔ میں نے بات کی تھی امی سے۔ مثال سے پوچھ لیں۔ میں نے عمران سے بھی کہا تھا۔“ بشری بے اختیار نسیم کے سامنے روتے ہوئے گڑ گڑا کر دونوں ہاتھ باندھ کر بولی۔

”نہیں! ابھی اتنی تو نہیں ابروی۔ جتنی میری فوزیہ ابرو چکی ہے۔“ انہوں نے سیاہ دل کے ساتھ سوچا۔

”تو کرا بھی اپنی ماں کو فون ملا اس کا نمبر اور کہہ اس سے کہ ابھی اگلے پیروں آکر میری فوزیہ کا ہاتھ مانگے۔ ورنہ بیس کھڑے کھڑے میرا بیٹا تھے تین حرف بول دے گا۔ پھر وہ شادیاں بجا کر سو بیاہ لائے۔“ وہ عدیل کو مان بھری نظروں سے دیکھ کر تنتنے سے بولیں۔

”امی۔! بشری اسن سی رہ گئی۔“

”معتنی کر دی ہے۔ مطلب بات طے ہو گئی ہے تو۔“ اس کا کچھ سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ اس حشر کی گھڑی سے کیسے نپٹنے۔

”سن لیا؟ دیکھ لی اپنی بیوی کی محبت اور تابع داری؟ اس پر جان چھڑکتے تھے تا تم؟ اس تا مین کو کیا فائدہ ہوا بیوں محبت کے کٹورے بھر بھر دودھ پلانے کا جو تیری عزت نہ رکھ سکی تیری لاج کو اپنی اس پلستریاں اور مکار بھائی کے ماسٹرنہ سنہال سکی۔ ارے لعنت ہے عدیل! تیرے یوں جو رو کے غلام بنے رہنے پہ۔ ہم دونوں ماں بیٹی کو کہیں سے زہری پڑا لادے۔“

وہ اپنے سینے پر ہتھ مار کر بال نوج کر جاہلوں کی طرح جین کرنے لگیں۔

”نرم اپنی ماں کو فون نہیں کر دی کہ وہ اگر اس رشتے کو قائم کرے؟“ عدیل سرد نگاہوں کے ساتھ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ بشری خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔

وصول کر پاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں متقلین کو دیکھتا ہے۔ زاہد، نسیم، بیگم سے بیس لاکھ روپے سے شرط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشری سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔ حمیدہ خالہ عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زبیر کا اکیلے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں جبکہ عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس کو خود کرنے ہیں۔ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زبیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آجاتا ہے کہ وہ امتحانی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے سے لے جاتا ہے۔

رقم مہیا نہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر سو اور اس کے گھروالوں کو مورد الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشری کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل طیش میں بشری کو دھکارتا ہے۔ اس کا اپارٹمنٹ ہو جاتا ہے عدیل شرمندہ ہو کر حافی مانگتا ہے۔ عمرہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر پلا جاتی ہے۔

اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے نکل کر خود کشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آجاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو پتہ چلتا ہے کہ زبیر نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بند کر دیے ہیں اور اب مفروز ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم عاصمہ کو ایک مکان دلا پاتا ہے۔ بشری اپنی واپسی الگ گھر سے شرط کر دینا ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل سخت پریشان ہے۔

تو کین قیظ

”نہیں۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ عدیل۔“ وہ کانپ کر بولی۔

عدیل کا یہ رویہ دیکھ کر بشری کے حواس ایک دم سے ساتھ چھوڑ گئے۔ اگرچہ ذکیہ نے اسے خوب ذہنی طور تیار کر کے بھیجا تھا اور اس سے یہ بھی کہا تھا کہ عدیل کو نسیم اور فوزیہ ٹھیک ٹھاک پٹی پڑھا چکی ہوں گی۔ شاہ تمہارے سامنے اس کا رویہ آئے جو تم نے عدیل سے کبھی متوقع نہیں کیا۔

لیکن ایسے روتے کی توقع اسے ہر حال نہیں تھی۔

”امی نے تو ان کو کھلوا بھیجا تھا کہ ابھی نہیں۔ مگر۔“ وہ اس کی شعلے اگلتی نظروں کی تاب نہ لا کر رحم طلب نظروں سے نسیم کو دیکھتے ہوئے ہٹلا کر بولی۔

ایک زبانی دار تھپڑ بشری کو اس کے قدموں سے اکھاڑ گیا۔

”عدیل! وہ پتھرائی نظروں سے گال پر ہاتھ رکھے بس اسے دیکھ گئی۔

وہ اس والے عدیل کو تو پہچان ہی نہیں پاری تھی۔

”جاؤ اور اپنی ماں کو جا کر پیغام دے دو میری طرف سے۔ بلکہ نہیں۔ پیغام دینے کی کیا ضرورت ہے اب کیوں امی؟“ وہ استہزائیہ انداز میں یوں ہی ماں کی طرف مڑ کر صلاح لینے کو بولا۔ جیسے اس سارے معاملے پر عدیل بہت کچھ طے پایا جا چکا ہے۔

”عدیل پلیز! آپ میری بات سمجھنے کی کوشش۔“ وہ پھر سے خود کو سنہال کر بولی۔

مثال اس کے ساتھ جڑ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ جیسے اسے اپنے ہونے سے کسی مضبوطی کا احساس دلا

”عدیل! اس کے خشک لبوں سے سرکوشی نکلی۔

”کردون۔“ عدیل نے سیل اس کی طرف بڑھایا۔

”آپ میرے ساتھ آئیں۔ میں آپ کو پوری بات بتاتی ہوں۔“ اس نے آنکھوں میں خاص الغت پیدا کرتے ہوئے اپنا بیٹے سے اس کا ہاتھ پکڑا۔

”کردون۔ یہ لوہ نمبر میں ملادیا۔“ وہ دھاڑا۔

اور بجلی کی سی تیزی سے اس نے ڈکیہ کا نمبر بھی ملادیا۔ بشری اسے یوں دیکھ رہی تھی۔ جیسے کانٹو بدن میں لہو نہیں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا ڈکیہ فون اٹھائیں گی نہیں یا اٹھا کر بھی انجان بنی بات کونہ سمجھنے کا ڈھونگ کرتی رہیں گی۔ کیونکہ فوزیہ کو وہ مر کر بھی ہو نہیں سکتی تھیں۔ وہ تو شاید بشری کے پیڑھے گھر کا سوچ کرنے کے لیے تیار ہو بھی جاتیں۔ لیکن عمران۔

بشری کو اس سے ایک فیصد بھی امید نہیں تھی۔

”کرد بات۔ کوان سے دس منٹ میں یہاں پہنچ کر فوزیہ کے ساتھ نکاح پڑھوائیں۔ ابھی اور اسی وقت۔ کرد بات۔“ وہ زور سے دھاڑا۔ بشری پتھر کی طرح کھڑی رہی۔

عدیل نے اس کی گردن سے بالوں کی ٹھنسی بھری اور سیل اس کے کان سے لگا دیا۔

بشری کے حلق سے ٹھنسی ٹھنسی سی چیخ نکلی۔

”دیکھ کیسی حرافہ ہے۔ ڈھیٹ زانے بھر کی سہ شوہر کی حیائتہ ساس بنتے کا کوئی ڈر خوف۔ یہی سمجھے ہوئے ہے نا کہ دو چار گالیاں کھونے اور تھپڑی لگین کے نا تو کوئی بات نہیں۔ کھالے گی۔ مصیبت تو مل جائے گی نا پھر سے شوہر کو اسی طرح ٹھنسی میں کر کے الو سیدھا کرتی رہوں گی۔“ نسیم عدیل کے غصے اور غیرت کو ہوا دیتی جا رہی تھیں۔

”چھوٹے بھائی! لعنت بھیجیں۔ ایسا کچھ نہیں ہونے والا اور میں ایسا رشتہ ان پتھروں سے جوڑنا بھی نہیں چاہوں گی۔ جن کے دل میں میری ذرا سی قدر ذرا سی محبت بھی نہیں ہے۔ زور زورستی سے بھلا تم کیا میرا یہاں رشتہ جوڑو گے۔ مجھے بخش دو تم سب۔ مت بناؤ میرا تماشہ۔ ہر ایک کے آگے مجھے مت ڈالو۔ میں اتنی ناتواں اتنی گری پڑی ہو گئی ہوں؟“ فوزیہ کہتے کہتے ہسٹرائی انداز میں چلائے گی۔

”فوزیہ! میری بیٹی، تجھ پر سارا کچھ داروں۔ تو کیوں گری پڑی ہونے لگی؟ تیری ماں تجھ پہ قربان۔“ نسیم اسے سنبھالتے دہری ہو کر رونے لگیں۔

”تو تم نہیں بات کر دو گی؟“ عدیل کا غصہ کسی درجہ کم نہیں ہو پارہا تھا۔ ہوتا بھی کیسے۔ دونوں دتھے دتھے سے اس میں سیل جو ڈال رہی تھیں۔

”عدیل! اس طرح فون پہ بات۔“ بشری نے سمجھانا چاہا۔

”بات کرو۔“ وہ بالوں کی طرح دھاڑا۔

”نہیں۔ نہیں کروں گی۔“ بشری کو لگا بس اس میں اتنی ہی برداشت تھی۔ اس سے زیادہ نہیں۔ وہ اپنے بال اس سے چمڑا کر اسے پرے دھکیل کر زور سے چلائی۔

مثال سب کی چیخوں اور خوشخوار شکلوں سے ڈر کر صوفے کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئی۔

اس کی صرف آنکھیں ان کو دیکھ رہی تھیں۔

وہ جو اس کے سب سے پیارے رشتے تھے اور وہ ان کی سب سے پیاری۔

اس کا باپ، جو اس پر جان چھڑکتا تھا۔

اس کی ماں جو مثال کی خاطر اپنے بچے کا قتل بھول گئی تھی کہ کہیں اس کی مثال کو باپ سے زوری کا غم نہ سہتا بڑھائے۔ اپنی انا اور ضد پر پیر رکھتی پھر سے اس کے باپ کے گھر واپس آگئی تھی۔

اس کی برادری جو کھتی تھیں۔ مثال میری جان ہے۔ میری شہزادی ہے۔ یہ سب کچھ مثال کا ہی تو ہے۔ اور اس کی چھپو جس نے سلائی کڑھائی بیگنی تو سب سے پہلے مثال کے کپڑے سے۔ اس کے خوب صورت نراکوں پر کڑھائی کی۔ اس کے لیے ننھے ننھے سوٹر بنے اور ایک پیاری گلابی رنگ کی ادنی ٹوپی بھی بنائی اور جب موڈ میں ہوئی تو مثال کڑیا کے لیے پیارے پیارے کپڑے بھی سی دیتی۔

اور اس وقت یکی پیارے رشتے اسے لگا اس پر پل پڑیں گے اور اس کا خون چوسنا شروع کر دیں گے۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے زور سے آنکھیں میچ لیں۔ اس کے منہ سے ہلکی ہلکی چیخیں نکلنے لگیں۔ جنہیں اس نے منہ کے آگے نٹھاسا ہاتھ رکھ کر روک لیا۔

”طلاق دیتا ہوں۔ میں تمہیں ابھی اور اسی وقت طلاق۔ طلاق دیتا ہوں۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ میرے گھر سے۔ میری زندگی سے۔“ اس نے مشتاقی کی ٹوکری کو زور سے لات مار کر دور پھینکا اور ایک دم سے جیسے تیز زلزلے کے بعد گہرا سکوت چھا جائے۔

ایک دھڑام دھڑام کی آوازوں کے بعد گیمبر خاموشی ہو جائے۔ مت خون خرابے کے بعد کرفولگ جائے بالکل بسکی چپ بسکی نے آواز خاموشی نہ تھی۔ جس میں سانسوں کی آواز بھی نہیں سنائی دے رہی تھی۔

مثال نے ڈر ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولی کر سب کو کھنڈ۔

اسے لگا شاید وہ اس کا خون پینے لگے ہیں۔ وہ اور بھی گھڑی بن گئی۔

مگر سب تو مجتہدوں کی طرح یوں اپنی اپنی جگہ پہنچے کھڑے تھے۔ جیسے کسی پری یا جاادو کرنے انہیں اپنے جاادو کے زور سے پتھر کا بنا دیا ہو۔

اس کی ماں کا تو منہ بھی کھٹا تھا اور آنکھیں اتنی پھیلی ہوئی تھیں۔ جیسے پھٹ جائیں گی۔ سیل فون اس کے قدموں کے پاس گرا تھا۔ جانے کس کے ہاتھ سے چھوٹ کر۔

مثال نے ڈری ڈری نظروں سے فون کو دیکھا۔

خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

☆ تیلیاں، پھول اور خوشبو راحت جبین قیمت: 250 روپے

☆ بھول بھلیاں تیری گلیداں فائزہ افتخار قیمت: 600 روپے

☆ محبت بیاں نہیں لبتی جدون قیمت: 250 روپے

☆ شائع ہوئے ہیں

☆ خورشید سرور

☆ خوبصورت چھاپی

☆ مشہور جلد

☆ انٹسٹیو

☆ 32216361 فون۔ کراچی۔ اردو بازار، 37۔

بشری۔ بشری۔ عدیل۔ کیا بات ہے۔ کس نے فون کیا ہے۔ مثال؟ ذکیہ کی حیرت بھری چیخ آواز اس سے آ رہی تھی۔
مثال بس فون کو دیکھے مگنی۔

بشری آدمی صوفے پر آدھی زمین پر لڑھک کر بے ہوش ہو گئی۔
مگر کسی نے اسے پکڑنے کی بات تھانے کی کوشش نہیں کی۔ حتیٰ کہ پیانے بھی نہیں۔
”مما۔ مما۔ مما! انھیں نا۔ مما! میری طرف دیکھیں۔ پاپا! دیکھیں۔ مما کو کیا ہوا۔ مما! انھیں کھولیں۔ مما! پاپا! دیکھیں نا۔“ وہ سارا ڈر خوف بھلا کر بے اختیار ماں سے لپٹ کر اسے بمشکل کھینچنے کی کوشش کرتے ہوئے باپ سے فریاد کرنے لگی۔

”وہ کھوکھلا کر رہی ہے مکار۔ سارے فون میں طاق کر کے بھیجا ہے ماں نے۔ خس کم جہاں پاک۔“ نسیم نے یوں نفرت بھرے انداز میں بے ہوش بشری کو دیکھا جیسے اسے پیروں سے ٹھو کریں مار کر بست و نون کی نفرت اور غصہ نکالا ہو۔

”نہیں عمران میرا وہم نہیں ہے۔“ ذکیہ نے بے قرار ہو کر موبائل فون کو دیکھا اور پھر سے نمبر ملانے لگیں۔
”جب وہاں سے کوئی بول نہیں رہا۔ فون نہیں اٹھا رہا تو کیوں بار بار نمبر مل کر ان فضول لوگوں کو ان کی اہمیت کا احساس دلا رہی ہیں؟ وہ لوگ ہیں ہی اس قابل کہ انہیں انور کیا جائے۔ دو چار دن اس طرح خاموش رہیں گی تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“

اس نے بے حس انداز میں کہتے ہوئے ذکیہ کے ہاتھ سے سیل فون لیا اور ایک طرف صوفے پر اچھال دیا۔
ذکیہ کو پہلی بار بہت کچھ ہو جانے کا وہر کا سا ہوا۔ انہوں نے زور سے سر جھٹکا۔
”وہم ہے یہ۔ کچھ نہیں ہوگا۔“ وہ خود کو تسلی دینے کو بڑھا نہیں۔

”ہاں! اچانے تو پلوا نہیں۔ سر میں درد ہونے لگا ہے۔ یہ آبی کا آنا بھی آج کل درد سرنماتا جا رہا ہے۔“ عمران نے ریوٹ ہاتھ میں لے کر چیمبرل پر چیمبرل بدلتے ہوئے کچھ بے زاری سے کہا۔
”عمران! جب میرے فون پر کال آئی عدیل کی تو دوسری طرف کافی شور تھا۔ جیسے بہت سے لوگ مل کر بول رہے ہوں یا بیخ رہے ہوں۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔“

وہ خود کو تسلی دلا سا سب دے چکیں تو جیسے بے بس ہو کر بولیں۔ عجیب طرح کی بے بسی تھی ان کی آنکھوں میں۔
”فون ای! فضول کا سین کری ایٹ نہ کریں۔ کچھ بھی نہیں ایسا۔ غلطی سے مثال نے نمبر ملادیا ہوگا اور پھر بتل کہیں ڈال کر اپنے کھلونوں میں مصروف ہو گئی ہوگی۔ پلیز آپ زیادہ ٹینشن نہیں لیں۔“ بشری آبی سے بات کر لیتی تھی۔
”عدیل نے صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

ذکیہ متذبذب سی بیٹھی رہ گئیں۔
”اب کیوں ایسے بیٹھی ہیں۔“ مڑکھاں کی سوگوار سی شکل کو دیکھ کر کچھ کوفت سے بولا۔
”عمران! ایک دفعہ تم بشری کے نمبر پر فون کرو۔ میں اس سے بات کر لوں تو مجھے قرار ملے گا۔“ وہ کچھ لجاجت سے بولیں۔

عمران نے بے زاری سے ان کی طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے سیل اٹھا کر بشری کا نمبر ملانے لگا۔
”لیجئے۔ کوئی فون نہیں اٹھا رہا۔ آبی صاحبہ اپنی رو بھی نندا اور ساس صاحبہ کے گھنٹوں سے لگی بیٹھی ہوں گی۔ کیا سڑی شکل ہے اس فوزیہ کی۔ میں تو کہتا ہوں اس۔ کیا نام تھا جس سے اس کا نکاح ہوا تھا۔ ہاں! بار بار

ٹھہر۔ اچھی قسمت تھی اس کی جو سستے میں چھوٹ گیا۔ ماں کی طرح حساوی طبیعت ہے اس کی۔ ذکیہ تاسف سے عمران کو دیکھ کر کہیں۔



وہ کتنی دیر بے حس و حرکت پڑی رہی۔ اسے پتا نہیں چلا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ ارد گرد سارے میں گہیر چپ تھی۔

کچھ دیر پہلے کا وہ دھیانک منظر اس کی نظروں کے سامنے پوری جزئیات کے ساتھ گھومنے لگا۔
عدیل کا سرخ بھسوکا چہرہ، خونخوار آنکھیں اور چٹکھاڑا بالجہ اور پھر جو کچھ اس نے کہا۔ بشری کے منہ سے سسکی نکلی۔

سب کچھ ختم کرتے وہ تین جملے لمحہ بھر کو اس کا دل بند سا ہوا۔ بائیں بازو اور سینے میں درد کی تیز لہر نے سر اٹھایا۔

ارد گرد سے لمحہ جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔
اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھی مثال اس کے اس جھٹکے سے صوفے سے لڑھکنے لگی۔

وہ پچھلے ستائیس منٹوں سے نیم بے ہوش ماں کے ساتھ جڑی بیٹھی اس کی براؤن قمیص پر بنے بلیک اینڈ براؤن ڈیرائن میں چمکتے موتیوں پر نگاہ جمائے بہت کچھ اخذ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اسے یاد تھا عدیل نے جب یہ سوٹ بشری کو لے کر دیا تھا تو وہ شام بھی ان کی زندگی کی یادگار شاموں میں سے ایک تھی۔ بشری اور مثال کی پسند کی ڈھیرل شاپنگ کی گئی تھی۔ لیکن یہ سوٹ عدیل نے اپنی پسند اور بہت محبت سے بشری کو خرید کر دیا تھا۔

بشری کو یہ پسند بھی بہت آیا تھا۔
انگلے ہی سینے اس نے ویک اینڈ پر اسے پسن بھی لیا تھا اور وہ تینوں ڈنر کے لیے باہر بھی گئے تھے پیانے ماما کے لیے پھولوں کے گجرے بھی خریدے تھے اور آج کی سوٹ۔ جس کا نیا پن ابھی ماند نہیں پڑا تھا۔ مگر اس کے رنگ ان موتیوں کی چمک جیسے سب کچھ بچھ سا گیا تھا۔

اس گھرے رنگ میں بشری کا روپ سنو لایا ہوا اجڑا ہوا لگ رہا تھا۔
لیکن اسے ابھی تک امید تھی کہ پیانے کا غصہ کچھ دیر میں کم ہو جائے گا تو وہ پہلے کی طرح ماما کی ہل جونی کرنے ملے آئیں گے۔ بلکہ فوراً سے پہلے انہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر جائیں گے اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ بالکل پہلے کی طرح۔

مگر اسے نہیں پتا تھا۔ اب کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ اگر کچھ بچا بھی ہے تو وہ پہلے کی طرح تو بالکل بھی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ کم از کم اس شخص کی بیٹی کے لیے تو کبھی بھی نہیں۔

لیکن وہ ایک آس سی نظروں میں لیے ایک ننگ اونڈھی بڑی ماں کو دیکھے جا رہی تھی۔
”مما! اس نے آہستہ سے ماں کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

بشری سوتی ہوئی آنکھوں سے ہوتے چہرے کے ساتھ خالی خالی نظروں سے سب طرف دیکھ رہی تھی۔
چند ہی لمحوں میں سب کچھ اجنبی ہو چکا تھا۔ بالکل اجنبی۔

اس کے لیے یہاں رہنے یا ٹھہرنے کا کوئی جواز نہیں بچا تھا۔ سب جواز سب ہانے ایک دم ختم ہو گئے تھے وہ مگر اس کے لیے اتنا ہی اجنبی ہو چکا تھا۔ جتنا اس کی شادی سے پہلے اس کے لیے تھا۔

اب اس کے لیے یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔
اس نے مثال کا ہاتھ مضبوطی سے اپنی مٹھی میں لیا اور دوسرے ہاتھ سے بالوں پر ہاتھ پھیر کر ذرا سا ٹھیک کر کے دیکھنے لگی۔

اس کے قدموں کے پاس رنگ برنگی مٹھائی کے ٹکڑوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ جسے لات مار کر عدیل نے الٹا دیا تھا۔ اس نے جوڑ بھرے اس ماحول کو دیکھا اور مثال کو لے کر باہر کی طرف چل پڑی۔ اسے اپنا ہینڈ بیگ بھی اٹھانا یاد تو اب کچھ بھی نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ سب کچھ بھول جانا چاہتی تھی۔ اس نے ایک خالی خالی نظر سب طرف ڈالی۔

وہ تینوں جانے کون سے کمرے میں تھے۔

عدیل شاید اوپر تھا۔ بشری کے دل میں نفرت کی ایک تیز لہر دوڑی۔

اس نے کچھ اور بھی مضبوطی سے مثال کا ہاتھ تھاما اور اسے لے کر گیٹ کی طرف بڑھی۔

”مما۔ ہم کہاں جا رہے ہیں اس وقت۔ اوپر۔“ نے گھوم۔ ”مثال ماں کو اٹھتے اور یوں چلتے دیکھ کر ہی کچھ مطمئن ہو چکی تھی۔ اوپر کا راستہ یوں بھی باہر سے اوپر جاتا تھا۔ سو وہ بھی گئی۔
بشری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے لے کر گیٹ سے ذرا فاصلے پر رک کر اس نے مڑ کر دیکھا۔
عدیل اس کے سامنے کھڑا تھا۔

بشری نے ایک زخمی نفرت بھری نظر اس پر ڈالی اور سرخ پھیر کر جانے لگی۔

عدیل نے ایک جھٹکے سے مثال کا ہاتھ کھینچ کر اسے اپنے پیچھے کر لیا۔

”یہ تمہارے ساتھ نہیں جانے کی۔“ وہ دلی ہوئی آواز میں غرا کر بولا۔

”تم اس کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔“ وہ چیخ کر بولی۔ ”چھوڑو اسے۔ یہ میری بیٹی ہے۔ میں تم جیسے جانوروں کے پاس تو اسے ایک لمحہ کو نہیں چھوڑوں گی۔“ وہ سارے لحاظ موت ایک طرف کر کے زور سے بولی۔

”یہ صرف میرے پاس رہے گی۔ تمہارا اب اس سے کوئی تعلق نہیں۔“ وہ بھی جواباً اسی نفرت سے بولا۔

”چھوڑو اسے۔ مثال! چلو میرے ساتھ۔“ وہ مثال کو کھینچتے ہوئے بے قابو نفس کے ساتھ بولی۔

”مثال کو تو تم ہاتھ بھی نہیں لگا سکتیں۔ یہ تمہارے ساتھ رہے اور تم جیسی بد زبان ڈھیٹ اور بے لحاظ بننے میں کبھی نہیں چاہوں گا۔ تمہیں یہاں سے اکیلے ہی جانا ہوگا۔“ عدیل اسے دیکھ کر سرد لہجے میں بولا۔

”چھوڑو میری بیٹی کو ورنہ میں شور مچا کر سارا محلہ اکٹھا کر لوں گی اور تم لوگوں کی اصلیت سارے زمانے میں کھول دوں گی۔ تم۔ کیا ہو۔ تمہارا اصل۔“ بشری افسے بے بسی، نفرت لہا چاری اور رنج کے عجیب سے مقام پر آکر کھڑی تھی۔ اس سے کچھ بھی نہ ڈھنگ سے بولا جا رہا تھا۔ نہ سوچا جا رہا تھا۔

وہ بس دیوانہ وار مثال کو اپنی طرف کھینچتی جا رہی تھی۔

”تم سارا محلہ کیا سارا شہر بھی اکٹھا کر لو تو بھی۔ مثال کو تو میں تمہیں چھوٹے بھی نہیں دوں گا۔ نکلو یہاں سے۔“

عدیل کی آنکھوں میں زمانے بھری حقارت اور لہجے میں دھتکار تھی کہ بشری کو لگا کہ وہ اس دنیا کی ذلیل ترین اور گری ہوئی عورت ہے۔

”چھوڑو اسے۔ یہ میری بیٹی ہے۔“ آنسوؤں کی روانی کی شدت میں اسے اب کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ مثال کو کھینچ رہی تھی اور عدیل کی گرفت مثال کے گرد مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ مثال کو لگا کہ یہ بھی اس کا دم

گھٹ جائے گا اور وہ مرجائے گی۔ اس نے ایک دم سے دونا شروع کر دیا۔

”مما۔ ماما۔ پاپا۔ چھوڑو بس مجھے۔ ماما!“ وہ زور زور سے رورہی تھی۔

”عدیل! منہ پر ہار اس کی چھو کر ہی کو۔ تاگن کی اولاد تاگن ہی نکلے گی۔ دفعان کر دے اسے بھی ماں کے ساتھ۔ تو کیوں اس منحوس کی پرورش کا درد سراٹھاتا ہے؟“ نسیم برآمدے میں کھڑی لاکر کر بولیں۔

”ہرگز نہیں۔ میری زندگی میں یہ کبھی نہیں ہوگا۔ مثال صرف میرے پاس رہے گی۔ میں اس عورت کا سلیب بھی اس پر نہیں پڑنے دوں گا۔“ وہ لب مثال کو گود میں اٹھا کر مضبوطی سے بولا۔

بشری دیوانہ وار اسے نوچنے لگی۔

اس کا ریمان بانو شرت کے منہ عدیل کا چہرہ سب کچھ بشری کی دیوانگی کی زوش تھا۔

”اسے دفع کر عدیل! دور کر اس چھٹی کی کو۔ جیسی ماں ہے یہ ویسی نکلے گی۔ ان کبھی سوس کے خون میں نہ دغا ہے نہ نبض۔ کل کو اس کی وجہ سے دکھ اٹھائے۔ یہ مجھے کبھی خوش نہیں دے سکتی۔ جانے دے اسے ماں کے ساتھ۔“ نسیم اس کے پاس آکر مخصوص لڑا کا انداز میں چلا کر بولیں۔

”چھوڑو اسے۔ چھوڑو میری بیٹی کو۔“ بشری اب باقاعدہ عدیل کو دونوں ہاتھوں سے مار رہی تھی۔

”نکلے۔ نکلے تم یہاں سے۔ جس کو لے کر آتا ہے لے آ جا کر۔ میں مثال کو کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گا۔ اب اس پر تمہارا کوئی حق نہیں۔ جاؤ یہاں سے۔“ عدیل نے زور سے بشری کو گیٹ کی طرف دھکا دیا۔

وہ زور سے جا کر دیوار سے لگی۔ اس کو لگا اس کا کندھا اتر گیا۔ درد کی شدت سے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔
گمراہ زخمی شیرنی کی طرح چہرے جا کر عدیل سے بھڑکی۔

”میرے جیتے جی میں اپنی بیٹی تمہارے جیسے جانور۔ ورنہ کے حوالے نہیں کروں گی۔ وہ اسے مجھے مثال! دبا لکل ہوش و خرد سے بیگانہ ہو چکی تھی۔

”مما۔ ماما۔ مجھے ماما کے ساتھ جانا۔ مت ماریں ماما۔ پاپا کو۔ پاپا۔ ماما اور ہی ہیں۔“ مثال بھی زور زور سے روئے جا رہی تھی۔

”اسے دفع کر دے عدیل! درد کر ان نحوستوں کو۔ اپنے اوپر سے ٹال۔ میرے بچے۔“ نسیم اب کے مثال کو اس کی گود سے اتارنے کی کوشش کرتے ہوئے بولیں۔

”یہاں نہیں ہو سکتا ہی! میں مثال کو کہیں نہیں جانے دوں گا۔ اس عورت کے ساتھ تو بالکل بھی نہیں۔“ عدیل مروتھا۔ مثال کو اس کی گرفت سے چھڑانا آسان نہیں تھا۔

بشری پورا زور لگا کر عدیل کو دھکیل دھکیل کر اب بندھا ل سی ہو چکی تھی۔ مگر مثال کو یہاں چھوڑ کر جانے کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

چھوڑو اسے۔ ورنہ میں ابھی پولیس کو فون کر کے بلوا لوں گی۔ سوہ آخری وار کے طور پر اس کی گود سے مثال کو کھینچتے ہوئے چلائی۔

”اپنے باب کو بھی بلالو تو بھی تم مثال کی شکل کو ترسو گی اور اب بہت ہو گیا ڈراما۔ نکلو یہاں سے۔ کوئی جگہ نہیں بنے تم جیسی ناشکری بد زبان عورت کی اس گھر میں۔“ اس نے بشری کا ہاتھ زور سے اپنے آہنی پنچے میں جکڑا اور

”سر سے لے کر اسے گیٹ کا پٹ کھول کر اس نے بشری کو پوری قوت سے باہر دھکیل دیا۔
مثال کی دل خراش چیخوں نے اس کے دل کو دھلایا۔ نہ بشری کے دواوے پلے۔

وہ اب دیوانہ وار باہر گیٹ بیٹ رہی تھی۔

”عدیل! سارا محلہ اکٹھا ہو جائے گا۔ ابھی اس مثال کو بھیج دے اس کے ساتھ۔ بعد میں جا کر لے آنا۔ تو باپ

www.PAKSOCIETY.COM

ہے۔ تیرا حق ہے اس پر۔ یہ تیرے پاس ہی رہے گی۔ ابھی تو یہ مردود تماشا لگا رہی ہے باہر۔“ نسیم نے پاگلوں کی طرح گیٹ پینٹی بشری کے واویلے پر کچھ گھبرا کر عدیل کو سمجھانے کی کوشش کی۔
 ”یہ جو کچھ کر سکتی ہے اسے کرنے دیں۔ میں مثال کو نہیں دلوں گا۔ بس بھی نہیں۔“ عدیل سختی سے بولا۔
 ”مما! ممما۔ مجھے ماما کے ساتھ جانا ہے۔“ مثال ہاں کی باہر سے آتی چیخوں پر روتے ہوئے زور سے بولی۔
 تراخ!

عدیل نے زور سے مثال کے منہ پر تھپڑ مارا اور مثال کی آوازیوں گم ہوئی۔ جیسے اب کبھی نکلے گی ہی نہیں۔
 بشری اسی طرح گیٹ پیٹے جا رہی تھی۔
 ”بھلے رات بھر یہاں کھڑی چیختی رہو۔ پولیس کو لے آؤ یا کسی کو بھی۔ مثال کی جھٹک بھی تمہیں نہیں ملے گی۔“ اس نے بلند آواز میں کہا اور مثال کو لے کر اندر چلا گیا۔ نسیم وہیں کھڑی رہیں۔ بشری گیٹ پیٹے جا رہی تھی۔



رات بھی اس کائنات کے اسراروں میں سے ایک ہے۔ ایک ایسا بھید ایسا اسرار جسے ہر زمانے ہر قرن میں اہل عقل اہل دانش کھوجتے رہے اور وہ اس کی حقیقت کو نہ جان سکے۔
 اس کو بھی تو یہی لگتا تھا۔ وہ زمانوں سے ان سیاہ راتوں کو کھوج رہی ہے۔ اس سیاہ رات اور اپنے حوزہ میں اسے بہت مماثلت نظر آتی۔ اسے لگتا یہ کلی راتیں اور وہ دنوں، ہمذات ہیں۔
 وہ ان سیاہ راتوں میں خود کو بہت آرام و محسوس کرتی کہ اس کے ارد گرد ان کا وہ ان چاہا شور، ساعتوں پر کوڑے برسائی وہ ناپسندیدہ آوازیں نہیں ہوتی تھیں۔
 مگر رات سنے اس پہ ستم بھی بہت ڈھائے ہیں۔ یہ بھی حقیقت تھی۔ مگر وہ اس حقیقت کو جانتے بوجھتے بھی رات سے بڑی عقیدت رکھتی تھی۔

اس نے کوفت زہ انداز میں کتاب بیڈ پر پلٹ دی۔ اسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ مگر اسے یہی امید تھی کہ شام تک سب لوگ واپس آجائیں گے تو ظاہر ہے رات کے کھانے کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ لیکن شام سے رات ہو گئی سنہ کوئی واپس آیا اور کھانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے الماری کھولی تو بسکٹ کے ڈبے میں صرف تین بسکٹ باقی بچے تھے۔ دونوں سے اس کا گزارہ ان ہی بسکٹوں پر تھا۔
 کل دوپہر میں کلج کی کینٹین سے دو سو سے کھالیے تھے اور رات میں چائے کے ساتھ یہی بسکٹ۔ مگر آج صبح تو کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کلج وہ گئی نہیں تھی۔
 اور کھانا منگوانے کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔

بہت سوچ پچھار اور بھوک سے بے چین ہو کر اس نے دوسری بار چوری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔
 اگرچہ اسے پتا تھا۔ اب کے یہ چوری ضروری ہے اسے سب کی نظروں میں لے آئے گی۔
 لیکن بھوک سے بڑھ کر کوئی بھی عفریت طاقتور نہیں ہوتا۔ پیسے نکالتے ہوئے وہ جان چکی تھی۔
 برس میں اب صرف دو ہی سو خنوٹ بچے تھے۔ اس نے تو صرف دو ہی نوٹ نکالے تھے۔
 ایک دم جانے کرے کے کون سے کون سے مینڈک کی ٹرٹڑ جیسی موبائل فون کی آواز گونجنے لگی۔
 وہ کچھ ہراساں ہی کھڑی رہی۔ فون بجاتا رہا اور پھر خاموش ہو گیا۔
 وہ واپس مڑ کر جانے لگی کہ پھر سے فون بجنے لگا۔

”کسی کا ضروری فون نہ ہو۔“ یہی سوچ کر اس نے صوفے کے کئینڈے کے نیچے ہاتھ مار کر فون نکالا۔ اسکرین پر چمکتا نام دیکھ کر اس نے زور سے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ بچے سون کو پلٹیں جھپکے بغیر دیکھتی رہی۔ اس نے ہتھکڑی سے فون صوفے پر پھینکا اور خاموشی سے باہر نکل گئی۔



ذکیہ گیٹ کھولے ساکت سی کھڑی رہ گئیں۔ بشری ٹیکسی سے اتری تھی اور وہ جس حالت میں تھی ذکیہ کا دل بند ہونے کے لیے وہ منتظر کالی تھا۔ بکھرے ہل ۱۲ اجلیہ سو جا ہوا چو اندر کو دھکی آنکھیں اور سب سے بڑھ کر لڑکھڑاتی چال۔ اس کے شانے دوڑنے سے بھی بے نیاز تھے۔ کندھے نہ کوئی بیگ تھا نہ ہاتھ میں پرس۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ ٹیکسی والے نے اس سے کچھ کہا تھا۔ جس سے بے نیاز وہ کسی روٹ کی طرح چلتی ماں کے پاس آئی۔ ”بشری! میری بیٹی! کیا ہوا؟ تم ٹھیک تو ہونا؟“ ذکیہ نے خود کو دھوکا دینے کو یہ سوال پوچھا۔ اس کی حالت سچ سچ کر کہہ رہی تھی کہ وہ ٹھیک کب ہے۔

”کب ہے۔ کچھ ایسا ایسا۔“ ذکیہ کے دل میں منحوس سا دوسرا بھرا۔ ”نہیں۔ نہیں! ایسا کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں جانتی ہوں۔ شاید لڑائی ہوئی ہو۔ یا یہ جھگڑا آئی ہو۔“ ذکیہ نے بے اختیار بشری کو تھامنے کے لیے بائیں پھیلاتے ہوئے اپنے ہی دوسرے کو جھٹلایا۔ ”مثال۔ مثال کہاں ہے بشری۔“ وہ بیٹی کے بغیر کیسی ادھوری ادھوری سی لگ رہی تھی۔ بے اختیار ڈک پوچھنے لگیں۔

”انہوں نے چھین لیا۔ اسے مجھ سے چھین لیا۔ ان ٹالوں نے امی۔ میری مثال۔ مجھے نکال دیا۔ دے دے کرا می۔ میری بیٹی۔ وہ رو رہی تھی۔ ماما کہہ رہی تھی۔ مجھے آوازیں دے رہی تھی۔ انہوں نے گیٹ بند کر لیا اور میری مثال۔ امی۔“ وہ ہڈیانی انداز میں بے ربط سا بولتے ہوئے بے دم سی ہوئی اور ذکیہ کی بانہوں میں جھول گئی۔ ”بشری! بشری! بشری! بشری۔ ہوش کف۔ عمران۔ عمران۔ باہر آؤ بیٹے۔“ ذکیہ بے قابو ہو کر چیخنے لگیں۔



”مجھے ماما کے پاس جانا ہے۔ ماما۔ ماما۔ مت مارو میری ماما کو بابا۔ گیٹ کھول دیں۔ ماما مجھے آوازیں دے رہی ہیں۔ مجھے بلا رہی ہیں۔ ماما مجھے ساتھ جانا ہے ماما کے۔“ وہ چل چل کر روئے جا رہی تھی۔ وہ بشری سے زیادہ عدیل کی پیاری تھی۔ ہمیشہ ایسے موقعوں پر جب ماں باپ میں ناراضی یا جھگڑا ہوتا تھا۔ مثال عدیل سے ہی سنبھلا کرتی تھی۔ عدیل ہی اسے سہلا یا کرتا تھا۔ مگر آج تو وہ عدیل کے ہاتھ لگاتے ہی چیخنے چلانے لگتی اور بھی زیادہ مچھلنے لگتی۔ وہ عدیل سے پھتر کھانے کے بعد کچھ دیر تو بالکل کم صدم سنانے میں چلی گئی تھی۔ مگر پھر گیٹ کے باہر سے مثال کے واوٹے اور چیخ دیکھانے بے قابو سا کر دیا تھا۔

”جب کرا جاؤ مثال! صبح لے جاؤں گا تمہاری ماں کے پاس۔ اب رات بہت ہو گئی ہے۔ سو جاؤ۔ تمہارا طبیعت خراب ہو جائے گی کیوں مسلسل رونے سے۔ سو جاؤ مثال! عدیل نے اسے ساتھ لگا کر سہلانے اور باہر کرنے کی کوشش کی۔ درحقیقت اسے مثال کو تھپڑ مارنے پر مت بچھتا داسا تھا۔ وہ اس کے بعد سے مسلسل

کے اس تھنر کی تلاتی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر مثال کی آنکھوں میں توجیے اس کے لیے شناسا کی ہی نہیں تھی۔ وہ عجیب بے رخ سے انداز میں ضد کیے جا رہی تھی۔ باپ کے ہاتھ لگانے پہ اور بھی شدت سے چیخنے اور نے لٹی۔ بہت دیر سے وہ برداشت کیے جا رہا تھا۔ یوں بڑھ تھک گیا تھا بہت زیادہ۔

یوں جیسے وہ صدیوں سے اس سیشن میں مبتلا ہو اور گھنٹہ بھر پہلے جو پہاڑ اس کی زندگی میں ٹوٹا تھا۔ ابھی تو اس کا وجود اس کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔ مثال کے رونے دھونے اور پریشان کرنے کے دوران وہ دو فنی طور پر اس واقعے کو براہ راست نہیں سوچ رہا تھا۔ لیکن کچھ تھا جو دل کے آ پار ہوا تھا اور اس کا زہریلا سا درد اب جیسے پورے وجود میں پھیل رہا تھا۔ وہ جیسے تھک رہا تھا۔ ٹوٹ رہا تھا اور اب صرف نیند کی دو گولیاں کھا کر ہوش و خروش سے بیگانہ ہو جانا چاہتا تھا۔ مگر یہ مشا۔

اس نے دانت بھینچ کر اپنی پیاری بیٹی کو دیکھا جو ان دونوں کی جان تھی۔ مگر اب جیسے وہ تقسیم سی ہو گئی تھی۔ اسے مثال جیسی اچھی بیٹی سے اس روٹ کی توقع نہیں تھی۔ ”مثال! میں تھک گیا ہوں بیٹا۔ بس کروا۔ سو جاؤ۔ صبح لے چلوں گا تمہیں تمہاری ماں کے پاس۔“ وہ قصداً ”بشری“ کا نام لینے سے اجتناب برت رہا تھا کہ یہ نام لکھوں میں اس کے لیے اچھی سا ہو گیا تھا۔ جو کچھ دیر پہلے تک اس کی رگ جاں سے بھی قریب تھا۔ ”یہ میں نے کیا کر ڈالا۔“ پہلی بار دل میں درد کی تیز لہری اٹھی۔

وہ یوں ہی بائیں طرف سے سینہ سہلانے لگا۔ مثال کے رونے میں ایک توقف کے بعد پھر سے شدت آئی تھی۔ ”ماما۔ ماما۔ ماما! مجھے لے جاؤ ساتھ۔ مجھے ماما کے پاس جانا ہے۔ ماما۔“ وہ آنکھیں بند کیے بار بار دہرائے جا رہی تھی۔ عدیل اسے بے بسی سے دیکھنے لگا۔ ”کیا تھا اگر بشری یوں ہٹ دھرمی نہ دکھاتی۔ اپنی ماں اور بھائی کو مٹالیتی۔ نہیں راضی کر سکتی تھی وہ۔ مگر میں جانتا ہوں۔ وہ دل سے نہیں چاہتی تھی کہ نوزیہ اس کی بھابھی بن کر اس کی ماں کے گھر میں جائے۔ جہاں جا کر وہ آزادی کے کچھ دن گزارتی تھی۔ اس کی وہ آزادی نہ چھین جاتی۔ اگر نوزیہ وہاں چلی جاتی۔ عدیل کو بشری پر نئے سرے سے غصہ آ گیا۔

”لیکن کیا مجھے نوزیہ کی خاطر یوں اپنا گھر مسمار کرنا چاہیے تھا؟ ہمیں ہی اگر تھوڑا خود کو بشری کی جگہ رکھ کر سوچ لیتا۔ اس کے ضمیر نے ملامت کی۔“ عدیل میں جانتا ہوں سارا قصور ساری غلطی بشری اور اس کی بھابھی کتنی ماں کی ہے۔ اس کا بھائی خبیث کن سا کم سے اب ان لوگوں کے ہوش اور عقل ٹھکانے آئے گی۔ جب بیٹی ماتھے طلاق کا لیل سجا کر پیش کے لیے ماں کے گھر جا کر بیٹھے گی۔ نوزیہ کا مذاق اڑاتی تھی نا اس کی ماں اور مجھے کیسا ہلکا کیسا بے وزن لیا انہوں سنسے۔ ناماد کی بات اس کا کما کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا ان لوگوں کے نزدیک۔ ایسے چکنے گھڑوں کو مزہ چکھانا تو ضروری تھا۔

اس نے سر جھٹک کر بے رحمی سے سوچا۔ مثال کا الیوم پھر بند ہو گیا تھا۔

اسے لگانی الحال تو وہ خود مزہ چکھ رہا ہے۔ اسے اب پھر سے سخت غصہ آنے لگا۔
دل چاہا جوتا اٹھا کر مثال کو ٹھیک ٹھاک لگا دے۔ سارا رونا دھونا بھول کر خاموشی سے سو جائے۔ کم از کم رات
بھر تو سوتی رہے۔

اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا اور یہ مثال۔
”یہ چپ نہیں ہوئی ابھی تک بھائی؟“ فوزیہ کمرے میں آکر حقارت بھری نظروں سے روتی مثال کو دیکھ کر بولی۔
”نہیں چپ ہو رہی کسی بھی طرح سے۔ ہر طرح سے بھلا کر دیکھ لیا ہے۔ ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے کہ ماں کے
پاس جانا ہے اور بس۔ سمجھا رہا ہوں۔ مگر“ وہ پوری طرح سے بھرچکا تھا۔ سخت کراہت بھرے لہجے میں بولا۔
”صرف تمہاری غلطی ہے یہ بھائی! تم نے کبھی ان ماں بھئی کو اس طرح سے رٹ نہیں کیا جس طرح یہ جن
دار تھیں۔ بس لاڈ اٹھائے گئے۔ فرمائشیں پوری کرتے رہے۔ کبھی اپنی کوئی بات ان سے نہیں منوائی تو نتیجہ تو یہی
اٹکنا تھا نا۔ انہوں نے کب ماننا سیکھا ہے تمہاری بات کو۔“

فوزیہ کو بھی یہ سب سنانے کا آج ہی موقع ملا تھا۔ سول کی بھڑاس خوب ہی نکالی۔

عدیل اسے بھی کچھ سخت سنانا چاہتا تھا۔ مگر پھر اس نے ہونٹ بیچ لیے۔
اب اور کون رہ گیا تھا جس کو وہ سنانیں چکا تھا۔ فوزیہ کو اس وقت چھیڑ کر بھڑوں کے ایک نئے چہرے میں ہاتھ
ڈالنے کے مترادف تھا۔

وہ صبر کا گھونٹ بمشکل بھر گیا۔

”مما۔۔۔ ممما۔۔۔ مجھے ماما کے پاس جانا ہے۔“ مثال کا رو رو کر گلا بیٹھ گیا تھا۔ مگر وہ نہ اپنی ضد سے ہٹی تھی نہ
رونا دھونا کسی طرح کم ہو رہا تھا۔

”تم سے کہا تھا نا بھائی! امی نے کہ اس کو ماں کے ساتھ چلنا کرو۔ یہ تمہارے لیے تو گلے کی ہڈی بن جائے گی۔
عقل میں موٹی ماں جیسی۔ کہاں کوئی بات سمجھے گی اور کسی ہی ضدی۔“ فوزیہ کا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا۔

”چھا پلیر! اب تم تو یہ سب بند کرو۔ کسی طرح اسے چپ کراؤ۔ ورنہ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ اس کی رائی
من سن کر ٹھک گیا ہوں میں۔“ عدیل پر لحاظ اٹھا کر پھٹ کر بولا۔

”او مثال! میرے پاس۔“ کوئی نیک گھڑی تھی جو فوزیہ کو بھائی کی تحسک کا خیال آگیا۔
مثال کو بانہوں میں لینے کو آگے بڑھی۔

مثال بدک کر اور بھی پیچھے ہو گئی۔ جیسے فوزیہ اسے مارنے پینے آئی ہو۔
”کیا ہو گیا ہے مثال! کیوں روئے جا رہی ہو؟ او میرے پاس۔۔۔ میں تمہیں کچھ کھانے کے لیے دیتی ہوں۔“

حتی الامکان کچھ میں پیار سمونے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ جو اس سے ہو نہیں پایا تھا۔
”مجھے کچھ نہیں کھانا۔ مجھے صرف ماما کے پاس جانا ہے ابھی۔ مجھے یہاں نہیں رہنا۔“ وہ دیوار کے ساتھ لگ کر
ضد سے بولی۔

کنپٹیوں کو دباتے عدیل نے بمشکل رگوں میں اچھے غصے کی لہر کو دیا۔
”چھا! چلو نہیں رہتا۔ چلی جانا اپنی ماما کے پاس۔ ابھی تو میرے پاس آؤ۔“ جناتی نظروں سے بھائی کو دیکھ کر

مثال سے ذرا نرمی سے بولی۔
”نہیں! مجھے ابھی جانا ہے۔ ابھی۔“ وہ ایزیاں رگڑ کر ضد سے بولی۔

”چلو! ٹھیک ہے۔ تمہاری ماما ابھی گیٹ کے باہر موجود ہیں۔ آؤ! میں لے جاتی ہوں تمہیں۔ تم ان کے ساتھ
چلی جاؤ۔“ فوزیہ اسے بھلائے کو ذرا لپاس ہو کر اس کے بھرے بال سمیٹ کر بولی۔

مثال بے یقینی سے پھوپھی کو دیکھنے لگی۔
”آؤ نا اجلدی سے۔ کہیں تمہاری ماما چلی نہ جائیں۔“ فوزیہ اسے کھینچ کر بولی۔
”ہاں۔۔۔ لے جاؤ خدا کے لیے اسے یہاں سے۔ میں کچھ دیر کے لیے سکون سے سانس تو لے لوں۔“ عدیل
کو فت سے بولا۔

مثال نے شکایتی نظروں سے باپ کو دیکھا۔
”مما جا چکی ہیں۔ میں جانتی ہوں۔ گیٹ کے باہر کوئی آواز نہیں آ رہی۔“ وہ مرتھائے ہوئے لہجے میں آہستہ
سے بولی۔ باپ کے کو فت بھرے لہجے نے اسے کچھ اور سہا دیا تھا۔

”اؤں ہوں۔۔۔ میں آ رہی ہوں نا ابھی باہر سے۔ وہ ابھی باہر ہی رہیں۔ تم میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں دکھاتی
ہوں۔ آجاؤ شاباش!“ فوزیہ نے اسے پیار کیا اور اس کے بال سنواری زبردستی اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ عدیل
ساکت سا بیٹھا رہا۔

اسے لگا ابھی کسی نے اس کے گال پر تھپڑ مارا ہے۔
اس نے لینے لینے بے اختیار اپنے بائیں گال پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس کے لیے بے اختیار مسکرانے لگے۔

”اسے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو شاید مجھے اچھا نہیں لگتا۔“ وہ اونچی آواز میں خود سے بولا۔
کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔

ملکی روٹی باہر گلی میں لگے پول لائٹس سے آ رہی تھی۔ وہ آہستگی سے اٹھ کر کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔
اندھیرے میں دروازے وہ منڈیر تو نظر نہیں آ رہی تھی۔ جہاں وہ آکر بیٹھا کرتی تھی۔ اس کا مخصوص ٹھکانا۔ مگر

اس کی نظریں وہیں تک جا کر رک گئی تھیں۔ جہاں وہ بیٹھا کرتی تھی۔
اس نے اظکیوں پر دن گننے شروع کر دیے۔

”۲“ بھی تو مزید بارہ دن باقی ہیں اس کے آنے میں۔ یہ بارہ دن کیسے گزریں گے۔ لیکن اس بار میں اسے کھوؤں گا
نہیں۔ اسے خود سے دروازے نہیں جانے دوں گا۔ اس سے اپنے دل کا احوال کہہ ڈالوں گا۔ اس آگ کی تپش اس تک
بھی پہنچنی چاہیے جس نے اتنے مہینوں سے مجھے جلا کر بھسم کر ڈالا ہے۔“

وہ دل میں بہت سے ارادے باندھنے لگا۔
”لیکن ایک کام تو میں اس کے آنے سے پہلے کر ہی سکتا ہوں کہ اس گھر اور اس گھر میں رہنے والے یکینوں کے
بارے میں ضروری معلومات لے سکوں۔ بلکہ ان بارہ دنوں میں کچھ ایسی راہ دور سم بنا سکوں کہ جب وہ آئے تو کسی
طرح میں بھی اس گھر کے اندر موجود ہوں۔ وہ مجھے سامنے دیکھ کر شاکڈ رہ جائے۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ میں اسے
بارہ دنوں۔“ وہ کچھ یاد کر کے مسکرایا۔

”دیاروہ میرے اتنے قریب آچکی ہے کہ ہم دونوں کی سانسیں ایک دوسرے کی سانسوں میں غم ہو چکی ہیں
۔ تو ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ مجھے فراموش کر چکی ہو اور جب وہ مجھے دیکھے گی تو۔۔۔ اف! وہ نظر دنیا کا خوب صورت
ترن منظر ہو گا۔ جب ہم دونوں آمنے سامنے ہوں گے اور میں اس سے سب کچھ کہہ دوں گا۔“ وہ آنکھیں بند
کر کے مسکراتا ہوا اس منظر کو سوچنے لگا۔

”میں نے فی الحال انہیں فینڈ کا انجکشن لگا دیا ہے۔ یہ صبح تک اچھی فینڈ لے لیں گی تو کچھ بہتر حالت میں ہوں
گیں۔“

گی۔ ڈاکٹر نے انجکشن لگانے کے بعد سیدھا ہو کر آہستہ سے پیچھے کھڑے عمران اور ذکیہ سے کہا۔
بشری کی آنکھیں نیم ہوا تھیں۔

وہ نیم بے ہوش تھی۔ اس کے کان ان کی آوازوں کو سن رہے تھے۔ مگر اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھی۔
اس وقت کسی بھی قسم کا مفہوم معنی سمجھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

بس کسی بھی طرح دنیا دنیا سے بیگانہ ہو جانا چاہتی تھی۔

اس کا ذہن جیسے کسی گول گول گھومنے والے جھولے میں جھولنے لگا۔

اس کی نظروں کے سامنے چٹکھاڑا، 'طلاق' 'طلاق' کے الفاظ بولنا عدیل تھا۔ ہاتھ نچانچا کر چیخی نسیم اور
نفرت بھری نظروں سے دیکھتی فوزیہ تھی اور وہ سما ہوا مثال کا معصوم چہرہ وہ اس کی طرف ہاتھ پھیلا کر اس کی
طرف لپک رہی تھی۔ اس کے ہونٹ "ماما ماما" کہتے نہ ہوا اور رہے تھے۔

"مثال۔ مثال۔ مثال۔ آ۔ آجاؤ۔ آؤ۔ مثال! میری مثال۔" وہ نیند کی غنودگی میں بڑبڑا رہی تھی ذکیہ
نے روتے ہوئے بیٹی کی بے بسی کو دیکھا۔

"ڈاکٹر صاحب! ایسے۔ عمران متھکر سا تھا۔"

"شدید گہرے ذہنی صدمے میں ہیں۔ انہیں ٹائم لگے گا سمجھنے اور اس صدمے سے نبرد آزما ہونے میں۔" وہ
گہرا سانس لے کر بولا۔

"مثال؟" ڈاکٹر نے استفہامیہ انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

"ان کی بیٹی۔" عمران دل گرفتگی سے بولا۔ اس درجے شقاوت اور سنگدلی کی ان کو عدیل اور اس کے گھر والوں
سے توقع نہیں تھی۔

وہ ذکیہ کے کہنے پر دوبار فون کر چکا تھا۔ بلکہ غصے میں بھر کر خود بھی جانا چاہتا تھا۔ مگر فی الحال بشری کی حالت اسے
روکے ہوئے تھی۔

اس کے خون میں ابال سے اٹھ رہے تھے کہ انہوں نے کس طرح بشری کو اس حال تک پہنچایا۔ اس کے ساتھ
وہاں کیا ہوا، وہ سب جانا چاہتا تھا۔

اور سب سے بڑھ کر مثال اس کے ساتھ کیوں نہیں آئی تھی۔

"نہیں عمران! ہمیں بشری کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا ہوگا۔" ذکیہ نے آنسو پونچھ کر اسے منع کیا۔
ڈاکٹر چلا گیا تھا اور بشری گہری نیند سو چکی تھی۔

"آئی! میں ان لوگوں کا حشر کروں گا۔ انہوں نے میری بہن کو لاوارث سمجھ رکھا ہے کیا؟ جانے کیا سلوک کیا
ہے آپ کی ساتھ کہ وہ اس طرح جو آپس آئیں۔" عمران طیش میں مٹھیاں بھیج کر بولا۔

"میری بچی بے پردہ... بغیر روپے کے خالی ہاتھ، خالی جھولی، خالی گود لے گھر کے دروازے پہ یوں لٹی پٹی کھڑی
تھی۔ سمجھو میرے دل پر تو جیسے کسی نے چھریاں چلا دیں۔ نسیم تیرا بھرا لیس غرق ہو۔ اللہ تجھے برباد کرے۔ جیسے تو
میری بیٹی کی زندگی میں کانٹے بوری ہے۔ اللہ تیری بیٹی کے آگے لے کر آئے۔" وہ دامن پھیلا کر کونٹے لگیں۔

"مگر اس بد بخت پر کیا اثر ہوگا۔ اللہ تو اس کی بیٹی کو پہلے ہی برباد کر چکا ہے۔ اور کیا برباد کرے گا۔ ہائے میری
بشری! لا عمران! فون دے۔ میں اس عدیل سے تو خود بات کروں۔ مہسننا۔ کیسے اس نے میری بچی کو اجاڑا ہوا
کر گھر سے روانہ کر دیا۔ میرے دل میں ابال اٹھ رہے ہیں۔" وہ دہائی دے کر بولیں۔

"آئی! رات کا ایک سو گراہا ہے۔ اب رہتے ہو۔ جو ہوگا، سجدہ دیکھ لیں گے۔" عمران کسی گہری سوچ میں گم تھا۔
گہری پر نظر ڈال کر بولا۔

"میں تو انہیں نیندیں ہمارا سکون غارت کرنے والے مزے سے سوئیں اور ہم کانٹوں پر لوٹیں۔ یہ کہاں کا
انصاف ہے۔ میں تو ان کی زندگی حرام کروں گی۔ نہ جنیں گے۔ نہ میں گے۔ سارے میں دہائی ڈالوں گی۔ نمبر ملا تو
بس۔" وہ آہستہ سے باہر ہو کر بولیں۔

عمران نے کچھ سوچا اور پھر عدیل کا نمبر ملا کر سیل ان کے کان سے لگا دیا۔
دوسری طرف سیل آف تھا۔

"کبعت نے فون بند کر رکھا ہے۔ ملا اس نسیم کا نمبر۔ انہیں تو میں قبر سے کھینچ کر لے آؤں گی۔" وہ غصے میں
آکر زور سے بولیں۔

"مثال۔ ڈی۔ عدیل! بشری نیند میں بڑبڑاتے ہوئے سسکی سی لے کر کسمپاسی۔
دونوں اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"آئی! آپ سو رہی ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ جتنا زیادہ سکون سے سوئیں گی۔ اتنا ہی آئی کے لیے اچھا ہے۔ سورنہ
خدا نخواستہ نروس بریک ڈاؤن ہونے کا خطرہ ہے یا برین ہیمنج کا۔ آپ پلیز! انہیں آرام کرنے دیں۔ باہر
آئیں۔" وہ آہستہ آواز میں ماں کو سمجھا کر بولا۔

بیٹی کی حالت دیکھ کر ذکیہ کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔ وہ اٹھنے کے لیے تار نہیں تھیں۔
"صم جاؤ۔ میں بیٹیں ٹھیک ہوں۔ کچھ نہیں بولتی اب۔ اسے آرام کرنے دوں گی۔" وہ وہیں صوفے پر نیم پوراز
ہو گئیں۔

"آئی! اس طرح تو آپ کی طبیعت بھی خراب ہو جائے گی۔ آپ نے دوائے رکھی ہے۔ اگر سوئیں گی نہیں تو
بہت مسئلہ ہو جائے گا۔ آپ جانتی ہیں۔" عمران نے ماں کو سمجھایا۔

"میری قسمت خراب۔ نہ میں جلد بازی کرتی۔ اسے مٹھائی کی ٹوکری دے کر بھیجتی۔ میں اسی کھٹے عدیل کو گھر
بلا کر اس سے خود بات کرتی۔ خدا جانے کیا ہوا ہے۔ میرے دل کو تو جیسے پتکھے لگے جا رہے ہیں۔ نیند مجھے کہاں
آئے گی۔"

وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بمشکل عمران کا سارا لے کر اٹھ گئیں۔ دونوں باہر نکل گئے۔
"کیا۔ کیا۔" عمران کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ اس کے ہاتھ سے سیل فون گر گیا۔

ذکیہ نے بے اختیار سینہ تھام لیا۔ عمران کی حالت سے ان کا اپنا دل بیٹھنے لگا تھا۔
"گنگ۔ کیا ہوا عمران۔ کیا کہا ان لوگوں نے اور یہ عدیل نے اپنا فون کیوں بند کر رکھا ہے؟ منہ کیوں کالا ہو گیا
اس کا؟ چوروں کی طرح چھپ رہا ہے ہم سے۔ کیا بک رہی تھی یہ منحوس نسیم۔ کیا کتنی ہے تم سے فون پر۔" وہ
پھولے سانس کے ساتھ کہتی چلی گئیں۔

عمران نے جھک کر گرا ہوا سیل فون اٹھایا اور اسے مٹھی میں بھیج لیا۔
بول نا۔ گونگا ہے کیا۔ کیا بکواس کر رہی تھی وہ ڈائن۔ مجھ سے اب برواشت نہیں ہو رہا۔ بول! جو بھی کہا
سنا اس نے دہرنہ میں ابھی اس کی طرف جا رہی ہوں۔" وہ بے صبرے پن سے بولتی چلی گئیں۔

"سب کچھ ختم ہو گیا ہے امی! آپ کی حالت غلط نہیں تھی۔ اور آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ہم نے واقعی جلد
بازی کی۔" عمران صوفے پر گر کر رنجیدگی سے بولا۔

"عمران! بول رہے ہو کیا ہے۔ دہرنہ مجھے کچھ ہو جائے گا۔" ذکیہ چیخیں۔
"عدیل نے بشری آپ کی کو طلاق دے دی ہے امی۔" عمران بمشکل بولا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شاندار پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کے پیش کیے ہیں

مجموعہ عمل کیوں نہیں؟

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ایب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹرنڈوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ایچ
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ عمر ان سیریز از مظہر کلیم ابر
- ✧ ابن حنفی کی مکمل ریخ
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحدہ ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے ہی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جاننے کی ضرورت نہیں ہر ویب سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

عذیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشری ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشری کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی بیٹی ہے۔ بشری اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصنفین نے اپنا بہو سے لگاوت دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشری کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑا ہے۔ سائچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشری کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشری دہا نظیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عذیل سے شادی سے قبل نظیر کا بشری کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشری اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عذیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کرتا ہے۔ بشری اور عذیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشری کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹ اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ذبیحہ کو زمین زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شرا ہے ہیں۔ عاصمہ کو فون کے ذریعے کوئی اطلاع ملتی ہے جسے سن کر وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔

نون پر پتا چلتا ہے کہ شر آتے ہوئے عفان اور فاروق صاحب ذکیہ کی وادعات میں قتل ہو گئے۔ عفان کے قریبی دوست زہیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹ سے سات لاکھ روپے



عدیل ہے، بس سے مثال کا اتھا سہلانے لگا۔

”اسے دوبارہ لے کر جاؤں ڈاکٹر کے پاس۔ بخار تو کسی طرح کم ہی نہیں ہو رہا اس کا۔“ وہ گس کو بھی مخاطب کیے بغیر بولا۔

”حالانکہ میں نے تو باقاعدگی سے دوا دی ہے مثال کو کم از کم بخار تو اترا چاہیے اس کا۔“ فوزیہ نرم لہجے میں بولی۔
 ”ارے کم بخت لیرے ہیں یہ آج کل کے ڈاکٹر سارے۔ اب اگر پھر سے لے کر جاؤ تو نئے سرے سے فیس لیں گے۔ انہیں کوئی خوف خدا تھوڑی آئے نا اور جی میں آیا تو چھ چار ٹیٹ بھی لکھ ڈالیں گے اپنی کوتاہی تھوڑی مانیں گے کہ ان کی لکھی دوائے خاک اثر نہیں کیا۔“ نسیم کو فٹ بھرے انداز میں بولتی چلی گئیں۔
 یوں بھی خس کم جہاں پاک تو ہو چکا تھا مگر رات سے جو اس ہاشت بھر کی لڑکی نے مفت کی پریڈ کر رکھی تھی۔ اس سے جی خوب ہی بے زار تھا۔

زرا جو اس شان دار فتح کی خوشی منائی جا سکی ہوئی الحال جان پنڈرانے کا اور کوئی رستہ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔
 ”کیا ہوا ای! فوزیہ تشویش سے بولی۔

عدیل نے بھی چونک کر ماں کو دکھا، روزیہ، مست دیر سے ایک ٹک صرف اپنی لاڈلی کو ہی دیکھے جا رہا تھا جو رات بھر میں بچو کر آدمی بنی نہیں ہو گئی تھی۔ کالوں کی گلابیاں پیلا ہسٹا میں بدل گئی تھیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہی ابھر آئی تھی۔ سوکھے خشک ہونٹ، بھرے بے رونق ہال اور یوں بے ہوش۔
 عدیل کا دل کٹا جا رہا تھا۔

”امی! ٹھیک ہیں نا آپ؟“ چہرے پر تکلیف کے آثار لیے ہوئے ہونے بائیں طرف سے ایک سینہ اور بازو دبا رہی تھیں۔

”امی۔ کیا بات ہے؟“ عدیل کو بھی پوچھتا پڑا۔

”ٹھیک ہوں میں۔“ نسیم جیسے گراہ کر دکھی آواز میں بولیں۔

”آپ رات بھر سو بھی نہیں سکیں۔ بے آرائی کی وجہ سے آپ کی طبیعت نہ بگڑ جائے۔ آپ جا کر آرام کر لیں۔“ فوزیہ تشویش سے بولی۔

”نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ بس اللہ میری مثال کو جلدی سے اچھا کر دے پہلے کی طرح ہنستا کھلے گا۔ کیسے تپتی کی طرح میری بچی اس آنگن میں اڑی پھرتی تھی۔ رات بھر میں مرتھایا پھول بن کر رہ گئی۔“ نسیم سسکی سی لے کر رندھی آواز میں بولیں۔

”فوزیہ! امی نے دوا لی ہے آج؟“ عدیل ماں کو دیکھ کر فکر سے بولا۔

”جی بھائی! فوزیہ ایک دم سے ہی بہت سعادت مند فکر کرنے والی خیال رکھنے والی بہن اور بیٹی بن گئی تھی بشری کے جاتے ہی۔

”امی! آپ جا کر آرام کریں۔“ عدیل نرمی سے بولا۔

”ماما! مثال پھر کراہی۔

”میری بچی۔ میری گڑیا! نسیم تڑپ کر بولیں۔

”جا عدیل! اسے ڈاکٹر کے پاس لے جا۔ آنکھیں کھولے۔“ وہ زمانے بھر کی محبت تڑپ لہجے میں سمو کر بولیں۔

”مثال۔ میری بچی دادی کی جان! آنکھیں کھول کر ایک بار تو دیکھ ہم تینوں رات بھر سے تیرے لیے کتنے

وصول کرا پاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقبولین کو دکھاتا ہے۔ زاہدہ نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ سو سو پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشری سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔ حمیدہ خالہ عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زبیر کا ایسے اس کے گھر اتنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں۔ جبکہ عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس کو خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زبیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آجاتا ہے کہ وہ انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے۔ سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔ رقم مہیا نہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر ہوا اور اس کے گھر والوں کو مورد الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشری کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل پیش میں بشری کو دھکارتا ہے۔ اس کا اپارشن ہو جانا ہے۔ عدیل شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔

اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دکھاتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے تنگ آ کر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی باہم پریشان ہو کر پاکستان آجاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے باہم کو پتا چلتا ہے کہ زبیر نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بند کر دیے ہیں اور اب مفور ہے۔ بہت کوششوں کے بعد باہم عاصمہ کو ایک مکان دلا پاتا ہے۔ بشری اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کر رہی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل سخت پریشان ہے۔

دسویں قسط

فوزیہ نے فکر مند نظروں سے گھرا میٹر کو دکھا اور دوسری نظر نسیم بے ہوش سرخ چہرے لیے مثال پر ڈالی۔

”کیا ہے؟“ نسیم بیگم لہو مادہ سے انداز میں بولیں۔

”دکھاؤ مجھے۔“ عدیل بڑھی ہوئی شیوے کے ساتھ گم صم سا بیٹھا تھا۔ فوزیہ کو گھرا میٹر ہاتھ میں لیے دیکھ کر چونکا۔

”ایک سو تین سے پھر بچ کر کم ہی نہیں ہو رہا۔“ فوزیہ دکھی لہجے میں بولی۔

”میرے اللہ! رحم کر معصوم بچی پر۔“ نسیم وہائی دینے والے انداز میں بولیں۔

”کہا تھا میں نے، ابھی اسی ماں سے دور نہ کرنا بہت ملی ہوئی ہے بشری سے۔ اتنی آسانی سے نہیں سنبھلے گی مگر

مجھ خبطن کی سنتا کون ہے اس گھر میں۔“ نسیم جلے کٹے انداز میں کہہ رہی تھیں۔

عدیل نے عجیب سی نظروں سے ماں کو دکھا۔

”تھی بھی آپ کو یہ گلہ ہے؟“ اس کا لہجہ استہزائی تھا جسے خودیہ زور سے ہنسا ہو۔

نسیم اور فوزیہ نے بے ساختہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ فوزیہ نے نظریں چرائیں۔ نسیم کو غصہ تو بہت آیا

اور سخت ست سنانے کو جی بھی چاہا مگر فوزیہ نے ماں کا ارادہ بھانپتے ہوئے آنکھوں کے اشارے سے منع کر دیا۔

بھلی گھڑی تھی جو نسیم کو بھی یہ سنبھیہ سمجھ میں آئی جو اب میں وہ آہ سی بھر کر چکی رہیں۔

”ماما۔۔۔ ماما! مجھے ماما پاس۔ ماما! مثال نیند میں رک رک کر کراہتے ہوئے بول رہی تھی۔

نسیم نے فتح مند نظروں سے عدیل کو دکھا۔

”دیکھا میں نہیں کہتی تھی یہ جی۔ یہاں تکنے والی نہیں۔“

پریشان ہیں۔ تیری اس سنگدل ہالی کی طرح نہیں، جو تجھے چھوڑ چھاڑ کر گئی تو پلٹ کر خیر بھی نہیں لی اس نے۔ گویا اسی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔" وہ مثال پہ جھگی اُسے پیار کرتے ہوئے کہے جا رہی تھیں۔ عدیل نے کچھ ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔

"ای! آپ کچھ دیر جا کر سو جائیں۔" فوزیہ نے فوراً عدیل کے چہرے کے بگڑتے زاویے دیکھ کر کہا۔
 "میں کہاں سو سکوں گی، میری شہزادی اس حال میں پڑی ہے۔" نسیم آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولیں۔
 عدیل گھڑی دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"فوزیہ! میں گاڑی نکالتا ہوں۔ تم مثال کو لے کر آ جاؤ۔ ڈاکٹر پانچ بجے تک کلینک آ جائے گا تو ایک بار پھر جیڈ اپ کروا لیتے ہیں، بلکہ شاید وہ اسے ایڈمٹ کر لے۔" کہہ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔
 فوزیہ اور نسیم کو فٹ سے اسے جا تار کھتی رہ گئیں۔



"لیکن میڈم میں نے تو چھٹی کی درخواست بھیجی تھی۔" عاصمہ کے چہرے پر پریشانی اور گھبراہٹ تھی۔
 میڈم کے چہرے کے تاثرات اسے بہت کچھ سمجھا رہے تھے۔

"گتھی بار۔ درخواست تھی یہ آپ کی پورے مہینے میں۔" میڈم نے کرسی ذرا سی گھماتے ہوئے عاصمہ کے چہرے پر نظریں جمنا کر طنز سے کہا۔

عاصمہ نظریں جھکا کر اپنی سرد پتی انگلیوں کو آپس میں جکڑ کر خود کو سنبھالنے کی سعی کرنے لگی۔
 "میری مجبوری تھی میڈم کسے۔" اب کوئی تو بات کرنی تھی اسے بات کو آگے بڑھانے کے لیے۔

"اور میری مجبوری یہ ہے مس عاصمہ! کہ مجھے اس اسکول کو چلانا ہے۔ آپ صرف مجھے جواب دہ ہیں اور میں اس اسکول میں موجود ڈھائی سو بچوں کے والدین کے سامنے جواب دہ ہوں جن کو پختے میں تین دن اپنے بچوں سے یہ سننے کو ملتا ہے کہ ان کی بچہ آج ایب سینٹ تھیں۔" وہ سارا لحاظ موت اخلاق بالائے طاق رکھ کر زور سے بولیں۔

"میڈم! میری بیٹی بیمار تھی تو مجھے بہت مجبوری تھی۔" عاصمہ کی آواز کو شش کے باوجود رندھ گئی۔
 "تو ایک کام کرتے ہیں مس عاصمہ! جس سے آپ کی اور میری مجبوری آرام سے ختم ہو سکتی ہے۔" وہ آگے ہو کر سرد لہجے میں بولیں۔

عاصمہ کو میڈم کی سردی مسکراہٹ جواب میں مسکرانے پر مجبور نہیں کر سکی۔
 "میڈم! میں کوشش کروں گی آئندہ چھٹی نہ ہو۔" عاصمہ نے جلدی سے کہا۔ مبادا کوئی خوفناک بات نہ اسے سننی پڑ جائے۔

"میں جانتی ہوں آپ یہ سب کچھ اپنے شوق سے نہیں کرتیں لیکن میں بھی مجبور ہوں۔ میں اسکول شوقیہ کھول کر نہیں بیٹھی ہوں۔ میں اگر بچوں کے والدین سے نہیں لیتی ہوں تو مجھے انہیں مطمئن بھی کرنا ہوتا ہے۔ گزشتہ چھ ماہ میں آپ نے ہر ہفتہ ایک سے دو چھٹیاں کیں۔ چٹیں، میں وہ بھی برداشت کر گئی لیکن ہر ہفتے تین چھٹیاں۔"

"میڈم! میں۔۔۔"

"سوری مس عاصمہ۔۔۔ آپ جا کر کیشور سے اپنا حساب کر لیں۔ فی الحال ہمیں آپ کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ بے لگب لہجے میں بولیں۔

عاصمہ بڑھتی ہوئی بھر میں پھری ہوئی۔

"میڈم۔۔۔ اس بار۔۔۔ صرف اس بار آپ معاف کر دیں۔۔۔ پراس۔" وہ سخت پریشانی میں بے ربط ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں نمی ہلکورے لے رہی تھی۔
 ہم نے کل ہی آپ کی جگہ کسی اور بچہ کو اپائنٹ کر لیا ہے۔" میڈم نے اس کے سامنے ایک اور دھماکا کر دیا۔
 وہ ساکت سی دیکھتی رہ گئی۔

"اور آپ جانتی ہیں۔ میں کوئی صاحب ثروت تو ہوں نہیں کہ ایک آپ کی چھٹیوں کے لیے ایکسٹرا ٹیچر رکھ لوں۔ میرے بھی دس ہزار اخراجات ہیں پھر اس اسکول کی سہولتیں بہت سی میری بھی مجبوریاں ہیں جنہیں یہاں دہرائیہ کار ہے۔ نہ میرے پاس اتنا وقت ہے نہ آپ کو اس میں دلچسپی ہوگی۔ سو آئی ایم سوری۔" وہ کندھے اچکا کر دو ٹوک لہجے میں بولیں۔

میڈم! آپ جانتی ہیں میرے بچوں کا آسرا یہی جاہ ہے۔"

"اگر آپ اس بات کو سمجھتیں تو اس قدر غیر ذمہ داری کا ثبوت نہیں دیتیں۔ میں نے بھی یہی کچھ سوچ کر آپ کو جاہ دی تھی۔" وہ حنا کر طنز سے بولیں۔

میڈم! میری بچی کو ڈیل نمونیہ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے۔"

"آپ پلیز اب جا سکتی ہیں۔ مجھے کچھ اہم کام پھانے ہیں۔ آپ کیشور سے اپنا حساب لے کر جائیں۔" وہ اپنے آگے بڑی نفاٹل کھولتے ہوئے روکھے لہجے میں بولیں۔

"میڈم! پلیز ایسا نہیں کریں۔ میں کیا کروں گی۔" وہ آخر میں گڑ گڑا ہی بیٹھی۔

کل ہی تو اوپر سے کرائے دار بھی طے گئے تھے۔ اس ماہ کرایہ ملنے کی بھی امید نہیں تھی۔ اگر نوکری بھی چلی جاتی۔ جو کہ جاہی چکی تھی تو وہ پورا مہینہ گیا کرے گی وہ بے اختیار رونے لگی۔ بے بسی سی بے بسی تھی۔
 اسے خود پر ترس آنے لگا۔ ایسا تو اس نے کچھ نہیں سوچا تھا۔ چند ہزار کی معمولی اسکول ٹیچر کی نوکری کے لیے اسے یوں فتنیں کرنا ہوں گی۔

"میں آپ کا نام نیکسٹ کمنگ ٹیچرز میں رکھ رہی ہوں جیسے ہی ہمیں آپ کی ضرورت ہوگی۔ ان شاء اللہ میں سب سے پہلے آپ کو کال کروں گی۔ آپ بلاشبہ ایک محنتی ٹیچر ہیں اور بچے بھی آپ سے جلد مانوس ہو جاتے ہیں۔ میں ضرور آپ کو کال کروں گی۔ اب آپ جا سکتی ہیں۔"

انہوں نے بہت طویل قہقہے سے بات ختم کر دی۔ وہ دیکھتی رہ گئی۔

"وش یو بیسٹ آف لک۔" میڈم نے الوداعی مصافحے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ عاصمہ نے اپنا ٹھنڈا پنج ہاتھ ان کے ہاتھ میں ذرا سا دیا۔

"اللہ حافظ! وہ کہہ کر فون پر کوئی نمبر ملا کر بات کرنے میں مصروف ہو گئیں۔

عاصمہ چند لمحے بے بس سی بیٹھی اپنے ہونٹ چباتی رہی پھر آہستگی سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔
 دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے آس بھری نظروں سے مرکوز دیکھا اور میڈم کا منہ دوسری طرف دیکھ کر اپنا چہرہ صاف کرتی باہر نکل گئی۔



"ای! میں نے قسم کھائی ہے جب تک میری مثال مجھے نہیں مل جاتی۔ میں ایک لقمہ نہیں کھاؤں گی۔ اس دنیا کی ہر نعمت مجھ پر حرام ہے۔"

بشری نے کھانے کی ٹرے اتنی زور سے پرے کی کہ سالن ٹرے میں گر گیا اور ذکیہ تو کچھ بول ہی نہ سکی۔
 ”تین دن ہو گئے ہیں میری بچی! تجھے آج کچھ کھائے پیے۔ ہر دو گھنٹے بعد توبے ہوش ہو جاتی ہے ڈاکٹر ابھی کر
 کر گیا ہے۔ اگر تو نے کچھ کھایا نہیں تو۔۔۔“
 ”موت کی پھر بھی نہیں ای ایس بہت سخت جان ہوں۔ بہت ڈھیٹ مجھے موت نہیں آنے والی۔ مجھ جیسی ماہر
 کو موت آیا بھی نہیں کرتی۔ میری غلطی جو میں اس رات اپنی بچی ان وحشیوں کے پاس چھوڑ کر چلی آئی۔ میں
 میری بچی میری گڑیا۔ ہائے تین دن سے تین راتوں سے میں نے اسے نہیں دیکھا اسے نہیں چھوا اس کو نہیں
 چوسا۔ مثال میری گڑیا مثال۔ مثال۔ مثال۔“ وہ پاگلوں کی طرح منہ اونچا کیے آنکھیں بند کیے گلا پھاڑے چیخنے
 لگی۔

اسے بے اختیار وہ ظالم شام یاد آئی جب طلاق کے بعد مثال اس کے ساتھ جانے کے لیے تڑپ تڑپ کر پلٹ
 کر چینی ہوئی روئے جا رہی تھی۔
 ”مجھے ماما کے پاس جانا ہے۔ مجھے ماما کے ساتھ جانا۔ ماما۔ ماما۔“ بشری کی سماعتیں اس کی معصوم
 فریادوں سے بٹنے لگیں۔ سب کچھ جیسے اس کی نظروں کے سامنے کسی فلم کی طرح جلنے لگا۔ عدیل کا وحشی روپ
 اور طلاق کے الفاظ۔ سیم اور فوزیہ کی ناقصانہ نظریں اور پیروں میں بکھری رنگ برنگی مٹھائی۔
 اسے کسی بھی چیز نے اتنی اذیت اتنا دکھ نہیں دیا۔ رات کے اس پھر چینی تکلیف اسے مثال کی حالت یاد کر
 کے ہوئی۔

”مثال۔ مثال کہاں ہے؟“ اس نے مٹھی میں دونوں چیزیں جکڑ کر یاد کرنے کی کوشش کی۔
 ”وہ تو۔ وہیں رہ گئی تھی۔“ اس ظالم انسان نے اسے باہر دھکا دے کر مثال کو اپنے پاس اندر کھینچ لیا تھا اور وہ
 روئے جا رہی تھی۔ اسے پکار رہی تھی اور اب اتنے دنوں سے وہ کیسی ہو گی۔ وہ بھی ٹھیک نہیں ہو گی۔
 ”مثال۔ مثال!“ اور خود سے باتیں کرتے ہوئے پتا نہیں وہ کب چیخنے لگی۔
 ذکیہ جن کی ذہانت آنکھ لگی تھی۔ بشری کی وحشت، بھری چیخ سن کر دیوانہ وار ہاتھ روم میں آئیں۔ جہاں بشری
 چیخے چیخے بے ہوش ہو چکی تھی۔ اور اب وہ زخمی حالت میں پہلی رحمت۔ کمزور چہرے اور لاغر جسم کے ساتھ ذکیہ
 کی گود میں پڑی تھی۔

اس کے سر پر دھپا کس کر باندھ دیا تھا مگر خون پھر بھی بے جا رہا تھا۔ ذکیہ کے کپڑے بھی خون رنگ ہو چکے تھے۔
 وہ خود بھی بری طرح روئے جا رہی تھی اور ان کے آنسو بے ہوش بشری کے چہرے پر گر رہے تھے۔
 ”جلدی کر عمران! خون بے جا رہا ہے۔ اسے کچھ ہونہ جائے۔“ وہ پھٹی ہوئی آواز میں بولیں۔
 عمران متفکر سا بے ہوش بشری کو بیک و فور میں دیکھ کر اور بھی تیزی سے گاڑی چلانے لگا۔



”یہ ضروری ہے عدیل صاحب!“ ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔
 ”مگر ڈاکٹر صاحب! یہ ممکن نہیں ہے میرے لیے۔“ وہ بہت دیر بعد آہستگی سے بولا۔
 مثال چند ہی دنوں میں بہت بیمار اور قابل رحم نظر آنے والی بچی میں ڈھل گئی تھی۔ اس کی گلابی رنگت میں
 بیلاہٹ اتر چکی تھی اور خشک ہونٹ یوں ایک دوسرے میں پیوست تھے جیسے اس نے کبھی کسی سے بات نہیں
 کی۔ اس کی آنٹھ سالہ معصوم شکل پر کیسی بوزھوں جیسی سنجیدگی اور دکھ نظر آنے لگا تھا۔
 ”کیوں؟“ ڈاکٹر کے اس استفسار پر عدیل کو غصہ تو بہت آیا کہ یہ حق کسی ڈاکٹر کو نہیں ہے کہ وہ یوں آپ کی
 پرسنل لائف کے بارے میں سوال کرے۔

”میں مجبور ہوں عدیل صاحب! سوال آپ کی بچی کی زندگی کا ہے۔ خدا خواستہ اس کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی تو
 یہ بخار اس کے دماغ کو متاثر کر سکتا ہے جس کے بعد کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ آپ پڑھے لکھے سمجھ دار ہیں اس بات
 کو سمجھ سکتے ہیں۔“
 ڈاکٹر نے عدیل کی ناگوار نظروں پر فوری وضاحت دے ڈالی۔
 عدیل کم صدم سا ہو گیا۔

مثال کا بخار صرف ایک دو درجہ کم ہو رہا تھا، بہت ٹھنڈے ٹھنڈے کے بعد مگر چھ آٹھ گھنٹوں کے بعد وہ پھر اسی درجے پر
 آجاتا۔
 مستقل سلگتا اس کا نصاب دن جس تکلیف اور درد سے بے حال تھا، عدیل جیسے پار کرنے والے باپ کے لیے یہ

ذکیہ اسے سنبھالتے خود بھی بکھرنے لگیں۔
 ”مثال۔ مثال کہاں ہے مجھے کیوں نظر نہیں آتی۔ میری گڑیا۔ میری بچی۔“ وہ ارد گرد سے بیگانہ ہر احساس
 سے ماورا صرف مثال کے لیے چیخ رہی تھی زور ہی تھی۔
 ذکیہ اسے سنبھالنے میں عذہال ہو چکی تھیں۔ جب عمران کمرے میں بھاگتا ہوا آیا۔
 ”آئی۔ آئی خدا کے لیے ہوش کریں۔ کچھ نہیں ہوتا مثال کو۔۔۔ میں لے کر آؤں گا اسے۔ آپ ہوش کریں۔
 خود کو سنبھالیں۔“ وہ اسے بازوؤں سے پکڑ کر روکنے لگا۔
 وہ بغیر دہشے جوتوں کے پھر سے گھر سے باہر بھاگ رہی تھی چیخے ہوئے بالکل کوئی پاگل دیوانی لگ رہی تھی۔
 ”مجھے صرف میری بچی لاؤ۔ مجھ سے سب کچھ لے لو۔ میری مثال میری گڑیا مجھے لاؤ۔ میں مرجاؤں گی اس کے
 بغیر۔ میں خود کو ختم کر لوں گی۔“ وہ ایک دم سے لاؤنچ کے ستون سے پاگلوں کی طرح سر ٹکرانے لگی تھی۔
 عمران مرد ہو کر اس کی وحشت کو قابو نہیں کیا رہا تھا۔ خون بھل بھل اس کے ماتھے اور سر سے بہنے لگا۔ ذکیہ کی
 چیخیں نکل گئیں۔

عمران جب تک بشری کو سنبھالتا وہ چیختی ہوئی بے ہوش ہو چکی تھی اور اب فرش پر بے دم پڑی تھی۔ باڈی
 چکنی ٹانگوں پر اس کا سرخ خون پتلی سی لیکر پاتا ہوا جا رہا تھا۔ ذکیہ خاتون کا جیسے دل ہی بیٹھنے لگا۔
 ”میری بچی! میری بشری! مرجائے گی عمران! اسے لے چلے کہیں۔“
 بلا ڈاکٹر جلدی کر مرجائے گی۔ اسے کچھ ہو جائے گا۔“ ذکیہ نے خود ہاتھ پاؤں جھوڑ لیے تھے۔
 عمران نے بہت دقت بشری کو بازوؤں میں بھر دیا اور باہر جانے لگا۔
 ”ای! میں آپ کی گاڑی میں ڈال رہا ہوں۔ آپ پلیر جلدی سے لاک لگا کر آجائیں باہر۔“ وہ جاتے ہوئے پکارا۔

بشری کی ایسی حالت تو ان تین دنوں میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ پہلے دو دن تو جیسے سکتے میں رہی تھی۔
 ذکیہ اسے رلانے اور سہلانے کی کوشش کرتی رہیں۔ تیسرے دن اسے بار بار طلاق کا یاد دلا کر رلانے کے جتن
 کرتی رہیں۔ مگر بشری رات کے آخری پہر کہیں واش روم گئی اور وہاں اس نے مثال کا خوب صورت سا ہیرینڈ اور
 پونی دیکھی جو اس نے اس عید پر بہت ضد کر کے لیے تھے۔ بشری اس کی ساری شاپنگ پہلے ہی کر چکی تھی اس لیے
 یہ دونوں چیزیں لے کر دینے کے حق میں نہیں تھی مگر عدیل نے یہ دونوں چیزیں بہت آرام سے خریدیں اور آخری
 بار وہ یہ دونوں چیزیں نانی کے گھر بھول گئی کہ اسے ان سے اتنا لگاؤ نہیں رہا تھا۔
 اس گلابی رنگ کے ہیرینڈ اور پونی کو ہاتھ میں لیے بشری ساکت سی انہیں دیکھتے ہوئے بہت کچھ یاد کرتی رہی۔
 مثال یہ سن کر کیسی لگتی تھی۔ جیتی جاگتی ہستی کھیتی کودتی بیاری سی بارلی ڈول۔

بہت بڑی اذیت سی۔

”میں اپنی مسز کو ڈانکی بوس دے چکا ہوں۔“ وہ بہت ڈوبی ہوئی آواز میں بمشکل بول سکا۔

”تو بھی۔“ ڈاکٹر بالکل نارمل رہا جیسے اسے معلوم تھا کہ عدیل اسے یہی وجہ بتائے گا۔

”تو بھی عدیل صاحب! اس بچی کا کچھ دنوں بلکہ کچھ مہینوں تک اپنی ماں کے پاس رہنا ضروری ہے۔“ عدیل نے کہہ

بول ہی نہیں سکا۔

”جب تک یہ ذہنی بلوغت آئی میں اسے اپنے لیے ہی طور پر آپ دونوں کی اس علیحدگی کو تسلیم نہ کرے۔“

”میں اپنی بچی کو خود سے ایک بل کے لیے بھی انگ نہیں کر سکتا ڈاکٹر صاحب! وہ بہت مگرحتی لہجے میں بولا۔

”یہ بات تو آپ کو یہ انتہائی فیصلہ کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھی۔“ ڈاکٹر جتا کر بولا۔ ”آپ اس بچی کی

حالت دیکھ رہے ہیں۔ وہ آپ سے زیادہ حساس اور آپ سے زیادہ کمزور ہے۔ وہ کتنی تکلیف سہہ ہی ہے آپ

اندازہ نہیں کر سکتے۔ آپ اگر اس بچی کے بغیر نہیں رہ سکتے تو یہ اپنی ماں کے بغیر نہیں رہ سکتی اور بلکہ میرا تو خیال

ہے اسے آپ کی جدائی بھی بہت اذیت دے گی باہل میں طلاق کے بعد آپ دونوں کی زندگی میں تو شاید اتنا فرق

نہ آسکے مگر اس کے سنبھل دوانے کے لیے آپ نے ایک مستقل جنم کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اتنے لاڈ پیار کے

بعد آپ نے ایک ہی جھٹکے میں اس کے سنبھلنے کی عمارت کو زلزلے کے جھٹکوں کی زد میں رکھ دیا ہے۔“

ڈاکٹر ضرورت سے زیادہ بول رہا تھا عدیل کو یہی اس کی اتنی زیادہ تنقید برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

”آپ اسے کب تک آپ کے پاس لے کر آنا ہوگا۔“ وہ بمشکل منہ دبا کر بات ختم کرنے کو بولا۔

”میرے پاس اسے لانے کا کچھ خاص فائدہ نہیں ہوگا آپ کو۔“ ڈاکٹر آگے بڑھی فائل عدیل کی طرف کھسکا کر

لا تعلق سے انداز میں بولا۔

”کیا مطلب؟“ عدیل ناگواری سے بولا۔

یہ اس شہر کا سب سے بہترین اور منگنا ترین چائلڈ اسپیشلسٹ تھا جب ہی عدیل اس کی اتنی تلخ باتیں سہہ گیا تھا۔

اس ڈاکٹر کے ہاتھ میں بہت شفا تھی اور عدیل کو وہی ہنستی کھینتی مثال چاہیے تھی۔

اسے امید تھی یہ ڈاکٹر اس کی بچی کو بالکل ٹھیک کر دے گا وہ بالکل پہلے جیسی ہو جائے گی۔ اگرچہ یہ بھی اس کی

خوش فہمی تھی کہ اب کچھ بھی پہلے جیسا نہیں ہو سکتا تھا۔

”اس بچی کی بیماری کا علاج صرف اس کی ماں کے پاس ہے۔ آپ اسے کچھ دنوں کے لیے ان کے پاس چھوڑ

دیں۔ اسے تھوڑا نارمل ہونے دیں پھر دونوں فیملیوں کو مل کر بیٹھیں اور کوئی فیصلہ کر لیں مگر اس طرح اگر آپ اپنی

محبت کا فلسفہ جھاڑ کر زندگی رکھیں گے تو یہ کبھی ٹھیک نہیں ہوگی۔ اینڈ ٹھینک یو دیری میچ۔“ کہہ کر اس نے

پروفیشنل انداز میں انٹرکام پر اگلے مریض کو آنے کے لیے کہا۔

عدیل کچھ دیر یونہی بیٹھا رہا۔

مثال تو کسی بت کی طرح سادگی اور بے حس بیٹھی تھی جیسے اس نے ان دونوں کی گفتگو کا ایک لفظ نہیں سنا

تھا۔

”دشکریہ ڈاکٹر صاحب! عدیل نے بدقت کہا اور مثال کا بازو پکڑ کر ٹھکست خورہ سا باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر اسے جاتے ہوئے تاسف بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔



”اب کیسی طبیعت ہے دروہ کی؟“ وہ تھکے ہوئے انداز میں چادر اتار کر ایک طرف بیٹھے واثق سے بولی ہو

اسکول کا ہوم ورک کر رہا تھا۔

”سورہی ہے؟“ اس نے دو انگلیوں سے سر دبا دیا۔

”تم نے آتے ہی ہوم ورک شروع کر دیا۔ کھایا نہیں کچھ؟“ وہ تڑپا لہجے میں اس کے پاس بیٹھ گئی۔

واثق ماں کے لہجے پر ہاتھ روک کر جیسے غور کرنے لگا۔

”جمیدہ خالہ کب گئی تھیں؟“ وہ خود ہی سوال پر سوال کیے جا رہی تھی اس دلچسپی کے بغیر کہ واثق نے اسے کسی

سوال کا جواب نہیں دیا۔

”آپ جلد ہی کیوں آئیں اسکول سے؟“ واثق ماں کے سارے غیر ضروری سوال نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

عاصمہ جیسے مشکل میں پڑ گئی کہ واثق کو کیا بتائے۔

”حساس بچہ ہے ساری مشکلیں ہی ابھی سے اس پہ ڈالے جا رہی ہوں۔ کہیں اس کا ذہن کہیں اور نہ لگ

جائے۔“ واثق کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔

”یونہی بس کچھ زیادہ کام نہیں تھا اسکول میں۔“ وہ نظریں چرا کر ٹالنے والے انداز میں بولی۔

واثق ایک ٹکساں کو دیکھتا رہا۔

”کب سے اسٹارٹ ہو رہے ہیں تمہارے ایجنڈا؟“ وہ اس کی کتاب اٹھا کر دیکھنے لگی۔

”اگلے ہفتے سے۔“ وہ مختصر اٹھ بولا۔

دونوں خاموش ہو گئے۔

”اریبہ اور اریبہ کہاں ہیں؟ نظر نہیں آرہے ہیں مجھے۔“

”سو گئی ہیں۔“

”کچھ کھائے بغیر؟“ عاصمہ چونکی۔ اسے فکر سی لگ گئی۔ وہ بہت دیر یونہی اسکول کے گراؤنڈ میں بیٹھی سفید

دوھیادھوپ کو دیکھ کر سوچتی رہی کہ اب وہ کیا کرے گی۔

”نہیں! سالن گرم کر کے میں نے بازار سے انہیں روٹیاں ملا دی تھیں۔ آپ کو بھوک لگی ہوگی۔ لے آؤں

کھانا آپ کے لیے بھی۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”نہیں۔ واثق مجھے بھوک نہیں ہے۔ تمہیں پکا دوں روٹی۔ تم بازار کی نہیں کھاتے ہوتا۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔

”مما! اسکول میں آج کیا ہوا ہے؟“ واثق گہری سنجیدگی سے بولا تو عاصمہ جیسے ہار گئی کہ وہ مزید اپنے جھوٹ کو

نہیں سنبھال سکے گی۔

”جواب سے فارغ کر دیا ہے میڈم نے مجھے۔“ وہ پھر سے تھکی ہوئی بیٹھ گئی۔

واثق ہم صدمہ سا ہو گیا۔ اس کو ماں کا چہرہ دیکھ کر کچھ انسوئی کا اندازہ تو ہو گیا تھا مگر جواب سے فراغت کا اس نے

نہیں سوچا تھا۔

”کیا کریں گی اب آپ؟“ وہ بہت دیر بعد بولا۔

”پتا نہیں۔“ عاصمہ کو واقعی پتا نہیں تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ کراہے بھی اس ماہ نہیں ملتا تھا اور اسکول سے

نخواہ بھی نہیں۔ صرف تھوڑی سی ٹیوشنز تھیں۔ پچیسیس شام میں وہ اور واثق مل کر پڑھاتے تھے یا وہ تھوڑی بہت

سلائی کرتی تھی۔ اور آج کل تو دروہ کی بیماری کی وجہ سے کچھ بھی نہیں کپا رہی تھی۔

”میرے دوست کے کاموں کا اسکول سے انہیں بھی پیچرز کی ضرورت ہے۔ وہ مجھے بتا رہا تھا ممما! آپ پریشان نہ

ہوں۔ میں علی سے بات کروں گا۔ آج ہی بلکہ اسے فون کر کے پوچھتا ہوں پھر ہم وہاں جا کر دیکھ لیں گے۔“

اسے بھی کبھی لگتا تھا واثق کے اندر کہیں نہ کہیں فاروقی صاحب چھپے بیٹھے ہیں۔ ہمیشہ ہی ایسے ہوتا آیا تھا۔

جب سے وہ بیاہ کر آئی تھی۔ عفتان کی نوکری کا مسئلہ ہو گیا مگر کوئی اور بظاہر نہ حل ہونے والا کوئی بھی نمبر ملا، جسے سن کر فاروق صاحب بہت دیر تک یونہی خاموش ہو جاتے اور جب بولتے تو اس طرح کہ اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل موجود ہوتا۔ عاصمہ حیرانی سے واٹن کو دیکھنے لگی۔

”ہاں ہاں ماما! آپ بھی تو کہتی ہیں ایک ورہند تو سوکھنے۔ یہ زندگی ہے اور مشکلات، مسائل اس کا حصہ۔“

بہت ہلکے پھلکے انداز میں بالکل بواوا کی طرح بولا۔

عاصمہ بے اختیار ہنس پڑی۔ واٹن حیران سماں کو دیکھنے لگا۔ کہاں تو کچھ دیر قبل جیسے رو دینے کو تھیں اور اب ایک دم سے ہنس پڑیں۔

”آپ کیوں نہیں۔۔۔ آپ کو میری بات کا یقین نہیں تو میں ابھی علی کو فون کرتا ہوں آپ خود اس سے بات کر لیں۔“ وہ معصوم سی خفگی سے بولا کہ ماں نے اس کی ذہانت پر شک کیا ہے۔

عاصمہ نے بے اختیار واٹن کو اپنے ساتھ لگایا۔

”میری جان! مجھے خود پر تو شک ہو سکتا ہے مگر اپنے اس بہادر عقل مند اور امت والے بیٹے پر ہرگز شک نہیں ہو سکتا۔“ وہ بہت حوصلہ مند آواز میں واٹن کو گلے لگا کر بولی تھی۔

وہ جو کچھ گھنٹے پہلے تک اتنی مایوسی اور دل گرفتہ تھی صرف واٹن کے ایک جملے نے اسے اپنے پورے قدر پر کھرا کر دیا۔

”یہ زندگی ہے اور مشکلات، مسائل اس کا حصہ۔“ اس نے واٹن کو کم سکھایا تھا واٹن اسے زیادہ سکھانا ہے۔ عاصمہ کو کسی لگا۔

”ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم مل کر ساری مشکلوں پر قابو پالیں گے مجھے پورا یقین ہے۔“ واٹن کا حوصلہ برعائن کو بڑے عزم سے بولی۔

”ان شاء اللہ ای!“ وہ معصوم مسکراہٹ کے ساتھ بھل سا گیا۔

”اب ہم دونوں کھانا کھاتے ہیں پھر جا کر الیاں انکل کو بلا کر لاؤ۔ حمیدہ خالہ کو ساتھ میں بیٹھا ہوے آنا کہ وہ بھی آجائیں تو ہم الیاں انکل کو کسی اچھے کرائے دار کے لیے کہہ دیں کیونکہ اس کے بغیر گزارہ مشکل ہے۔“ عاصمہ آگے کالائج عمل سے بتاتے ہوئے بولی۔

کچھ دیر پہلے اسے اپنے آگے صرف گھناٹو پاندھیر اور مایوسی اور مصائب کا پہاڑ نظر آ رہا تھا۔ مگر اب جیسے کچھ بھی نہیں تھا۔ سب کچھ بھلانا مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہیں۔ وہ مطمئن سی روٹیاں ڈالنے بچن کی طرف بڑھ گئی۔

”نہیں مجھے کچھ نہیں کھانا۔ میں اسی طرح مر جاؤں گی مگر اپنی مثال کو دیکھے بغیر میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔“ بشری نے سوپ کا پہالہ سامنے دیوار پر روئے مارا تھا۔

لازمہ نے پیچھے ہٹ کر خود کو گرم سوپ سے بچایا۔

اور ذکیہ کو لگا دو اتنی بشری کے پاگل پن کے باقیوں یا تو پاگل ہو جائیں گی یا دنیا سے گزر جائیں گی۔

”میری بچی نے اتنے دنوں سے معلوم نہیں کچھ کھایا یا نہیں۔ اس کی کیا حالت ہوگی میرے بغیر۔“ کیسے رہے گی وہ اتنا رو رہی تھی اس کے آنسو اس کی چہنچہن میں کچھ نہیں بھول سکتی۔“ وہ تکیے پر سر جھٹکتے لگی۔

ڈاکٹر نے ایک دن رکھ کر اسے ڈسچارج کر دیا تھا۔ زخم زیادہ گہرے نہیں تھے مگر جو گھاؤ اس کے دل اور رگت میں لگے تھے ان کا مزہم ذکیہ اور عمران کو کہیں سے نہیں مل رہا تھا۔

”لے آؤں گی اسے بھی ہم کچھ کھاؤ لو۔ تمہاری طرف سے کچھ بے فکر ہوں تو ان بد بختوں سے جا کر دو دو ہاتھ لوں۔ میری بچی تم تو خود کو سنبھالو۔“ ذکیہ نے پاس آ کر اسے ساتھ لگا کر سمجھانے کی کوشش کی۔

وہ کچھ سننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ”نہیں نہیں میں مثال کو دیکھوں گی تو مجھے قرار آئے گا ورنہ آپ مجھے مر بانے دیں ای!“ وہ اتنی ضدی کبھی بھی نہیں تھی۔ توج چار دن سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔

ذکیہ کا دل سخت پریشان تھا۔ ڈاکٹر نے بھی ڈرایا تھا کہ اس کا کچھ کھانا ضروری ہے مگر بشری اسے ذکیہ صدمے میں بھی تھیں ملازمہ فرسٹ صاف کرتے ہوئے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

”نہیں کھایا آپ نے کچھ؟“ عمران بورا زے کے پاس ہی رک کر کمرے کی حالت سے اندازہ لگاتے ہوئے بولا۔

ذکیہ نے لا چاری سے نفی میں سر ہلادیا۔

بشری دیوانوں کی طرح چھت سے نگاہیں نکالے خشک ہونٹوں کے ساتھ ”مثال مثال پکارے جا رہی تھی۔“ یہ پاگل ہو جائے گی عمران! اسے کچھ ہو جائے گا۔ خدا کے لیے کچھ کرو۔“ ذکیہ رونے لگیں۔ عمران مٹھیاں پیچ کھڑا رہا۔ اس کے چہرے پہ سخت غصہ تھا۔

”میں آتا ہوں ابھی۔“ وہ تیزی سے جانے لگا۔

”عمران! کہاں جا رہے ہو۔ مجھے کچھ بتا کر جاؤ۔“ ذکیہ کو کسی خطرے کا احساس ہوا تو اس کے پیچھے جاتے رہے بولیں۔

”آ رہا ہوں۔ پریشان نہ ہوں آپ آپ سے کہہ دیں۔ میں مثال کو لے کر آ رہا ہوں۔“ وہ کہہ کر ذکیہ کے پچھنے سے پہلے گاڑی نکال لے گیا۔

”عمران! عمران! کوئی جھگڑا نہ کرنا میرے بیچے! جلد بازی نہ کر۔ میں خود دیکھ لوں گی۔“ وہ بے کار میں بولتی رہیں۔ عمران جا چکا تھا۔

”بھی دفتر سے تھکا ہارا آیا ہے۔ خدا جلنے غصے اور جوش میں کیا کر ڈالے۔ وہ وحشی عدیل بھی کچھ کم نہیں۔“ اس کی ذلیل ماں نسیم کیڑے پڑیں قبر میں جو قلم تو نے میری بیٹی کے ساتھ کیا ہے میری اولاد اور تو کبھی سکھ نہ پائے۔“

ان چار دنوں میں وہ ان تینوں کو اتنی بدوائیں دے، چکی تھیں کہ اب انہیں لگتا ان کی بدوائیں بھی کھو کھلی سی گئی ہیں۔

عدیل نے گاڑی گیٹ کے آگے روکی۔

لا خود اتر کر گیٹ کھولنے لگا مثال گاڑی میں ہی بیٹھی تھی اسی طرح ارد گرد سے بے خبر لا تعلق بخار میں سلگتی، نیا چہرے۔ عدیل کو بیٹی پر بے تحاشا ترس آیا۔

”کاش! میں نے اتنی جلد بازی نہ کی ہوتی۔“ اب تو اس کا دل کھل کر اسے ملامت کرنے لگا تھا۔ شاید یہ بچہ بڑے اتنی جلدی شروع نہ ہوتے اگر مثال یوں مستعمل بیمار نہ پڑتی۔ میں نے صرف ای اور فوزیہ کے جذبات کا پل کیا۔ ایک بار بھی مثال کے بارے میں نہیں سوچا۔ ضد تھی اٹا تھی اور غصہ تھا کہ بشری کی سب خواہشیں میں پوری کرتا ہوں تو اسے بھی میری ہر جاو بے جا خواہش آنکھیں بند کر کے پوری کرنی ہوگی۔

نہ انا اور جلد بازی۔ مگر تو اجزا ہی دل بھی برباد ہو مگر یہ بچی اسی طرح ازیت جھیلے گی۔ میں نے ایک بار بھی سوچا۔ کاش میں صرف ایک بار سوچ لیتا۔ مجھے تو اندازہ بھی نہیں تھا کہ مثال بشری کے بغیر رہی نہیں سکتی۔

سوچا۔ کاش میں صرف ایک بار سوچ لیتا۔ مجھے تو اندازہ بھی نہیں تھا کہ مثال بشری کے بغیر رہی نہیں سکتی۔

میری محبت کا فیصلہ اب تو جیسے میری بچی کا دم گھونٹ رہا ہے۔ میں اسے اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں دے رہا۔

یہ کیسی محبت ہے۔ ”وہ ساکت سا گاڑی سے نیک لگائے سوچتا چلا جا رہا تھا اسے پتا بھی نہیں چلا۔ کرب عمران کی گاڑی اس کی گاڑی کے برابر میں آکر رکی۔ عمران بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اچھل کر گاڑی سے اتر گیا اور دوسرے لمحے اس نے عدیل کی گاڑی سے فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی مثال کو کھینچا اور اپنی گاڑی میں بٹھانے لگا۔ عدیل جیسے کسی سحر سے جاگا۔ وہ تیزی سے عمران کی طرف لپکا۔ دوسرے لمحے دونوں تختہ تختہ ہو چکے تھے۔ مفاصلات بہت جلدوں ایک دوسرے کا تجربہ کھنگال رہے تھے۔

مثال سمی ہوئی عمران کی گاڑی کے پاس کھڑی تھی پھر وہ یک دم چیخنے لگی۔ دونوں ایک دوسرے کا گریبان پھڑ چکے تھے۔ مثال کی ہینچوں پر دونوں جیسے ہوش میں آگئے۔

”تم میری بچی کو ہاتھ تو لگا کر دیکھو تمہارے ہاتھ توڑوں گا۔“ وہ عمران کو پرے دھکیل کر خوشخوار لمبے میں بولا۔

”یہ صرف تمہاری بیٹی نہیں بے غیرت انسان! تم میں اتنی غیرت ہوتی تو توطلاق دینے سے پہلے سوچتے۔“ وہ بھی جولا جولا کر بولا۔

”تو باب لگتا ہے میرا؟“ عدیل پہلے ہی ڈاکڑ کی باتوں سے تپا ہوا تھا۔ عمران کی بات اسے اور اگ لگا گئی۔ دونوں پھر تختہ تختہ کھنگالے ہوئے۔

فوزیہ بھاگتی ہوئی باہر آئی اور باہر کا منظر دیکھ کر سکتے میں آگئی دوسرے لمحے نسیم بھی ہانپتی کانپتی آ پہنچیں۔ ارد گرد کے گھروں کے گیٹ کھلنے لگے۔

اور وہ دونوں سب سے بے خبر لڑے جا رہے تھے۔ مثال اسی طرح چیخ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

”فوزیہ! جا جلدی سے اس مثال کو تو پکڑ کر لا۔ اس نے آسمان سر پر اٹھار کھا ہے چیخ چیخ کر۔“ نسیم گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے بولیں۔ وہ عدیل کو کھینچنے لگیں۔ دونوں حصے میں بری طرح سے پھرتے ہوئے تھے انہیں الگ کرنا آسان نہیں تھا۔ ایسے میں محلے کے دو قین لوگ آگے بڑھے اور انہیں چھڑانے کی کوشش کرنے لگے۔ نسیم عدیل کو کھینچ کر دوڑ لے جانے لگیں۔

عمران نے عدیل کو دھکا دیا اور دوسرے لمحے مثال کی گاڑی کا دروازہ کھول کر اس نے اپنی گاڑی میں پھینکا اور خود تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

عدیل اور دوسرے لوگوں کے راستہ روکنے سے پہلے وہ اندھا دھند گاڑی اڑاتا وہاں سے لے گیا۔

”میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ آج یہ نہیں بچے گا میرے ہاتھوں سے۔“ عدیل پھٹے گریبان ’ذخمی چہرے کے ساتھ منہ سے کف اڑاتا گاڑی میں بیٹھنے لگا۔

نسیم چلا کر دہائی دینے لگیں۔ اور اس کے بازو سے لپٹ گئیں۔

”نہ میرا بچہ۔ اس وقت اس کے پیچھے نہیں جا۔ تیری حالت نہیں ایسی کہ گاڑی چلائے۔ کوئی حادثہ کر بیٹھے گا۔ میں بیوہ برباد ہو جاؤں گی۔ مثال کہیں نہیں جائے گی تمھوڑا حوصلہ کر۔“

وہ اسے اپنی طرف پورا زور لگا کر پھینچے ہوئے تھیں۔

”پی! چھوڑو مجھے جانے دو اس کے پیچھے میں مثال کو لے کر آؤں گا۔“ وہ خود کو چھڑا رہا تھا۔

”بھائی صاحب! کیا ماجرا ہے۔ دو تین دن سے یہ ہنگامہ چاہے آپ کے گھر میں اگر کوئی جھگڑا ہے تو گھر میں بیٹھ کر پینالیں۔ نہیں تو پولیس کو بلائیں۔“ ایک بزرگ گزرا آگئے ہوئے نسیم کے ہاتھوں میں کتے ہوئے ان کی طرف بڑھے۔

”جہاں اندر بچہ لڑبات لڑتے ہیں۔ میں اپنی خود نیرے ساتھ جاؤں گی اور مثال کو لے آؤں گی۔“ نسیم لڑتے ہوئے اندر لے گئیں۔ مکملے والے چہ گویاں کر رہے تھے جب فوزیہ نے گیٹ بند کیا۔



علی نے اسے ماموں سے فوراً ہی فون پر بات کرادی۔

نسیم صاحب نے عاصمہ کو اگلے ہی دن آٹس بلا لیا کہ وہ اس کا نارمل سائٹروپولیس کے اور اسے اپائنٹ کر لیں۔

انہوں نے یہ بھی وعدہ کیا کہ اس کی تنخواہ پہلی جا ب کے مقابلے میں کافی اچھی ہوگی۔

عاصمہ کو لگا کہ اس کے سر سے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔

نسیم صاحب کافی خوش اخلاق اور مہربان شخص لگتے تھے۔ عاصمہ کے حالات جان کر وہ اور بھی ہمدردی کا اظہار کرنے لگے تو عاصمہ کچھ ڈر سی گئی کہ پہلے اتنی ہمدردی اور مہربانی سے بہت بڑا نقصان اٹھا چکی تھی۔ اگلے دن آنے اور آکر کے اس نے فون رکھا ہی تھا کہ واٹس پر اپنی ڈیپٹر الیاس اور حمیدہ خالہ کو بلا لایا۔

حمیدہ خالہ نے ہی الیاس سے بات کی کہ اب کے وہ کیسے کرانے دار لے کر آئے۔ ”کراہیہ اچھا میں اور وقت پر ہوں۔ یہ بہت ضروری بات ہے لیکن اس سے بھی ضروری ہے کہ وہ بہت شریف لوگ ہوں۔ اپنے رستے آئیں اپنے رستے جائیں۔ بہتر ہے بال بچے اور لمبلی ہو۔“ وہ الیاس سے خوب ٹھوک بجا کر بولیں۔

”نہیں پوری کوشش کروں گا خالہ جی! کہ جلد سے جلد انتظام کر سکوں۔ کیونکہ کل مجھے ہاشم بھائی نے بھی فون کے ماکید کی ہے۔ میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اٹھاؤں گا۔“ الیاس حمیدہ کی شرطوں سے کچھ ڈکھتا کر

اس کے خیال میں پہلے کرائے دار بھی حمیدہ خالہ کی روز روز کی احتیاطی نصیحتوں اور سارے دن میں بوقت بے وقت جھالے مارنے سے بھاگے تھے۔

”بھائی! جو بھی کوئی کرائے دار مجھے اچھا لگتا ہے۔ یہاں کے لیے مناسب۔ تو میں آپ کو پیغام بھیجوا دوں گا۔“ الیاس نے اجازت دیں۔ دکان اکیلی چھوڑ کر آیا ہوں۔“ اس سے پہلے کہ حمیدہ خالہ مزید شرطیں بیان کرتیں وہ وہاں سے

گھر آیا۔

”میں بشر سے کہتی ہوں وہ ایسے کسی واقف ڈیپٹر سے بات کرے۔ مجھے تو یہ الیاس بھی ایویں سا لگتا ہے۔“

ابرا خالہ بیٹے کا حوالہ دیتے ہوئے غیر مطمئن سی بولیں۔

”الیاس بھائی! مجھے ہیں۔ بھروسے کے لوگوں کو لے کر آتے ہیں خالہ۔“ عاصمہ نے آہستگی سے کہا۔ حمیدہ خالہ نے اسے فہمائشی نظروں سے گھورا۔ جیسے کہہ رہی ہوں۔ ”تم پھر اندھا اندھا اعتماد کرنے لگیں؟“ عاصمہ نظریں چرا

”اور میں نے سنا ہے تم نے نوکری بھی چھوڑی اسکول کی؟“ نسیم یاد آیا تو فوراً بولیں۔

”نہیں نے نہیں چھوڑی۔ انہوں نے نکال دیا ہے۔“ وہ نخنی سے بولی۔

”الیاس! اچھا۔ میں بات کرتی ہوں ابھی جا کر۔ کیا تکلیف ہوئی ان کو بھلا تم سے۔ اچھا بھلا تو ذمہ داری سے لیا نہیں تم۔“ حمیدہ خالہ چیخ کر بولیں۔

”رہنے دیں خالہ! میں نے کافی کوشش کی۔ مگر میڈم نے معذرت کرنی۔ دور کی بیماری کی وجہ سے بہت چھٹیاں لیا تمہیں اس لیے۔“

عاصمہ کا دل نہیں تھا کہ دوبارہ سے وہ کسی کی سفارش پہ جائے اس لیے منع کرتے ہوئے بولی۔
 ”اے لو! اس میں کیا جھوٹ سے بھلا۔ تم کوئی جان کر چھٹیاں کر رہی تھیں؟ بچی کو خدا نے دو سری زندگی دی۔
 ایسی ٹھنڈ لگی کہ اس کے بچنے کی امید کب تھی بھلا۔“ حمیدہ خالہ اپنے انداز میں بولتی چلی گئیں۔
 ”خیر! آپ پریشان نہیں ہوں۔ ایک جگہ کل جا رہی ہوں انٹرویو کے لیے۔ اگر خدا خواست وہاں بات نہ بن سکی
 تو پھر آپ ہی سے کہوں گی۔“ عاصمہ نرمی سے منع کرتے ہوئے بولی۔
 ”مما! کچن کاسک سارا بھر گیا ہے۔ اس کا پائپ نیچے سے بندھے گا۔“ اریبہ اندر آ کر بولی۔
 ”فونہ! ایک تو یہ آئے دن کی مصیبت ہے۔ نیچے سے پائپ اتنا چھوٹا ہے۔ ذرا سا کچرا یا چکنائی چلی جائے فوراً
 بند ہو جاتا ہے۔ یہی حال غسل خانے کے پائپوں کا ہے۔“ عاصمہ کو فنت سے بولی۔
 اسے تو یوں چند مہینوں میں اندازہ ہو گیا تھا کہ گھر چلانے کا مطلب صرف خرچ کے لیے پیسے فراہم کرنا یا انعام
 ہونا ہی کافی نہیں۔ چھوٹے بڑے ہزاروں اتنے مسائل ہوتے کہ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر تڑپا ہوا ہو کر رہ جاتی۔ مگر
 مسئلے کہ نہ ہوتے۔

”تو کسی پمپر کو بلا کر ٹھیک کراؤ۔“ حمیدہ خالہ نے مفت مشورہ جھاڑا۔
 ”خالہ! بست بار بلا چکی ہوں۔ وہ کہتے ہیں اندر والے پائپ چھوٹے ہیں اور پائپ بدلوانے میں سمجھیں گا کہ
 خرچ ہے۔“ عاصمہ کو فنت سے بولی۔
 ”خیر! اب تم اتنے لمبے بکھیروں میں مت الجھو۔ فی الحال گزارہ کرو اور پائپوں میں کوئی ایسی ایسی چیز ہی نہ پھینکا
 کرو۔“ حمیدہ خالہ چادر ٹھیک کرنی جانے کو تیار تھیں۔
 ورنہ عاصمہ کا دل تھا کہ وہ ان سے کہتی کہ اچھے ٹھیکے دار سے بات کر کے اس مسئلے کا کوئی حل نکال دیتیں۔ بیٹر
 ان کا بننا یہ کام کر سکتا تھا۔ اس کے کئی ٹھیکے دار واقف تھے۔
 ”چلتی ہوں میں۔ ابھی مجھے مرغی لینے جانا ہے۔ بشیر آج برائی کی فرمائش کر کے گیا ہے۔ اور یتیم صاحبہ نے دو
 نوٹ میرے ہاتھ میں آتے ہوئے پکڑا دیے کہ آتے ہوئے مرغی لے کر آنا۔ ابھی اوہر جا کر کھرا ہونا پڑے گا۔“
 وہ دروازے تک ڈرا سی دیر میں پہنچ بھی گئیں۔
 ”مما! کچن بھر رہا ہے پانی سے۔“ اریبہ نے پھر آ کر اطلاع دی۔
 ”تو تم نے ٹوٹی کیوں کھولی؟“ داغ خراب ہے تمہارا۔“ اے ایک دم سے شدید غصہ آ گیا۔
 ”ممانوئی تو بند ہے۔ گم پانی۔“ اریبہ ڈر گئی۔
 ”دیکھتی ہوں میں۔“ اے معلوم تھا اب پمپر کو بلائے بغیر گزارہ نہیں اور اس کے پاس پیسے بھی کم تھے۔



”انسپیکٹر طارق بات کر رہے ہیں۔ جی۔ میں عدیل ہوں۔ جی۔ جی بالکل۔ آپ پولیس اسٹیشن ہی میں
 ہیں نا۔ میں آ رہا ہوں۔ تھوڑی دیر میں۔ جی! مسئلہ ہی ہے۔ میری بیٹی کو میری سابقہ بیوی کا بھائی اغوا کر کے لے
 گیا ہے۔ جی۔ تاوان کا بھی مسئلہ ہو سکتا ہے اور وہ مجرمانہ ذہنیت کا شخص ہے۔ میری بچی کو نقصان بھی پہنچ سکتا
 ہے۔ ٹھیک ہے! میں تھوڑی دیر میں آ کر تفصیل بتانا ہوں اور ایف آئی آر کھاتا ہوں۔ شکریہ! اس میں آ رہا
 ہوں۔“ عدیل نے بات کر کے فون بند کر دیا۔
 پیچھے کھڑی نیم سوہک سے وہ گئیں۔ یہ تو ان کے گمان میں نہیں تھا کہ یہ معاملہ پولیس میں بھی جاسکتا ہے۔
 ”بس آتا ہوں امی۔ ابھی۔“ عدیل نے کپڑے بدل لیے تھے۔ مگر چہرے پر سختی، زخموں کی سوچ اور نشانہ ہی

”عدیل بیٹا! بات سن میری۔“ نسیم پریشانی سے بولیں۔
 ”اے! آپ کو جو بھی کہنا ہے۔ میں آ کر بات کروں گا۔ انسپیکٹر صاحب چلے جائیں گے پھر۔“ وہ کہہ کر جانے لگا۔
 ”گریہ چلا گیا تو۔“ نسیم تیزی سے اس کے پیچھے لگیں۔
 ”عدیل میرا بچہ۔ دو گھڑی صرف میری بات سن لے۔ پھر چلے جانا۔“ وہ منت بھرے لہجے میں بولیں۔
 ”اے! جانے دیں مجھے۔ لیٹ ہو جاؤں گا۔“ وہ چڑ کر بولا۔
 ”دیکھو عدیل! بستر ہے یوں معاملہ تھا نے پکھری میں لے جانے کی بجائے مل بیٹھ کر۔“ نسیم نے پہلی بار جیسے
 ہوش کے ناخن لیے تھے۔ تھا نے پکھری کا مطلب پورے محلے اور خاندان میں باتیں اور بدنامی تھی۔ پھر سب سے
 بڑھ کر انہیں ابھی نوزیہ کی شادی کرنی تھی اور عدیل کی بھی تو۔
 ”دیکھو بچہ۔ اس میں نقصان۔ تمہارا۔“

”بس کیوں۔ میں تو برباد کروں گا ان دو لکے کے لوگوں کو۔ میری بیٹی ان لوگوں کے پاس۔“ وہ غصے میں
 بھڑک کر بولا۔
 ”عدیل! مثال کا سوچ۔“ وہ اس کا بازو زور سے ہلا کر بولیں اور یہ بات نسیم نے اس وقت نہیں کہی تھی
 جب وہ مسلسل اسے بشری کو طلاق دینے کا کہہ رہی تھیں۔ عدیل بھی ٹھنک کر رہ گیا۔
 ”کیا مطلب؟“ وہ ناگواری سے بولا۔ مثال کے نام پر وہ ہر بات سننے کے لیے تیار تھا۔
 ”سیراچیہ! اس بچی پر اور ظلم نہ کر۔ اسے تو ماں باپ دونوں چاہئیں۔ تو اس طرح اسے تھا نے پکھری میں لے
 کر جائے گا۔ اس کی ساری نفسیات تباہ ہو جائے گی اور پھر اگر تو تھوڑا بہت قانون بڑھ لے تو تجھے پتا چلے گا کہ
 قانون صرف ماں کی حمایت کرنے کا۔ تو عدالتوں پکھری میں جائے گا۔ بچی بشری کے پاس چلی جائے گی جو سراسر
 نقصان ہی ہے۔“ وہ نرم لہجے میں اسے سمجھا رہی تھیں۔
 ”اچھا تو آپ کا مطلب ہے ہمیں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا رہوں۔ سو بہد معاش میری آنکھوں کے سامنے میری بچی
 مجھ سے چھین کر لے گیا اور میں چوڑیاں پہن لوں؟“ وہ بھڑک اٹھا۔
 ”تھوڑا صبر، تحمل سے کام لے۔ اگر ایسی بے صبری کرے گا تو مثال نہیں ملنے والی تھی۔ پہلا حق ماں کا ہی ہے۔
 بچی کے پالنے ہونے تک۔ یہ تو یاد رکھ۔ دنیا کی کسی بھی عدالت میں چلا جا۔ وہ فیصلہ ماں کے حق میں ہی کرے گی۔“
 نسیم نے پہلی بار اسے ایسی تلخ حقیقتوں سے آگاہ کیا۔
 اور وہ تو جیسے ششدر سماں کو دیکھے ہی جا رہا تھا۔
 ”بس جانتی ہوں۔ تو اس سے کتنی محبت کرتا ہے۔ اکلوتی بیٹی ہے تیری۔ ایسا پار ہونا بھی چاہیے اور جس طرح
 کی وہ بشری زور اس کی ماں ہے۔ مثال کو تو میں بھی ان کے زرخے میں نہیں رہنے دوں گی۔“ وہ مخصوص انداز میں
 بولیں۔
 ”تو کیا کروں پھر۔ میں اپنی بچی کے بغیر ایک منٹ نہیں رہ سکتا۔“
 ”تو یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دے۔ مثال کو وہ خود سماں بولے کر جائیں گے۔“ نسیم عزم سے بولیں۔
 ”وہ کیسے؟“ عدیل بے ہمت سا ہو گیا۔
 ”مجھ پر چھوڑ دے۔ یہ کھیل جوش لڑائی اور جھگڑے سے نہیں۔ طریقے سے کھیلتا ہے۔“ نسیم کے لیے پھر
 سے ایک محاذ کھل گیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں مخصوص جھک تھی جو ایسی صورت حال میں ہوتی تھی۔ عدیل ماں کو
 کوفت سے دیکھنے لگا۔

”بھی ایک دن اسے ماں کے پاس رہنے دے۔“
 ”ایک دن بھی نہیں۔ بلکہ ایک گھنٹہ بھی نہیں۔“ وہ بات پوری ہونے سے پہلے تڑپ کر بولا۔
 ”عدیل! مثال بتا رہے۔ اس کا بخار ماں کے پاس جا کر ایک دن میں کم ہو جائے گا۔ تو پھر میں اسے جا کر لے
 آوں گی۔“ وہ نرمی سے سمجھانے لگیں۔
 ”آپ کے خیال میں وہ آپ کو مثال کو دے دے گی؟“ وہ طنز سے بولا۔
 ”ماں پر بھروسہ تو کر کے دیکھو۔“ نسیم اسے سنجے کی طرح پچکار کر بولیں۔
 ”ہی! میں جا رہا ہوں۔ اب آپ مجھے نہیں روکیں گی۔“ اس نے ماں کا ہاتھ جھٹکا اور اٹھ کر جانے لگا۔
 ”اچھا۔ سن چلا جا۔ میں تیرے ساتھ جاؤں گی۔“ وہ تیزی سے بولیں۔ عدیل نے ماں کو یوں دیکھا۔ جیسے ان
 کا داغ چل گیا ہو۔
 ”ہی... میں تھانے جا رہا ہوں... پولیس اسٹیشن۔ آپ کیا کریں گی جا کر۔“ وہ جڑ کر بولا۔
 ”وہ انسپکٹر جس سے تو ابھی بات کر رہا تھا۔ تیرا جاننے والا ہے کوئی؟“ نسیم اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے
 بولیں۔

”میری جان! اب تجھے کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ کوئی تجھے مجھ سے دور نہیں لے جاسکتا۔ میں اپنی جان کو
 نہیں نہیں جانے دوں گی۔ اب تم میرے پاس ہی رہو گی میری جان۔“
 ”آئی! بس کرونا۔ کیوں اپنی بچی کو اور پریشان کر رہی ہو؟“ عمران جو ماں بچی کی ایسی پانگلوں سی محبت کافی دیر سے
 دیکھے جا رہا تھا۔ اسے ٹوک کر بولا۔
 ”عمران۔ میرے بھائی! میں کس طرح کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ تم نے میرے ساتھ جو نیکی کی
 ہے۔ میری مثال کو میرے پاس لے کر آئے۔“ بشری مغلوب سی ہو کر رونے لگی۔
 ”عمران اٹھ کر بہن کے پاس آ گیا۔“ آئی! کیوں مجھے شرمندہ کر رہی ہو؟ میرے لیے تو یہ شرمندگی کیا کم ہے کہ
 میری وجہ سے آپ کا گھر برباد ہو گیا۔“ وہ شرمندگی سے بولا۔
 ”تمہاری وجہ سے نہیں۔ اور میرا گھر تو جیسے پانی پر بنا تھا۔ ایک نہ ایک دن اسے ٹوٹنا ہی تھا۔ بس! میری مثال
 میرے پاس رہے۔ مجھ سے دور نہ رہے اور کچھ نہیں چاہیے۔“ وہ پھر سے مثال کو پیار کرنے لگی۔
 ”مثال۔ جانو۔ تمہیں بخار ہے؟“ وہ چونک کر اس کی کمر پر ہاتھ پھیر کر بولی اور پھر اس کے جسم کے مختلف
 جگہوں پر چیک کرنے لگی۔
 ”کب سے بخار ہے تمہیں؟“ وہ پریشان ہو انہی۔
 ”بہت دنوں سے ماما۔ جس سے آپ مجھے جھوڑ کر آئیں۔“ مثال رونے لگی۔
 بشری نے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔
 ”ددا کٹر کو نہیں دکھایا کسی نے تمہیں؟“ وہ مغلوب لہجے میں بولی۔
 ”بہت بار۔ آج بھی جب مجھے ماموں لینے گئے تو تو پایا مجھے ڈاکٹر کے پاس سے لے کر آئے تھے پاپا بہت پریشان
 تھے۔ وہ ساری رات میرے ساتھ جاگتے تھے۔“ وہ ایک طرف بیٹھے عمران کو کین دیکھوں سے دیکھ کر بولی۔
 ”تو پھر بخار کیوں نہیں اترتا تمہارا؟“ وہ اسے چھوٹی جا رہی تھی اور پریشان ہوتی جا رہی تھی۔
 ”ماما۔ پاپا۔“ وہ ماں کی بات جیسے سن نہیں رہی تھی۔ جھجک کر بولی تو بشری نے کچھ چونک کر اسے دیکھا۔
 ”کیا۔ ہوا تمہارے پاپا کو؟“ بشری نے بڑی مشکل سے ”تمہارے پاپا“ زبان سے ادا کیا۔
 ”پاپا اور ماموں۔ میں ابھی بہت لڑائی ہوئی تھی۔ پاپا کے چہرے پر۔ ماما۔ پاپا مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ وہ
 بہت پریشان تھے اور۔“ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اپنے احساس کو بیان کرے۔
 ”میری جان! اگر تمہارے باپ کو تم سے پیار ہوتا، تمہارا احساس ہوتا۔ تو کیا وہ یوں تمہیں مجھے خود سے کاٹ
 کر پھینک دیتا۔ ان دنوں کہینہ عورتوں کے کہنے پر۔“ بشری نفرت سے بولی۔
 ”بشری! بس کرو بیٹا! اب مثال کو تھوڑا آرام کرنے دو اور تم بھی آرام کرو۔ اتنا نہ تھکاؤ خود کو۔“ ذکیہ شکرانے
 کے نقل پڑھ کر اُندر آئیں۔ دونوں پردم کرتے ہوئے پھونک ماری اور دونوں کو گلے لگا کر پیار کرتے ہوئے نرمی
 سے بولیں۔
 ”امی! دیکھیں مثال کو۔ اتنا تیز بخار ہے۔ وہ بھی اتنے دنوں سے۔“ وہ رو ہانسی ہو کر ماں سے بولی۔ ذکیہ مثال کو
 چھو کر دیکھنے لگیں۔
 ”تمہاری جدائی کا بخار ہے۔ ان شاء اللہ ابھی کچھ دیر میں اتر جائے گا۔ اس کی تم فکر نہیں کرو۔ آؤ مثال!
 نہیں لٹاؤں میں تمہارے بستر پر۔“ ذکیہ مثال کو لے کر جانے لگیں۔
 ”نہیں امی! اسے میرے پاس رہنے دیں۔ یہ میرے پاس لینے گی۔ آپ اس کے کھانے کے لیے کچھ بنا دیں۔
 کیا کھائے گی میری جان؟“ وہ مثال کو اپنے ساتھ لٹا کر بار کرتے ہوئے بولی۔

”دوست سے میرا۔“ وہ بے زاری سے بولا۔
 ”بس! پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ اب تو میری بات غور سے سن اور درمیان میں اچھل اچھل کر بولیو نہیں۔“ نسیم
 شاطرانہ انداز میں بولیں۔
 ”ہی... مجھے کچھ نہیں سننا۔“ وہ پھر رسی تڑا کر جانے لگا۔
 ”سن لے بات۔ دل کو نہ لگے تو بھلے سے چلے جانا۔ میں نہیں روکوں گی تجھے۔ سن تو لے۔“ وہ اسے کچھ ایسے
 طریقے سے روکتے ہوئے بولیں کہ عدیل گہری سانس لے کر رہ گیا۔
 نسیم کو انسان کو راہ پر چلانا اور راہ سے بھٹکانا دونوں ہی خوب آتا تھا۔ اس نے دل میں ماں کی اس صلاحیت کا
 اعتراف کیا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔
 ”میں فون کرتی ہوں ابھی تیری سسرال۔“
 ”نہیں سے وہ اب میری سسرال۔“ وہ سخی سے تیز لہجے میں بولا۔ نسیم بھی لمحہ بھر کو خاموش سی ہو گئیں۔
 بات تو دکھ کی تھی۔ بشری جیسی بھی سہی ان کے لیے۔ بیٹے کا گھر تو اڑ گیا تھا۔ نسیم دکھ بھری نظروں سے دیکھ کر
 رہ گئیں۔



بشری پانگلوں کی طرح مثال کو گلے سے بھینچے اسے بار بار جوئے جا رہی تھی۔ ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر اسے
 دیکھے جانی اور پھر سے اسے چومنے لگتی اور چومتی چلی جاتی۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ مثال اس کے پاس
 ہے۔ اس کی بانہوں میں۔ اس کے بہت قریب۔
 ”میری بچی... میری گزریا۔ میری جان! تو نہ آتی تو تیری ماں مر جاتی تیرے بغیر۔ میری مثال... میری جان۔“
 پھر اسے گلے لگا کر بھینچنے لگی۔
 ”ماما... ماما... تجھے آپ کے ساتھ رہنا ہے۔ مجھے اب واپس نہیں جانا۔ میں آپ کے پاس رہوں گی۔ مجھے
 دادو اور پھوپھو کے پاس نہیں جانا۔“ مثال کی آنکھوں سے بہت دنوں کے بعد ایسے گرم گرم آنسو نکلے تھے۔ بشری
 اسے چومنے لگی۔

”سما! اسی پتھری میں۔ وہاں وہ سب دیکھ رہے جا رہے ہیں۔
 بہت دنوں بعد تو اسے ماں کی آغوش میں آئی تھی۔ اس نے دونوں ہانہیں بشری کے گرد پھیلا دیں اور آنکھیں
 موند لیں۔“

”۲۲؎ اسی سے گرم دودھ دے دو۔ کچھ دیر سوئے گی تو پھر اٹھ کر کچھ کھالے گی۔“ ذکیہ کہنے لگیں اور دودھ کے لیے
 ملازمہ کو آواز دینے لگیں۔

”عمران! تمہیں عدل سے جھگڑا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ ذکیہ نے عمران سے کہا۔

مثال بے اختیار آنکھیں کھول کر تانی اور ماموں کو دیکھنے لگی۔

”۲۳؎ پلیز۔“ بشری نے اشارے سے ماں کو اس موضوع پر بات کرنے سے منع کیا۔

”ہاں لہو تو جیسے بڑے پیار۔ سے مثال کو مجھے دے رہا تھا۔ جھگڑانہ کرتا تو اور کیا کرتا۔“ عمران بڑبڑا کر باہر نکل
 گیا۔



”کیا آپ سچ کہہ رہی ہیں؟“ نسیم فون کان سے لگائے بسپایاں خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولیں۔ ٹی بی چینل
 بدلتی فوڈیہ نے چونک کر ماں کو دیکھا۔

”نہیں۔ نہیں۔ بالکل نہیں۔ بے یقینی کی بات نہیں۔ جی۔ آپ نے ٹھیک کہا۔ بالکل۔“ وہ ایسے

تالچ داری سے سر ہلائے جا رہی تھیں۔ جیسے دو سرے طرف کوئی بادشاہ وقت ہو۔ فوڈیہ نے ٹی بی کی آواز کم کر دی۔

”جی بالکل۔۔۔ کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ آجائیں کل کسی بھی وقت۔ نہیں، نہیں۔ مجھے کہاں جانا ہوتا ہے اس

پیاری نے تو بس گھر میں بٹھا دیا ہے۔ اللہ مجھے میری بیٹی کے فرض سے سبکدوش کرے تو پھر کوئی لالچ نہیں۔ بھلے

ملک الموت آئے اور اس مٹی کے ڈھیر کو لے کر چلا بنے۔“ وہ انتہائی عاجزی اور مسکینی سے کہہ رہی تھیں۔ فوڈیہ

سکرا کر رہ گئی۔

”قسم سے امی! آپ اگر ایک ٹریس ہو تیں تو پرائیڈ آف پرفارمنس تو آپ کا پکا تھا۔“ فوڈیہ ہنس کر آہستہ سے

بولی۔

نسیم نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور الوداعی کلمات بول کر فون رکھ دیا۔

”کیا ہوا؟ کون تھا؟“ فوڈیہ کو سخت بے چینی لاحق تھی۔ فوراً پوچھنے لگی۔

نسیم جوش بھرے انداز میں اٹھ کر فوڈیہ کے پاس آئیں اور اسے گلے لگا کر خوب پیار کرنے لگیں۔

”۲۴؎ امی! اس بے موقع پیار کی وجہ تو بتا دیں۔“ وہ ماں کے اس عجیب انداز پر کچھ بوکھلا کر بولی۔ وہ کب عادی تھی

ایسے والہانہ پیار کی۔

”میرے اللہ نے میری سن لی فوڈیہ۔ میری بچی۔ اللہ نے ہماری سن لی۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا۔“ وہ جوش

سے سرخ چہرے لیے ہوئے بے ربطگی سے بولی۔

”۲۵؎ امی! ہوا کیا ہے۔ پتا تو دیں کچھ۔“ فوڈیہ کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکنے لگا۔

”وہ کل خالد کی باں اور خالہ نہیں آئی تھیں تجھے دیکھنے۔ یاد ہے نا تجھے کہ نہیں؟“ وہ خوشی کے عالم میں اوش

پٹانگ بولے جا رہی تھیں۔

”۲۶؎ امی! کل کی بات کون بھول سکتا ہے اور کیا نفس عورتیں تھیں وہ بھی۔ آپ نے کسی قدر دکھی انداز میں

میری طلاق کا قصہ سنایا اور انہوں نے نہ ہمدردی کی۔ نہ کوئی لفظ بولا۔ چائے پی اور خاموشی سے اٹھ کر چل دیں۔“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی ویسٹ

یہ ٹھکانہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم غائب کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڑیوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤن لوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیننگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ ہریم کوالٹی، نادرل کوالٹی، کپی رایت کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤن لوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤن لوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤن لوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہر ویب سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤن لوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

فوزیہ برے برے منہ بنا کر بولی۔
 ”وہ دونوں عورتیں حلیمے اور چروں سے بس اچھے گھر کی تھیں۔ شریف، کم گو اور کچھ سمجھی سی۔“ فوزیہ نے پرے کوفت کے عالم میں ان کی مدارات کی تھی۔ اور سچی بات اسے وہ دونوں عورتیں کچھ اچھی لگی بھی نہیں لگی تھیں اور کل سے ابھی تک اس نے ان کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔
 ”تم انہیں پسند آگئی ہو اپنے بیٹے کے لیے فوراً شادی کر لیں گی مہینے بھر کے اندر۔ کویت میں ہوتا ہے ان کا بیٹا۔ اسی ہفتے چھٹی پر آ رہا ہے۔ اس کے آتے ہی شادی کر دیں گی وہ۔ میرے اللہ! مجھے تو لگتا ہے میرا تو دل خوشی سے بند ہو جائے گا۔“
 ”نسیم ہوا فنی خوشی سے بے ہوش ہونے کو تھیں۔
 اور شادی مرگ تو جیسے فوزیہ پر بھی ہو گیا۔ اس کے تو گمان میں بھی یہ معجزہ نہیں تھا اور طلاق کا داغ لگنے کے بعد تو بالکل بھی نہیں۔ وہ یوں ہال کو دیکھتی رہ گئی۔ جیسے اسے ماں کے اس مذاق پر سخت غصہ آ رہا ہو۔
 ”میری بھی یہی حالت ہوئی تھی فوزیہ! جب اس غزالہ بن نے مجھ سے یہ کہا۔ سم سے مجھ سے تو بہت دیر تک کچھ بولا نہیں گیا۔ بول! ہے نا معجزہ؟ میری دعائیں اللہ نے سن لیں۔ آخری بیٹا ہے۔ جس کی شادی کرنی ہے اور سب سے بڑی بات وہ تجھے ساتھ لے کر جائے گا۔ ایک مہینے کی چھٹی کے بعد چلا جائے گا اور وہاں جاتے ہی تجھے بلا لے گا۔ فوزیہ۔۔۔ میری بیٹی کے اسے بھاگ کھلیں گے۔ میں نے تو کبھی سوچا نہیں تھا۔“ وہ اسے ساتھ لگا کر حٹ حٹ پیار کرنے لگیں تو فوزیہ بھی یقین کرتے ہوئے شرماسی گئی۔ اس نے بھی یہ سب کچھ سوچ کر رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں بہت دنوں بعد نئے خواب بننے لگیں۔ نسیم کیا بول رہی ہیں اب اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔



مثال بشری کے ساتھ لکھی گہری نیند سو رہی تھی۔
 ذکیہ رات کے وظائف ختم کرنے کے بعد مصلیٰ سیٹھی اٹھیں اور اندر آ کر دونوں پر دم کرتے ہوئے کچھ سوچنے لگیں اور پھر جیسے دل تھام کر بیٹھ گئیں۔
 ”میری بشری کی عمر ہی کیا ہے۔ اس اکتوبر میں انیس کی ہوگی۔ اس عمر میں تو لڑکیاں اپنے گھروں کی ہوتی ہیں اور اس کا گھر بس کراچی بھی گیا۔ کیا کرے گی میری بیٹی اب بانی کی عمر بھر۔۔۔ سچی کا ساتھ۔ میرے اللہ! رحم فرما میری بشری پر۔“ بے اختیار ذکیہ کا دل بھر آیا۔ بہت دنوں بعد تو انہیں یوں فرصت سے اس سانچے پر رونے کا موقع ملا تھا۔

باہر ڈور تیل زور سے بجی۔
 ذکیہ نے جلدی سے آنسو پونچھ لیے۔ عمران لاؤنج میں ہی لیپ ٹاپ لیے بیٹھا تھا۔ اٹھ کر دروازہ کھولنے چلا گیا۔
 ”کسی خیال کے تحت ذکیہ بھی اٹھ کر اس کے پیچھے چلی گئیں۔
 ”تو وہ تم ہو جس نے عدل صاحب کے گھر کے باہر سے ان کی کم سن بیٹی کو اغوا کیا ہے۔ گرفتار کرو اسے۔“ باہر سے آئی رعب وار آواز نے ذکیہ کے ہوش اڑا دیے۔

(بانی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو امیل لنک
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو پی ڈاؤن لوڈنگ کے ساتھ
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیننگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ نیریم کوالٹی، نادل کوالٹی، کمپیوٹرز کوالٹی
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ☆ عمران میریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

دعا دو ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ڈاؤن لوڈ کی جا سکتی ہے

← ڈاؤن لوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤن لوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤن لوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

رُحْسَانَةُ زِكْرَانِ



عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشری ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشری کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشری اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصطفیٰ بننا ہو سے نکاوت دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشری کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑا ہے۔ سب سے پہلے سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشری کی نند فوزیہ کا بالا آخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشری دو لہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشری کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشری اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو بتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشری اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں بتا چلتا ہے کہ بشری کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عغان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عغان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کواڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عغان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آرہے ہیں۔

فون پر پتا چلتا ہے کہ شہر آتے ہوئے عغان اور فاروق صاحب ذکیہ کی واردات میں قتل ہو گئے۔ عغان کے قریبی دوست ذہیر کی مدد سے عاصمہ عغان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ ذہیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔



اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقتولین کو دکھتا ہے۔ زاہدہ نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشری سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔ حمیدہ خالہ عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زیر کا اکیلے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں جبکہ عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آتا ہے کہ وہ انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔ رقم مہمانہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر سو اور اس کے گھر والوں کو مورد الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشری کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل طیش میں بشری کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا اپارشن ہو جاتا ہے۔ عدیل شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔

اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ زیر کے ہاتھوں لٹ جاتی ہے۔ خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آجاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو پتا چلتا ہے کہ زیر نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بند کر دیے ہیں اور اب مفور ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم عاصمہ کو ایک مکان دلایا پاتا ہے۔ بشری اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کر دیتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل سخت پریشان ہے۔ عدیل مکان کا اوپر والا پورشن بشری کے لیے سیٹ کروا رہا ہے اور کچھ دنوں بعد بشری کو مجبور کرتا ہے کہ وہ فوزیہ کے لیے عمران کا رشتہ لائے۔ نسیم بیگم اور عمران کسی طور نہیں مانتے۔ عدیل اپنی بات نہ مانے جانے پر بشری سے جھگڑتا ہے۔ بشری بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ عدیل طیش میں بشری کو طلاق دے دیتا ہے اور مثال کو چھین لیتا ہے۔ مثال بیمار پڑ جاتی ہے۔ بشری بھی حواس کھو دیتی ہے۔ عمران بہن کی حالت دیکھ کر مثال کو عدیل سے چھین کر لے آتا ہے۔ عدیل عمران پر اغوا کا پرجا کھڑا کرتا ہے۔ عاصمہ اسکول میں ملازمت کرتی ہے مگر گھریلو مسائل کی وجہ سے آئے دن چھٹیاں کرنے کی وجہ سے ملازمت چلی جاتی ہے۔ اچانک ہی فوزیہ کا کہیں رشتہ طے ہو جاتا ہے۔

گیاں پوئیں قید طلب

عمران انسپکٹر کی بات سن کر لمحہ بھر کے لیے جیسے گونگا ہو گیا۔ اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔
 ”اغوا؟“ اس کی سماعتیں ایک ہی لفظ کو سن کر جیسے مجھد ہو کر رہ گئی تھیں اور پیچھے کھڑی ذکیہ کا دل بھی ایک لمحے کو ٹھہر سا گیا تھا۔
 یہ تو ان میں سے کسی نے بھی نہیں سوچا تھا کہ عدیل یا نسیم بیگم اس حد تک بھی جاسکتے ہیں کہ وہ مثال کے اغوا کے کیس میں انہیں تھانے گھسیٹ لے جائیں گے۔
 ”او مسٹر! شور اتنے سے ہمیں گھر کی تلاشی لینی ہے۔“ انسپکٹر کے ساتھ موجود سپاہی نے عمران کو پتھر کا بت بنے کھڑے دکھا تو اس کو ذرا تحقیر آمیز لہجے میں کہہ کر جیسے ہوش دلایا۔
 ”کیوں۔ کیوں تلاشی لیں گے آپ؟“ وہ ایک دم سے بچ کر بولا۔
 انسپکٹر اور سپاہی نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ انسپکٹر نے جب سے سرچ وارنٹ نکال کر عمران کے آگے گروہے۔ ”ہمارے پاس تلاشی لینے کا اختیار ہے۔ خالی خولی رعب نہیں جمار ہے ہم۔ شور اتنے

”انسپکٹر نے اس کے ذرا اونگ لہجے میں کہا۔
 ”مگر کیوں کس لیے لینی ہے آپ کو تلاشی۔ میں نے۔ ہم نے کیا کیا ہے۔“ عمران اب کے ڈرے ہوئے لہجے میں ایک ایک کر بولا۔ پیچھے کھڑی ذکیہ حوصلہ کر کے آگے بڑھ آئیں۔
 ”مجھے بات کرنے دو بیٹا! کیا بات ہے۔“ ذکیہ نے خلاف مزاج لہجے میں انکساری عاجزی اور تھوڑا خوف سمو کر کہا۔
 ”خاتون! اپنی کے اغوا کا معاملہ ہے۔ ہم اپنی در آمد کرنے آئے ہیں۔“ انسپکٹر ذکیہ بیگم کو دیکھ کر تھوڑا موڈب ہو کر بولا۔

”یہ وقت ہے اس طرح کی تلاشی اور بازیابی کا؟“ عمران تلخی سے مگر دبے لہجے میں بولا۔
 انسپکٹر نے اسے گھور کر دیکھا جیسے کچھ سخت بولنے سے اس نے خود کو روکا ہو۔
 ”بیٹا! کیا ہم اندر بیٹھ کر بات نہیں کر سکتے۔“ ذکیہ لجاجت سے یوں بولیں جیسے ان سے بڑا معینی کوئی ہے ہی نہیں۔ سپاہی نے انسپکٹر کی طرف دیکھا۔
 ”ٹھیک ہے تم باہر کھڑے رہو۔ میں اندر جا کر بات کر کے آتا ہوں۔“ انسپکٹر نے سپاہی کو تاکید کی۔
 ”مگر ای!“ عمران اس چیز کے حق میں نہیں تھا کہ یوں جھک کر من من کر کے مذاکرات کیے جائیں۔ اسے معلوم تھا کہ ان مذاکرات کا نتیجہ کیا ہو گا۔ وہ وہیں گیٹ میں کھڑا رہا۔
 ”اندر آؤ عمران! میرے ساتھ۔“ ذکیہ حکم دے لہجے میں بولیں۔

عمران لمحہ بھر کھڑا بیچ و تاب کھاتا رہا۔ ایک کے بعد ایک بے سکون کر دینے والی بات۔ وہ جھنجھلا کر رہ گیا اور سپاہی کی موجودگی کی پروا کیے بغیر بہت بد تمیزی سے زور سے گیٹ بند کیا اور اندر چلا گیا۔
 عدیل پولیس کی گاڑی سے بہت فاصلے پر اندھیرے میں اپنی گاڑی کے پاس کھڑا بے چین نظروں سے گیٹ کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے امید تھی کہ کچھ دیر میں انسپکٹر مثال کو ساتھ لے کر آجائے گا اور وہ مثال کو اپنے گلے لگا کر فلاح بن کر واپس چلا جائے گا۔ معاملہ اب صرف مثال کی محبت کا نہیں تھا بہت کچھ جیتنے اور ہارنے کا تھا۔ اسے ہر صورت بشری کو نچاؤ دکھانا تھا۔

اسے بتانا تھا کہ وہ کتنا بڑا خسارہ اپنے بخت میں درج کرا چکی ہے۔ عدیل کی زندگی سے نکل کر اب اس کی زندگی میں صرف اور صرف بچا ہے دکھ جدائی اور ذلت!
 گھر کا گیٹ زور کی آواز کے ساتھ بند ہوا اور سپاہی سست قدمی سے چلتا پولیس وین کے پاس آ گیا۔

عدیل اور بھی بے چین ہو گیا۔
 ”اگر یہ کمینہ انسپکٹر اس ذکیہ کی لہجے دار باتوں میں آگیا اور اس نے اسے یونسی مثال کو دے بغیر بچ دیا تو یہ۔“ ایک رات کے لیے ہی سہی بشری اجیت جائے گی اور اسے بشری کی ایک رات کی جیت بھی گوارا نہیں تھی۔ وہ بے چین سا سپاہی کے پاس آیا۔
 ”انہوں نے بات کرنے کے لیے بلایا ہے انسپکٹر صاحب کو اندر ہمیں انتظار کرنا ہو گا۔“ سپاہی کی بات پر وہ خاموش ہو گیا۔

”پاپا۔ پاپا۔“ مثال نیند میں پکار رہی تھی۔ بشری کی آنکھ کھل گئی۔

”یہ ناممکن ہے۔“ عدیل انپکٹر کی بات سنتے ہی بھڑک اٹھا۔

انپکٹر نے اسے تیز نظروں سے دیکھا۔ اتنا تو اندازہ اسے ہو ہی گیا تھا۔ اس ایک گھر کے اجڑے میں زیادہ کس کا ہے۔

عدیل کی جذباتیت ان چند گھنٹوں میں اس پر عیاں ہو گئی تھی۔

”تو پھر آپ دوسری صورت حال کے لیے تیار رہیں۔“ انپکٹر بے تاثر لہجے میں بولا۔ عدیل نے کچھ پریشانہ کراہت سے دیکھا۔

حالانکہ اسے قطعی امید تھی کہ انپکٹر مثال کو ساتھ لے کر آئے گا مگر بشری کے گھر سے آنے کے بعد اسے سمجھانے لگا تھا۔

”واقعی یہ بشری کی ماں ایک جادو گرہنی ہے۔ ایسی ٹھیک کہتی ہیں بلکہ یہ بشری ابھی کیسے آوی کو سحر زدہ کر دیتی تھی میں کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“ نئے سرے سے اس کے دل میں بشری کے خلاف غصہ اٹھ گیا۔

اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ غصہ اب نارسانی اور بچھتاوے کا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ اپنی اذیت بڑھ ہی چلا جائے گا۔

”کیا مطلب۔۔۔ کیسی صورت حال؟“

”عدیل صاحب! اتنا قانون تو آپ بھی جانتے ہیں کہ اگر یہ معاملہ کورٹ میں چلا گیا تو پھر آپ کے لیے ہر مشکل ہو جائے گی۔“

انپکٹر اسے واضح الفاظ میں سمجھانے کے بجائے اشارتا بولا۔

”کیا ہو جائے گا پھر؟“ وہ ہر بات کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو چکا تھا۔

”بچی آپ کی سابقہ بیوی کو ہی ملے گی کیونکہ وہ ماں ہے ماں کا حق پہلے ہے دوسرے بچی ابھی چھوٹی ہے۔ اس کا بلوغت تک تو اسے ماں کے پاس ہی رہنا ہو گا اور شاید اس کے بعد بھی۔“

انپکٹر طارق نرمی سے اسے سمجھانے لگا۔

”تو کیا باپ کا کوئی حق نہیں؟“ وہ تلخی سے بولا۔

”قانون میں نے نہیں بنایا۔ اس لیے میں نہیں جانتا۔ ایسا کیوں کیا گیا ہے ایک باپ جو اپنی اولاد سے بہت محبت رکھتا ہو اس کے ساتھ قانون میں یہ زیادتی کیوں کی گئی۔ لیکن ظاہر ہے کچھ وجوہات ہوں گی جن کو ہم جذباتی انداز میں نظر انداز کرتے ہیں۔ سمجھنا نہیں چاہتے۔“ وہ کندھے اچکا کر بولا۔

”کیسی وجوہات؟“ عدیل اپنی تلخی اپنی جذباتیت چھپا نہیں پارہا تھا۔ دوسرے اسے لگ رہا تھا کہ مثال اس سے

ہمیشہ کے لیے چھن گئی ہے۔ انپکٹر بھی بشری کی ماں کے ساتھ مل گیا ہے اور اب اسے فضول باتیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس نے دل ہی دل میں اسی وکیل کے بارے میں سوچ لیا تھا جو اس کا بہت اچھا دوست بھی تھا اور شرکاء کا قانونی ماہر بھی۔

”جتنی بھی فیس ہو میں اسے دوں گا مگر مثال کو حاصل کر کے رہوں گا۔“ وہ دل میں پختہ عزم کر رہا تھا۔

”باپ کو روزگار کے لیے گھر سے باہر رہنا ہوتا ہے ایسے میں بچی یا بچے کی دیکھ بھال وہ کیسے کر سکتا ہے پھر بچہ

تو اور بھی نازک ہوتے ہیں۔“ انپکٹر اپنے دھیان میں کے جا رہا تھا۔ عدیل نا پسندیدہ نظروں سے عدیل کو دیکھنے لگا۔

”ان معاملات کو صرف ما میں ہی سمجھ سکتی ہیں اور سنبھال سکتی ہیں۔“ انپکٹر نے نرمی سے بات گویا ختم کر دی۔

”چھاتو میں اپنی بیٹی اس عورت کے حوالے کر کے بیٹھ جاؤں جس کے بارے میں میں جانتا ہوں، وہ میری بچی کا یہ خیال نہیں رکھ سکتی جیسا میں رکھ سکتا ہوں نہ اس کی وہی تربیت کر سکتی ہے جیسی میں چاہتا ہوں۔“ عدیل

نرمی سے بولا۔ ”میں خاموش نہیں بیٹھ سکتا یوں ہار نہیں مان سکتا۔ ہتھیار نہیں ڈال سکتا۔“ وہ کہتا چلا گیا۔

”وہ تو یہ بات ہے۔“ انپکٹر چونک کر بولا۔

عدیل نے بھی انپکٹر کی طرف سے دیکھا۔

”آپ کے نزدیک یہ صرف بچی کی کسٹڈی کا معاملہ نہیں آپ کی اپنا کی حیثیت، آپ کی ضد کا معاملہ ہے اور آپ دونوں کی اس جذباتی لڑائی میں آپ کی بچی کی نفسیات کس بری طرح سے متاثر ہو رہی ہے۔ آپ کو کوئی پروا نہیں۔“ انپکٹر کو لہجہ بھر میں غصہ آ گیا تھا۔

”میں جانتا ہوں مجھے اپنی بچی کی تمہیں تربیت کرنی ہے اس کے لیے اسے میری سرپرستی کی ضرورت ہے۔“ عدیل ذرا سنبھل کر بولا۔

”تو ٹھیک ہے، آپ خود یہ معاملہ حل کر لیں۔“ انپکٹر بے نیازی سے بولا۔

”کل ان کے وقت آئیے گا ہم آپ کا کیس فائل کر لیں گے۔ اس کے بعد قانونی کارروائی شروع ہوگی۔ اس کے مکمل ہونے میں کتنا عرصہ لگے گا اس کی ضمانت کسی کے پاس نہیں اور اس کے بعد یعنی اتنا روپیہ پیسہ اتنی اور وقت ضائع کرنے کے بعد بھی اگر بچی آپ کا نانا نہ حاصل کر سکے تو عدیل صاحب مجھے واقعی آپ کے ساتھ سخت ہمدردی ہوگی۔“ عدیل اسے دیکھتا رہ گیا۔

”کیا کروں پھر میں؟“ وہ بہت دیر بعد شکست خورہ لہجے میں بولا۔ انپکٹر اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ ایک ٹوٹا ہوا شکست خورہ انسان غصے نے جس کی زندگی اجاڑ کر رکھ دی ایک جلد باز نیچلے نے سب کچھ ختم کر دیا۔ انپکٹر کو عدیل پر ترس آیا۔

”آپ یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں۔ کل شام میں میرے پاس آئیے گا۔ میں آپ کی ضرورتوں کو گاہے میرا وعدہ ہے آپ سے۔“ انپکٹر نے اسے تسلی دی تو وہ کچھ بول بھی نہ سکا۔ بس خاموشی سے سامنے اندھیرے میں دیکھتا رہا کہ اب یہ اندھیرے اس کی قسمت کا بھی حصہ تھے۔



عدیل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس خبر پر خوش ہو۔ نہیں۔ رونے یا پھر وہاڑیں مارنے لگے۔

سب کا چہرہ خوشی اور جذبات کا عکاس بنا کھلا ہوا تھا۔ آنکھوں میں چمک ہونٹوں پر مسکراہٹ اور چہرے پر فتح کا احساس۔

وہ عجب سے احساسات سے دوچار ہو گیا۔

اسے لگا جیسے فوزیہ کی شادی کی خوش خبری نہیں سنی اس کے کندھوں پہ اس دنیا کا سب سے بھاری پہاڑ کسی زبان کی طرح آگرا ہے وہ بالکل غیر ارادتی طور پر ہولے ہولے اپنے کندھے دبانے لگا۔

نسیم بیٹے کو یوں گم نصم دیکھ کر پریشان سی ہو گئیں۔ انہیں تو اندازہ ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ عدیل اتنی بڑی بھاری خبری سن کر اتنا خوش ہو گا کہ اسے شادی مرگ ہو جائے گا۔

مگر اس کی اتاری ہوئی شکل اور یوں کندھے دباتے دیکھ کر نسیم واقعتاً پریشان سی ہو گئیں۔

”عدیل! میرے بچے! تم ٹھیک تو ہونا۔۔۔ تمہیں خوشی نہیں ہوئی یہ سن کر کہ تمہاری بہن کی اتنی اچھی بھاری خبر کی خبریت پوچھتے پوچھتے پھر اس خوش خبری کے زرا اثر آگئیں۔

”ٹھیک ہوں میں امی۔ خوشی ہے مجھے یہ سب سن کر۔“ وہ اتنا تھکا ہوا بولا جیسے میلوں میل دوڑ کر آیا ہو۔

”مثال کی وجہ سے پریشان ہے نا میرے بچے! جانتی ہوں تیری توجان ہے اس نسخہ پری میں۔ وہ ہے ہی انڈیا ایسا تحفہ کہ میں خود کل سے یوں پورے گھر میں بوللائی بوللائی پھر رہی ہوں جیسے میرے ہاتھوں سے کوئی نیتی چیز ہو گئی ہو۔“

باتیں بنانے کا اور ان میں الجھانے کا فن وہ بھی بر محل اس فن کو استعمال کرنا تو نسیم کو آتا ہی تھا مگر سامنے یا کی نبض پر ہاتھ رکھنے میں بھی وہ خوب خاتی تھیں۔

”دل ایسا اداس اور پریشان ساسے وہ ضدی بشری اڑتی نہ تم سے یوں بد زبالی کرتی نہ یہ سارا معاملہ بگڑانہ دلو یوں تم سے۔۔۔ مطلب ہم سے اپنے گھر سے بچھڑی۔“

وہ آنکھوں کو دوپٹے کے پلو سے پونچھنے لگیں۔

عدیل بے تاثر چہرے لیے بیٹھا رہا۔ وہ جو کچھ اب کہہ رہی تھیں۔ اس کا خیال تو اول شب ہی عدیل کے دل کے کچوکے لگانے لگا تھا۔

اسے اعتراف کرنے میں اقرار کرنے میں صرف ایک مردانگی کی جھک آڑے آرہی تھی ورنہ وہ ابھی ماں کے منہ پہ بر ملا کہہ دیتا کہ وہ بشری کو طلاق دے کر بچھڑتا رہا ہے۔ وہ ماں کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رہنا چاہتا تھا۔

بچے کی طرح رو کر اس سے ضد کرنا چاہتا تھا کہ کسی بھی طرح کوئی صورت نکال کر وہ اس کا من پسند کھلوتا داپا لے آئے۔ نسیم تو کسی بھی طرح سے کوئی بھی حل نکالنے میں باگمالی تھیں۔

مگر وہ ماں سے یہ سب بول نہیں سکا۔

”کہاں جا رہے ہو عدیل؟“ اسے یوں رہنا کچھ کے اٹھ کر جاتے دیکھ کر نسیم کچھ بوکھلا سی گئیں۔

اس وقت انہیں عدیل کی مکمل تائید چاہیے تھی۔ اس کا یہ گم نصم رویہ اور ڈھکی چھپی تائید!

جو بھی تھا۔ فوزیہ کی شادی کا سارا بار تو عدیل نے ہی اٹھانا تھا اور اب جو وہ ایسے ذہنی و قلبی بحران کا شکار تھا کھلے دل سے ہا ہی بھر سکتا تھا سوا سے بڑے پیار اور طریقے سے اس طرف لے کر آتا تھا کہ اسے ذرا بھی نہ لگے۔ اس کی ماں بہن مطلبی ان خود غرض اور بے حس ہیں۔

”امی! میں کمرے میں ہوں۔ کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

”میرے بچے! کیلے کمرے میں جا کر کیا کرو گے اور دل برا کرو گے۔ وہ تو اپنا گھریلوں لات مار کر اجاڑنی کہ لگا عورتوں کو صرف اپنی خواہشوں سے مطلب ہوتا ہے۔ پوری رہتی نہیں تو وہ خوش نہ ہوں تو۔۔۔“

”امی پلیز۔ میرے سر میں درد ہے کچھ دیر ریسٹ کروں گا۔“ اب وہ بشری کے بارے میں کچھ بھی سننا نہیں

ہو سکتا تھا۔ سن کر وہ کرتا بھی کیا کہ ان باتوں کا ما حاصل تو بشری کو یہاں سے ہمیشہ کے لیے دفنان کرنا تھا سو وہ ہو چکی

تھی۔ ”میرے بچے! ادھر میرے پاس ہی لیٹ جا۔ میں تیرا سر دبا دیتی ہوں۔ فوزیہ! چائے کے ساتھ کوئی گولی لے آتی

ہے۔ اکیلے کمرے میں جا کر اور دل برا ہو گا۔“ وہ اس کو پیار سے ہلانے لگیں۔

”نہیں امی میں سونا چاہتا ہوں کچھ دیر۔“ وہ جان چھڑانے کو بولا ورنہ وہ آج تک کبھی آفس سے آکر بستر نہیں

یا تھا۔ شادی سے پہلے وہ فوزیہ اور نسیم سے گپ شپ کرتا تھا اور شادی کے بعد بشری کے ساتھ کہیں نہ کہیں

آنٹنگ پہ یا شاپنگ پہ نکل جاتا تھا کیونکہ اسے شام کے وقت بستر پر دنا سخت ناپسند تھا۔

”پر عدیل۔۔۔ مجھے بات کرنی تھی تم سے۔ وہ لوگ مہینے بھر کے اندر شادی کرنا چاہتے ہیں تو میں کیا جواب دوں

انہیں؟“ وہ پریشان ہو کر اصل مدعا پر آئی گئیں۔

”امی! آپ ان سے کہہ دیں۔ جب چاہیں تاریخ نکھنے آجائیں۔ ہماری طرف سے کچھ دیر نہیں ان شاء اللہ

سب کچھ ہو جائے گا۔ آپ بھی فکر مند نہ ہوں۔“ وہ کہہ کر لہجہ بھر کو بھی نہیں رکا کہ نسیم پھر سے اسے کسی بات میں

ز الجھائیں۔

نسیم اسے ڈھیر ساری دعائیں دینا چاہتی تھیں اور وہ بھی رہی تھیں مگر جانے کیوں عدیل کو پہلی بار اپنی ماں کی

بداہل میں کسی دکان دار کی سی خصلت محسوس ہوئی جیسے کوئی پیشہ ور بھکاری زیادہ بھیک کے عوض ان گنت

دعائیں دیتا ہی چلا جاتا ہے۔

”مجھے اپنی ماں کے بارے میں اتنے گھٹیا انداز میں نہیں سوچنا چاہیے۔“ اس نے اپنی سرزنش کی۔

مگر دل۔۔۔ یہ بے گل دل بہت ہی پریشان تھا۔

کچھ دیر میں ڈسپنسر طارق نے ذکیہ اور بشری سے بات کرنے کے بعد اس کی طرف آنا تھا کہ وہ دونوں مثال کا

ماملہ کیسے حل کرنا چاہتی ہیں۔

دوسری الماری میں عدیل کے سارے کپڑے ترتیب سے استری کیے ہوئے تھے۔ تمہ پرانے تھے۔ نیچے جوتوں کے ریک میں اس کے سارے پائش شدہ چمکتے جوتے اور دراز میں دھلی ہوئی جرابوں کے جوتے۔ تمہ بہ تمہ ساتھ پڑے تھے۔

اسے یکدم خود سے بے تحاشا نفرت محسوس ہوئی۔ اتنا خیال رکھنے والی، اتنا پیار کرنے والی، گھر کو سنوارنے والی زندگی کو ڈسپلن کے تحت جیسا عدیل چاہتا تھا وہی ہی شکل دینے والی بیوی کو اس نے کس طرح ایک لایعنی ضد میں آکر خود سے کاٹ پھینکا۔ کیا اس کی زندگی دوبارہ سے کبھی اس قرینے میں ڈھل سکے گی۔ اسے ایک نیا خیال ستایا۔

یہ سلیقہ قرینہ جو اس کے لیے زندگی کا لازمی جزو ہے۔ اس کے بغیر وہ خوش نہیں رہ سکتا۔۔۔ اور خوش تو وہ اب کبھی بھی نہیں رہ سکے گا۔ اتنا اسے اندازہ ہو چکا تھا۔

وہ تھکا ہوا دھول سے اپنی بیڈ شیٹ پر گر سا گیا۔ فوزیہ کی شادی کس طرح چند دنوں میں طے ہو گئی جس کی وجہ سے اس نے ماں، بہن کے کہنے میں آکر مشتعل ہو کر اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنایا اور نتیجہ یہ اجاڑ کر دیا! اس کا نقصان اس کا خسارہ ناقابل تلافی تھا۔

بے اختیار اس کی آنکھیں بھر آئیں اور بہت دنوں بعد ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور روتا ہی چلا گیا۔

شاید وہ کچھ دیر اور روتا اگر اس کا سیل فون نہ بچا اٹھتا اس نے سیل پر آنا نہیں دیکھ کر بمشکل خود کو سنبھالا۔ انسپکٹر طارق کی کال تھی۔ وہ بشری اور ذکیہ سے بات کر چکا تھا اور آدھے گھنٹے میں اسے آکر ملنے کو کہہ رہا تھا اس نے ہامی بھر کر فون بند کر دیا۔

اگرچہ اس نے انسپکٹر سے پوچھا بھی کہ ان دونوں نے کیا کہا اسے جانے کیوں دھڑکا تھا کہ بشری اب کبھی بھی مثال کو واپس نہیں کرے گی۔ وہ اب کبھی مثال کی شکل نہیں دیکھ سکے گا۔

جانے کیا اس کے جی میں آیا اس نے بشری کا نمبر ملا لیا۔ بشری اپنا سیل فون اپنا بیگ سب کچھ تو بیس چھوڑ گئی تھی مگر اس نے یا عمران نے بعد میں اس کے فون کی ہم نکلوالی بھی اس کا نمبر آن تھا۔ فون کی کھنٹی بجے جا رہی تھی، مگر کسی نے فون نہیں اٹھایا۔

اسے بھی عجیب ضد سی ہو گئی وہ فون کرتا چلا گیا۔ آخر میں دوسری طرف سے سیل آف کر دیا گیا۔ اسے یوں لگا بشری نے اس کے منہ پر طمانچہ مار دیا ہو بالکل غیر شعوری طور پر اس نے اپنے گال پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ اب مجھے کبھی مثال سے ملنے نہیں دے گی۔ اس کے دل کا یہ گمان پختہ ہو گیا۔ جو سلوک وہ بشری کے ساتھ کر چکا تھا اس کے بعد وہ بھی رعایت کا مستحق نہیں تھا۔ وہ یوں ہی آنکھوں پر بازو رکھ کر لیٹ گیا۔

”ہما! آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔“ واثق ماں کی بات سن کر ایک دم سے پریشان ہو گیا۔ عاصمہ اب اور بھی تیزی سے روٹیاں پکھا رہی تھی۔

اس نے یوں ظاہر کیا جیسے اس نے واثق کی کوئی بات ہی نہ سنی ہو۔ ”خدا اور جا کر چیخ کرو، روٹیاں پک گئی ہیں، دیکھو جا کر دونوں نے کپڑے تبدیل کر لیے ہیں تو ان سے کوئی آکر نہ رہیں دسترخوان بچھا کر۔“ عاصمہ مصروف انداز میں کہتی چلی گئی۔ واثق یوں ہی کھڑا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ماں کو اب کس طرح اپنے سوال کا جواب دینے کے لیے آمادہ کرے۔ وہ کشمکش میں ماں کو بجلی کی سی تیزی سے کام کرتے دیکھتا رہا۔

”واثق! کھڑے کیوں ہو۔ جاؤ ناں۔“ وہ اسے یونہی کھڑے دیکھ کر اب کے ذرا سختی سی بولی۔ ”مگر ماما! مجھ سے تو علی نے کہا تھا کہ اس کے ماموں آئی کا بالکل فارمل سائنٹریڈولیس گے اور آپ کو اپنا سنٹ کریس گے تو پھر انہوں نے کیوں نہیں جا ب دی آپ کو؟“ اس نے ماں کے سخت لہجے کو بھی نظر انداز کر کے بہت ٹھوس لہجے میں بولتے اپنا سابقہ سوال دہرایا تھا۔

عاصمہ کو جی بھر کر غصہ آیا۔ یہ چھوٹا سا لڑکا اکثر اسے کیسے لاجواب کر دیتا تھا۔ اس کا جی چاہا، واثق کو کس کر ایک ٹھپڑ نکلانے۔

لیکن واثق جیسا بچہ تھپڑ سے بھی مطمئن ہونے والا نہیں تھا۔ عاصمہ جانتی تھی۔ ”تم چیخ کرو۔ کھانا کھاؤ تو پھر میں تمہیں سببتاتی ہوں۔“ اب ذرا طریقے سے اس کے سوالوں کا جواب مہیا کرنے کے سوا عاصمہ کے پاس اور کوئی انتخاب نہیں بچا تھا سوز انری سے بولی۔

واثق نے ماں کے چہرے پر سچائی کو تلاش کیا کہ وہ اسے کتنا تشفی بخش جواب دے گی۔ مگر وہ کچھ زیادہ نہ جان سکا کہ تھا تو ابھی بچہ ہی۔ بہت زیادہ چہرہ شناسی اسے ابھی نہیں آتی تھی اگرچہ آج کل اس کا پسندیدہ مشغلہ ہی اس فن کو سیکھنا تھا۔

باپ اور دادا کی بے وقت موت نے اسے اس فن میں دلچسپی لینے پر مجبور کیا تھا۔ اس نے غور کیا تو اسے پتا چلا تھا کہ ان سے ملنے والے ان سے ہمدردی کرنے والے زیادہ تر لوگ دل میں ان کے لیے ویسے ہمدردانہ جذبات نہیں رکھتے جیسا وہ اپنے منہ سے اس کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں وہ یہ سمجھ گیا تھا کہ زیادہ تر لوگ دو چہروں والے بلکہ کئی چہروں والے ہوتے ہیں۔ اس لیے اسے بہت ہوشیار رہنا چاہیے۔

عاصمہ جلدی جلدی سالن نکالنے لگی، واثق سست قدموں سے اندر جا چکا تھا۔ ”یہ بچہ بہت مشکل ہے اور اس سے جھوٹ بولنا بھی آسان نہیں۔ وہ علی کے ذریعے میرے کسی بھی ایسے ایسے جھوٹ کا پتا لگوا سکتا ہے جبکہ اس کا ماموں بہت خواہش مند ہے مجھے جا ب دینے کے لیے۔“ عاصمہ اب اس کے جلتے شعلوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

ان شعلوں میں اسے ایک دم ہی زہیر کا ساہ ساہے ریا چہرہ اور مکار آنکھیں نظر آئیں جن پر شروع دنوں میں اس نے بالکل بھی غور نہیں کیا تھا۔

اس کے چہرے کے ساتھ علی کے ماموں نعیم کا چہرہ ابھرنے لگا۔

ایسا چہرہ جس پر بہت ہمدردی، مہمت اور خوش اخلاقی تھی مگر اس کی آنکھوں میں ایسی بھوک تھی جس کی ضرورت سے نشانی نہیں ہو سکتی تھی اور شاید کبھی ہو بھی نہیں سکتی تھی۔

عاصمہ کے اندر سیٹ پر بیٹھے ہی خطرے کی گھنٹی ٹن ٹن بج اٹھی تھی پھر بھی اس نے محتاط انداز میں اس ٹھکر کے سرسری سوالوں کا جواب دیتے ہوئے ٹھوڑا مارجن نکالنے کی کوشش کی۔

”ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو۔“ اس نے پھر سے ہمت کر کے اس شخص کی آنکھوں میں دیکھنا چاہا۔

اس کی ریڑھ کی ہڈی میں وہی کرنٹ بھری لہر گزری کہ وہ کیا کہہ رہا تھا اس کی سماعتیں سن ہی نہ سکیں۔

ایک شان دار ریشمش سخاوا کاہن کج!

ساتھ میں میڈیکل فری اور مہینے میں عام تعطیلات کے علاوہ دو چھٹیوں کی سہولت اور بوقت ضرورت ایڈوائس تنخواہ آرہی بھی مل سکتی تھی۔

عاصمہ جیسی ضرورت مند عورت کے لیے ایڈیل جاب! مگر اس کی آنکھیں! وہ سخت کشمکش میں مبتلا رہی۔ نعیم نے اس کی سی وی کی فائل عاصمہ کے آگے ڈرا سی کی عاصمہ نے غیر ارادی طور پر فائل اپنی طرف کرنے کے لیے ہاتھ فائل پر رکھا اور اس نے یونہی پین ہاتھ سے گرایا اور اٹھاتے ہوئے عاصمہ کے ہاتھ کو بہت نرمی سے دبا کر ایک دل فریب مسکراہٹ لبوں پر سجالی۔ عاصمہ کے لیے فیصلہ آسان ہو گیا۔

وہ سیٹ سے کھڑی ہو گئی۔ فائل وہ کھینچ چکی تھی۔ صاف انکار کرتے ہوئے اس نے اس شخص کی آنکھوں میں جو اضطراب اور بے چینی دیکھی وہ متوقع تھی مگر اس سے بھی بڑھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

”مگر آپ کو تنخواہ کم لگ رہی ہے تو میں اس کو ڈبل بھی کر سکتا ہوں صرف علی کی وجہ سے اور آپ جس طرح ضرورت مند ہیں، مطلب اپنے بچوں کے لیے محنت کرتے ایک آبرو مندانه زندگی کی خواہش مند ہیں تو۔“ اسے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔

سوا ایک اور شان دار آفر کرتے ہوئے بولا۔

”نعیم صاحب! یہ میری خواہش تو ہے کہ میں ایک آبرو مندانه زندگی اپنے بچوں کے ساتھ گزار سکوں لیکن ایسا ہونا آسان نہیں اور یہ زمانہ یہ تو بالکل بھی ایسا نہیں چاہتا اور ہر خواہش پوری ہو آدی کی یہ بھی ممکن نہیں۔“ اس سکون سے طنز کے تیر چلا کر بولی کہ اسے کسی بات کا خوف نہیں تھا اسے یہاں جاب نہیں کرنی تھی۔

”میں ہوں نا آپ کے ساتھ“ آپ کی سب خواہشات میں پوری کر دوں گا وعدہ کرتا ہوں آپ سے۔ آپ بیٹھ کر بات تو کریں مجھ سے۔ بہت راستے ہیں۔“ وہ سیٹ چھوڑ کر اس کے پاس آتے ہوئے بے قرار ہو گیا تھا۔

”جانتی ہوں۔ اندر آنے کے بہت سے راستے ہوں گے لیکن باہر جانے کا صرف ایک ہی راستہ ہے خدا حافظ۔“ وہ کہہ کر اس کے قریب پہنچنے سے پہلے دروازے کھول کر باہر نکل گئی۔

وہ اسے پیچھے سے بڑا تارہ گیا۔

وہ ملے کر چلی تھی کہ اسے مڑ کر نہیں دیکھنا۔

وہ واقع کو بہت واضح الفاظ میں تو نہیں مگر ڈھکے چھپے الفاظ میں سمجھا گئی کہ اسے صرف جاب نہیں چاہیے ایک عزت بھری زندگی بھی چاہیے جس میں تحفظ ہو اور سب سے بڑھ کر شرافت ہو۔

واقع کیا سمجھا کیا نہیں لیکن اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا وہ واقعی ایک سمجھ دار بچہ تھا۔ عاصمہ نے خود سے فرض کیا اور ڈٹھ کر بچوں کی بکھری ہوئی چیزیں سمیٹنے لگی۔ اگرچہ دل سخت مضطرب اور بے قرار تھا کہ ابھی کتنا

کرائے دار نہیں آسکا تھا۔

جیدہ خالہ اپنی بہن کے پاس ایک ماہ کے لیے کوئٹہ چلی گئی تھیں۔ ہاشم کی نوکری کا کوئی مسئلہ چل رہا تھا۔ وہ ریشمان تھا اس لیے عاصمہ کا خود بھی جی نہیں تھا کہ وہ بھائی کو پریشان کرے مگر وہ اب کیا کرے گی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”کیا؟“ عدیل جیسے سنتے ہی کہتے ہیں آگیا۔

”میں نے سمجھایا ہے ان لوگوں کو۔ مگر۔“ اسپیکر کچھ بے بسی سے بولا۔

”تو ٹھیک ہے اگر وہ کورٹ میں جانا چاہتے ہیں تو یونہی سی۔ میں یہ کیس لڑوں گا اور اپنی آخری سانسوں تک مجھے ہار نہیں ماننی۔ اپنی بیٹی کو حاصل کر کے رہوں گا۔“ وہ سخت غصے اور اشتعال میں آگیا۔

وہ کیا کرتا۔ مثال میں جیسے اس کی جان انکی تھی۔ دو دن سے وہ اس کو دیکھ نہیں پایا تھا۔

وہ بیٹی جس کو وہ اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا تھا۔ رات کو اپنے ساتھ ہی سلاتا تھا۔ وہ تانی کے گھر جاتی تو وہ آفس سے سدھا اس سے ملنے پہنچ جاتا۔

اور اب پورے بائیس گھنٹوں سے وہ اسے نظر نہیں آئی تھی۔

”تم فکر نہیں کرو۔ میں نے بات کی ہے سمجھانے کی کوشش بھی کی ہے۔ تمہاری سابقہ مسز تو کسی صورت بیٹی کو دینے کے لیے تیار نہیں مگر تمہاری ساس نے مجھ سے ٹائم لیا ہے کہ اس دوران۔ وہ بیٹی کو سمجھانے لگی تو ایک بار پھر بات کر لیں گے۔“

اسپیکر نے عدیل کا غصہ دیکھ کر قدرے نرمی سے کہا۔

”میں جانتا ہوں! وہ نہیں مانے گی۔“ عدیل کو بشری پر اتنا شدید غصہ آ رہا تھا کہ جی چاہ رہا تھا ابھی جا کر اس ضدی ہٹ دھرم عورت کا گلہ دبا دے۔

”نہیں عدیل! ایسا نہیں ہے۔ میں نے تمہاری ساس کی باتوں میں کافی لچک محسوس کی ہے۔“ اسپیکر پر امید تھا۔

”کیا مطلب؟“ عدیل اس کی بات سے کچھ چونکا۔

اسپیکر کچھ دیر خاموش رہا کہ عدیل کو اس بات کا کیا مطلب سمجھائے۔ اسے خود بھی امید کم تھی۔ مگر تھی۔

”جو بھی ہے وہ ماں ہے بشری کی۔۔۔ اس نے ان چار پانچ دنوں میں بہت کچھ سوچا تو ہو گا۔ اس لیے وہ کچھ ٹائم لے رہی ہے۔“ وہ رک رک کر بولا۔

”یار! میں ابھی بھی نہیں سمجھا۔ کیا مطلب ہے اس بات کا۔“ عدیل زچ ہو کر بولا۔

وہ تو بس چھٹ سے مثال کو دیکھ لینا چاہتا تھا۔ ایک بار اسے گلے سے لگا کر خوب پیار کرنا چاہتا تھا۔ وہ بیمار تھی جب اسے عمران یہاں سے لے کر گیا تھا۔ اب وہ کیسی تھی بہتر تھی یا ویسی ہی وہ دیکھنے کے لیے بے چین تھا۔

”یار! کچھ ہونا ابھی تمہاری بیٹی بھی بہت چھوٹی ہے اور تمہاری۔ مسز سابقہ۔ ظاہر ہے اس کی ماں اسے ساری عمر گھر میں تو نہیں بٹھائے گی۔ اس کے داغ میں بھی ان چار پانچ دنوں میں بہت کچھ چلا ہو گا۔ اس نے بیٹی کے مستقبل کے متعلق بہت کچھ سوچا ہو گا۔“

اسپیکر طارق کی بات نے جیسے گردش کرتی کائنات روک دی۔ عدیل کا دل بھی جیسے تھم سا گیا۔

ایسی بات تو اس نے ان چار پانچ دنوں میں ایک لمحے کے لیے ایک ٹا کے لیے بھی نہیں سوچی تھی۔
بشری کسی اور کی۔ ناممکن۔

وہ عجیب سی نظروں سے انیسکڑ کو دیکھے گیا۔
”میرے دوست! یہ دنیا ہے اور یہاں زندگی گزارنے اور اسے چلتے رہنے کے لیے ان ہی سلسلوں کی ضرورت ہے اس کے بغیر یہاں سروایو کرنا بہت مشکل ہے۔“ وہ مبہم سی بات کر کے کھڑا ہو گیا۔
”انتظار کرو ان شاء اللہ بہت اچھا ہو گا جو بھی ہو گا۔“ وہ اسے تسلی دے کر جانے لگا۔
”اور کتنا انتظار کرنا ہو گا مجھے۔ میں اپنی بیٹی سے ملنا چاہتا ہوں۔“ وہ بے قرار ہو کر بولا۔
”صرف ایک دو دن ٹھہراؤ ان شاء اللہ کسی نہ کسی نتیجے پر ہم پہنچ جائیں گے۔ تھوڑا سا صبر کرنا ہو گا اور وہ بلیکس ہو جاؤ۔ خود کو اتنا نہ تھکاؤ تمہاری بیٹی تمہیں ہی ملے گی۔ اسے دنیا کی کوئی طاقت تم سے دور نہیں لے جاسکتی۔“ وہ اس کا کندھا۔ پتھرتا کر اسے تسلی دیتا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
دونوں ایک ریستورنٹ میں ملے تھے۔ انیسکڑ طارق اجازت لے کر چلا گیا عدیل وہیں بیٹھا رہا۔ ایسا لگ رہا تھا اسے کہیں بھی نہیں جانا ہے۔

”گھر۔ گھر جا کر کیا کرتا۔ خالی گھر۔ خالی کمرہ۔ خالی دل!“
وہ بونسی بیٹھا اور گرد خوش گہیوں میں مصروف تھقے لگاتے نہ تھکنے والی باتوں اور نہ رکنے والی گفتگو کرتے آتے جاتے لوگوں کو ایک ٹکڑے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔

لوگ کیسے اتنا خوش رہ لیتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی سے جڑے اور بندھے۔ ایسے رشتے جن کے ٹوٹنے کا خوف نہیں۔
صرف ایک ہفتہ قبل تک وہ بھی تو ان ہی لوگوں جیسا تھا ہنستا مسکراتا نہ تھکنے والی گفتگو کا حصہ بنا خوش باش خاندان کا حصہ۔

ایک ضد۔ ذرا سی دیوانگی نے سب کچھ ختم کر ڈالا۔
اس کے ہاتھ کیا آیا۔ یہ سوتا پن اور خالی زندگی۔ اور بشری! جب کسی اور کی ہو جائے گی۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔

اسے لگا کسی نے اس کے دل پر گھونسا مارا ہے۔ بشری کسی اور کی۔ ناممکن۔
مگر وہ طلاق کا وہبہ ماتھے پہ سجائے تا عمر تو پیشی نہیں رہ سکتی۔ ابھی پانچ ماہ پہلے تو اس نے بشری اور مثال کے ساتھ مل کر اس کی انیسویں سالگرہ منائی تھی اور وہ جتنی خوش لباس نازک اندام تھی۔ کہیں سے بھی پتلیں چھبیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔

”تو۔“ اس کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکنے لگا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر چلا گیا۔

”نہیں امی۔ یہ ممکن نہیں۔ کسی بھی صورت نہیں۔ میں مروت ہو سکتی ہوں۔ مگر اس کے حوالے اپنی بیٹی نہیں کر سکتی۔“ بشری ضدی لہجے میں بچوں کی طرح زور سے سر ہلاتی ہمتی چلی گئی۔
ذکیہ بے بس سی اس ضدی بیٹی کو دیکھتی۔ چلی گئیں جس نے آج کل ماں کی ایک نہ ماننے کی قسم کھالی تھی گویا۔
”حوالے کرنے کو کون کہہ رہا ہے بشری؟“ ذکیہ نری سے بولیں۔
”کچھ بھی کہیں۔ یہ میرے لیے ممکن نہیں۔“ وہ اسی ہٹ دھرم لہجے میں سر جھٹک کر بولی۔

”تم ابھی کچھ بھی نہیں سمجھ رہیں نہ سوچ رہی ہو۔“ ذکیہ نے گرا سا ناس لے کر قدرے مبہم انداز میں کہا۔
”ابھی مطلب؟“ ماں کے لہجے نے بشری کو کچھ چونکا دیا۔

”ابھی کہو گی امیلی اس بچی کے ساتھ۔“ وہ لہجہ بھر خاموش رہ کر بولیں۔ بشری نے چونک کر ماں کو دیکھا۔
وہ ذکیہ کی بات بالکل سمجھی نہیں سمجھی تھی۔

”امی! ابھی کہنا چاہتی ہیں آپ؟“ وہ کافی دیر تک ذکیہ کے خاموش رہنے پہ بولی۔
”مثال ابھی چھوٹی ہے۔ اسے تمہاری اور باپ دونوں کی محبت بھی چاہیے اور توجہ بھی اور تم یہ تو مانو گی۔ مثال کو عدیل سے بڑھ کر کوئی پیار دے سکتا ہے نہ توجہ اور نہ۔“ ذکیہ بشری کی تیز نظروں سے خائف ہو کر ایک دم سے چپ کر گئیں۔

”اور نہ اسے آگے کیا کہنا چاہتی ہیں آپ۔“ وہ تیکھے پن سے بولی۔
”جتنے منگے اسکول میں وہ پڑھ رہی ہے جتنے منگے وہ پڑھے جو تے کھلونے جن سے وہ کھیلتی ہے۔ فرمائش کرتی ہے۔ وہ سب صرف عدیل جیسا باپ ہی پوری کر سکتا ہے۔“ ذکیہ نے رک رک کر بشری پر کچھ صحت حال واضح کرنے کی کوشش کی۔

”امی! بشری پر تو جیسے صدے کا پھاڑ ہی ٹوٹ پڑا“ میری مثال۔ اس کا کھانا پینا۔ پہننا اور ڈھننا۔ اس کا اسکول آپ پر ابھی سے بوجھ بن گیا۔ ابھی سے۔“ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس کے آنسو بہتے ہی چلے گئے۔

”بشری! میری بچی! میرا یہ مطلب نہیں ہے۔“ ذکیہ اس کے آنسوؤں سے ایک دم گھبرا کر رہ گئیں۔
”بس امی۔ میں سب سمجھ گئی ہوں اور صاف بات ہے۔ پہلے بھی آپ کو میرے بسے اجڑنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی آپ کو صرف بیٹے سے پیار ہے۔ اسی کو بچانے کے لیے آپ نے میرا گھر اجاڑ دیا۔ آپ فکر نہیں کریں میں مثال کو لے کر چلی جاؤں گی کچھ دنوں میں یہاں سے۔ وہ آنسو صاف کرتی غصے میں بولتی اٹھ کر چلی گئی۔
ذکیہ پریشان سی بیٹھی رہ گئیں۔

”امی! بھائی کبھی نہیں مانے گا میں جانتی ہوں۔ اس مثال میں تو اس کی جان ہے۔“ فوزیہ نے بڑے سوٹ کیس میں بڑے شادی کے لیے جمع کیے ہوئے سامان کو نکالتے ہوئے کہا۔

”ارے تو کیا ضرورت ہے خواہ مخواہ کا دم چھٹلا ساتھ لگانے کی اور وہ بالشت بھر کی لڑکی ہاں جیسی ہو شیار ہے باپ کو عمر بھر مٹھی میں رکھے گی یہاں رہے گی۔ باپ کے پاس تو اسے کچھ اور سوچنے نہیں دے گی۔“ سیم زہر خند لہجے میں بولیں۔

اور یہ تو ان کی منشا کے عین مطابق ہو گیا تھا کہ عمران مثال کو زبردستی لے گیا تھا اور نہ عدیل خود سے تو اسے کبھی نہیں بھیجتا۔

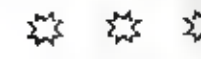
”دنگرائی! بھائی کو کیسے سمجھائیں گی؟“ فوزیہ نے خود کو بہت صفائی سے اس سارے معاملے سے الگ کر لیا تھا۔
پولہ بھی جب سے اس کی خالد سے فون پر بات ہوئی تھی وہ ایک بار ماں کے ساتھ گھر چکر بھی لگا گیا تھا۔
اگرچہ فوزیہ خالد کو دیکھتے ہی لمحے بھر کو بھڑکی تھی۔ ماں سے خفا بھی ہوئی تھی۔ خالد کا رنگ بھی پکا تھا اور عمر بھی دیکھتے میں اچھی خاصی لگ رہی تھی پھر سر پر بال نہ ہونے کے برابر۔
فوزیہ یہ تو جیسے سکتے میں چلی گئی۔

ہستے ہوئے خالد کی پوری ہنسی بھی باہر آجاتی تھی اگرچہ قد و قامت کافی حد تک معقول تھا مگر یہ تین چار خامیاں ہی اس کا دل توڑنے کے لیے کم نہ تھیں۔
 ”امی! میں۔۔ خالد سے ملی ہیں آپ؟ اس کی عمر اس کا پکارنگ گنجانا سراسر۔۔۔“ وہ ان کے جاتے ہی رو ہانسی ہو کر بولی۔

اور نسیم نے فوزیہ کے ہونٹوں پر زور سے انگلی رکھ دی تھی۔
 ”ایک لفظ منہ سے نہ نکالو یہ اللہ نے تیرے لیے آخری موقع بھیجا ہے سمجھ معجزہ بنا کر ورنہ طلاق کے بعد اور اتنی عمر ہو جانے کے بعد سچ فوزیہ! میں تو دل چھوڑ بیٹھی تھی کہ اب میرے جیتے جی تو نہیں تیرے ہاتھ پیلے نہیں ہونے والے اور میں اپنے سونے رب کے صدقے جاؤں کیسے اس نے مجھ کو وہ بے کس کی سن لی۔ اب تو نے ایک حرف منہ سے نہیں نکالنا۔ بس شکر کر اپنے رب کا۔“

نسیم کا بروقت ٹوکن فوزیہ کو بھی بہت کچھ بنا گیا۔
 ہاں۔ طلاق سن جانے کے بعد کہاں ممکن تھا۔ اسے کوئی دوا جو دو چار بال بچوں والی یا رتدو اس کے علاوہ کوئی رشتہ مل جاتا۔

خالد کی تو صرف عمر زیادہ تھی، ذرا شکل کم تھی۔ رنگ پکا تھا، بال کم تھے تو کیا ہوا۔ اس کے پاس درہم تھے۔ اچھا دل تھا اور خوب صورت احساس۔
 اس کا اندازہ اسے فون پر خالد سے بات کر کے ہوا۔
 اور پھر وہ سب کچھ بھول گئی۔ صرف مہینے بھر میں ہونے والی رخصتی کے دن گننے لگی تھی۔



”کل وہ تاریخ رکھنے آرہے ہیں اور ہمارے گھر میں کوئی تیاری ہی نہیں۔ دیکھو تو ہم عدیل کو کچھ بتا ہی نہیں، فکر نہیں کہ گھر بھی جانا ہے وہاں بھی کوئی کبخت بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہے۔“ نسیم جوڑے الٹ پلٹ کرتے ہوئے بڑبڑانے لگیں۔

”امی! مثال کو لے آئیں گے بھائی تو اچھا ہے آپ کے پاس دو سراہٹ ہو جائے گی۔“ فوزیہ نے اشارتاً اپنی رخصتی کے بعد کی بات کی۔

”خاک دو سراہٹ ہوگی اور میزا سرور و برہہ جائے گا۔ کون اس کو کھلائے پلائے گا۔ نہلائے دھلائے گا۔ اسکول بھیجنا تیار کرنا اور اللہ جانے کیا کیا سیانے ہیں کون کرے گا۔ میری بوڑھی بیمار جان تو یہ سب کچھ نہیں کر سکتی۔“ نسیم کے دل کے سارے اندیشے زبان پر آگئے۔

”پھر تیرے جانے کے بعد میں کیسے یہ سب کروں گی نہ بابا! اسے رہنے دو اس کی ماں کے پاس۔“ وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولی۔

”پھر۔۔۔ عدیل کا رشتہ کرتے ہوئے یہ لڑکی رستے میں رکاوٹ بنے گی، چلو طلاق کا معاملہ منہ کچھ بھی کہہ کر ادھر ادھر کر سکتا ہے کہ بیوی صحیح نہیں تھی، مگر اس مثال کی موجودگی میں لوگ ہچکچائیں گے رشتہ کرتے ہوئے۔“ نسیم دور کی کوڑی لے کر آئیں۔ فوزیہ ماں کی شکل دیکھتی رہ گئی۔

”امی۔۔۔ آپ بھائی کی دوسری شادی کی بات کر رہی ہیں۔“
 ”ہاں تو یا گل!“ کیا اسے یوں ہی بٹھائے رکھوں گی اور میں نے تو بلیقہ سے کہہ بھی دیا تاکہ کوئی اچھا سا رشتہ ہاتھ میں رکھے بس آٹھ دس دنوں میں سلسلہ شروع کر دیں گے۔ وہ مزے سے بولیں تو فوزیہ ماں کو سمجھتے ہوئے بھی

بڑبڑا رہ گئی۔
 ”بلکہ میں تو کہتی ہوں تیری شادی سے پہلے اگر کہیں بات و ات پکی ہو جائے۔ شادی مہینہ دو مہینہ میں ہو جائے تو کیا ہی اچھا ہے۔“ وہ اور بھی جوش میں آئیں۔
 ”امی! اتنی جلدی۔“ فوزیہ پریشان سی ہو گئی۔

”ہاں تو بچی! میں اس کی گھر کہاں چلا سکتی ہوں اب تیرے جانے کے بعد مجھے ہی تو یہ سب کچھ سوچنا ہوگا۔ اب لہ رکھے میرا بچہ کوئی اکیلا تھوڑی رہے گا۔ میں تو ابھی اسے یوں اجڑا اجڑا دیکھ کر بمشکل اپنے دل کو سنبھالنے ہوئے ہوں۔“ نسیم بیٹے کی محبت میں تڑپ کر بولیں۔

”ہاں امی! بھائی کی طرف تو دیکھا نہیں جاتا۔ اتنے چپ چپ رہنے لگے ہیں، کبھی کبھی تو مجھے دکھ ہوتا ہے اور ٹوڑا بچھٹا رہا بھی۔ کیا تھا امی! آپ خواجواہ یہ شرط نہ لگائیں بھائی کا گھر تو بسا رہتا۔“ فوزیہ کے خیالات میں بڑی جلدی تبدیلی آئی تھی۔

کیونکہ اس کی اپنی قسمت جو تبدیل ہونے جا رہی تھی کبھی تو وہ اس بشری کا نام سننے کی روادار نہیں تھی اور اب اسے لگ رہا تھا کیا فرق پڑتا اگر وہ بیاہ کر چلی جاتی۔ بشری عدیل کے ساتھ رہتی۔ ان کا گھر بنا رہتا اسے کچھ فرق تو نہیں پڑتا تھا۔

مگر یہ تو اب کی بات ہے۔۔۔ اب اور تب میں فرق تھا۔ جبکہ بشری اور عدیل کی شادی ختم ہو چکی تھی۔ وہ بھی فوزیہ کو وجہ سے۔

”چھوڑو۔۔۔ وہ اس قابل نہیں تھی کہ اسے عزت اور شان سے اس گھر میں بسایا جاتا۔ کبخت سانس بھی وہاں کی مرضی سے لیتی تھی کہاں نکلتا تھا اس نے۔ تیرے جاتے ہی وہ عدیل کو لے کر یہاں سے چلنے کی کرتی تو میں بڑھیا کیا کاڑھتی اس کا۔“

نسیم بشری کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھی اس صورت میں بھی نہیں جبکہ ایسا ہونا اب ممکن بھی نہیں تھا۔

”غیر چھوڑیں اس موضوع کو۔ کل کا کیا پروگرام ہے۔ آنٹی نے بتایا نہیں کتنے لوگ آئیں گے ان کے ساتھ؟“ فوزیہ جلد کا کٹا گئی بھائی کے بورٹا پک سے بات کا رخ اپنی طرف موڑنے کو بولی کہ آج کل اس کی دلچسپی

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

شان ہو گئے ہیں

☆ تلیاں، پھول اور خوشبو	راحت جنیں	قیمت: 250 روپے
☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں	فائزہ افتخار	قیمت: 600 روپے
☆ محبت بیاں نہیں	لبنی جدون	قیمت: 250 روپے

خوبصورت مردوں
خوبصورت عورتوں
مضمون جلد
آئسٹ بچے

شعبانہ کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

”زیادہ نہیں۔ ایک اس کی بہن دوسری نندا اور اس کا شوہر اور ایک شاید بیابانی بیٹی اور ولاد ہو گا۔ بہت ہی وار خیال کرنے والے لوگ ہیں ڈھیسے اور سلجھے ہوئے۔ فوزیہ! تیری تو سمجھ اور لائٹری نکل آئی ہے“ نسیم بیگم کو خوش تھیں۔

فوزیہ دل ہی دل میں خوش ہونے لگی۔

”ہی! بھائی ابھی تک نہیں آئے۔“ اس کی نظر گھڑی پر پڑی تو تشویش سے بولی۔

”ہاں! اتنا وقت تو کبھی نہیں ہوا۔ فون ملا ذرا اس بات گرتی ہوں۔ پتا نہیں شام سے اس نے کچھ کھایا بھی نہیں۔“ نسیم فکر سے بولیں تو فوزیہ فون پر نمبر ملا کر کال ریسیو ہونے کا انتظار کرنے لگی پھر یوسی سے سیل ایک طرف رکھ دیا۔

”فون نہیں اٹھا رہا۔“

”راستے میں ہو گا خیر سے آتا ہے تو کل کارپوگرام ملے کرتی ہوں اس سے کیا کیا کھانے میں ہو مل سے آئے گا۔“ نسیم اگلا کارپوگرام دل میں سوچے ہوئے تھیں۔



”مما۔۔۔ ماما۔۔۔ پاپا آئے ہیں۔“ مثال بشری سے بال ہنوا رہی تھی رات کے پینے والے کپڑے وہ پن پچھا تھی۔

باہر لاونج کی طرف ساموں کے ساتھ کھیلنے جا رہی تھی کہ کھڑکی سے لپٹے پڑے سے دیکھتے ہوئے ایک دم سرخوشی کے عالم میں بولی۔

بشری ایک دم سے ساکت رہ گئی۔

اسے لگا بالکل پہلے جیسے دن ہیں وہ کچھ دنوں کے لیے ماں کے گھر آئی ہے اور اب عدیل اسے اور مثال کو بلانے کے لیے آیا ہے۔

وہ بے حس ہاتھ میں بیٹر برش لیے بیٹھی رہ گئی۔

مثال اچھلتی کودتی باہر جا چکی تھی۔

گیٹ کھلا تھا عمران باہر کچھ لینے کے لیے گیا تھا۔ گیٹ ذرا سا کھلا تھا۔

عدیل گھر کی طرف جا رہا تھا کہ ماں سے گیٹ کے آگے سے گزرتے ہوئے وہ بے اختیار ریک لگا بیٹھا۔

گیٹ کھلا دیکھا تو گاڑی باہر ہی کھڑی کر کے وہ کچھ جھجکتے ہوئے گھر کے اندر آ گیا۔

ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اندر جائے یا نہیں کہ مثال پاپا پاپا پاپا کرتے بھاگتی اس سے آکر لپٹ گئی۔

اور اسے یوں لگا جیسے صحرا کے ایک لمبے سفر کے بعد اسے کسی ٹھنڈے نخلستان کے نیچے پناہ مل گئی۔

اس نے زور سے مثال کو اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ آنکھیں بند کیے وہ بے اختیار رونے لگا۔

مثال بھی باپ کے ساتھ زور سے لپٹی تھی۔ جب عمران ہاتھ میں شاپر لیے اندر آیا۔

اندر کے منظر نے اس کے قدم جکڑ لیے۔

اس کے خون میں لبال سا اٹھنے لگا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگا تھا کہ اندر سے آتی ذکیہ نے وہیں سے صورت

حال کا اندازہ کر لیا۔

عمران اتم اندر آ جاؤ۔ ”وہ وہیں سے حکمہ لہجے میں بولیں۔“

عدیل اور مثال نے چونک کر انہیں دیکھا۔

یہ تو اسپکڑنے عدیل کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اگر وہ خود سے مثال کو زبردستی لے کر آئے گا یا کچھ ایسا اور سا غیر قانونی کرنے کا تو یہ حرکت اس کے کیس کو اور بھی کمزور کر دے گی اور اس کی بیٹی کو اور بھی اس سے دور لے جائے گی۔ اس لیے ایسا کرنے کا تو اس کا ارادہ نہیں تھا۔

مگر بیٹی کو سامنے دیکھ کر سینے سے لگا کر اب خود سے الگ کرنا بھی اسے بہت مشکل لگ رہا تھا۔

”پاپا۔۔۔ آئیں نا اندر۔۔۔ ماما اندر ہیں۔ اب ماما بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ ہمیں لینے کے لیے آئے ہیں نا۔“ مثال باپ کا ہاتھ کھینچتے ہوئے اندر لے جانے لگی۔

عدیل نے اپنے قدموں میں مضبوطی سے جما لیے ذکیہ اور عمران بھی مثال کی بات پر نظریں چرا کر رہ گئے۔

کھڑکی میں کھڑی بشری مثال کو باپ سے لینے اس کے ساتھ لگے دیکھ کر نہ چاہتے ہوئے بھی روئے جا رہی تھی۔ آج اتنے دنوں بعد اس سیم کو سامنے دیکھ کر کیسے اس کا دل پیانی بن کر بسے جا رہا تھا۔ حالانکہ اسے عدیل پر نفرت تھی۔

”پاپا آئیں نا۔ ابھی جا میں ماما کے پاس چلتے ہیں۔“ وہ باپ کو بے حس و حرکت کھڑے دیکھ کر کھینچتے ہوئے

بولی۔

”نہیں بیٹا میں پھر کسی دن آوں گا۔ ابھی مجھے ایک بہت ضروری کام سے جانا ہے میں پھر آؤں گا۔“ وہ ایک دم سے اس سے ہاتھ چھڑا کر بولا۔

مثال حیران سی باپ کی شکل دیکھنے لگی۔ اس نے کتنی ہہنگی سے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ جدا کیا تھا۔ اتنا اجنبی تو اسے اپنا باپ کبھی بھی نہیں لگا تھا۔

ذکیہ آگے بڑھ کر آگئیں۔ انہوں نے مثال کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

”پاپو مثال! اندر چلو بیٹی! تمہارے پاپا بعد میں آئیں گے تم سے ملنے۔“ وہ نرمی سے اسے ساتھ لگا کر بولیں۔

”مگر پاپا! مجھے تو پاپا کے ساتھ جانا ہے۔“ وہ کمزور سے ضدی لہجے میں بولی۔ وہ چند ہی دنوں میں بہت بڑی بڑی لگنے لگی تھی۔

”مثال میری جان! میں پھر آؤں گا آپ کو لینے۔ آپ ابھی ریسٹ کرو۔ میں چلتا ہوں۔“ اسے مڑ کر پیار کرتے ہوئے وہ بے شکل خود پر قابو پا کر تیزی سے ادھ کھلے گیٹ سے باہر نکل گیا۔

مثال باپ کی طرف دیکھتے ہوئے رونے لگی۔

”پاپا۔۔۔“ وہ بہت ہوئے سے بولی تھی جیسے اونچی آواز میں تیسرے کی تو سب اسے ڈانٹیں گے۔ وہ ثانی کے ساتھ اندر جاتے ہوئے رو رہی تھی مگر ڈب کے دل میں باپ کو پکار رہی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ تمامہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایپلوڈنگ
- ✧ سیریز کو الٹی، ناول کو الٹی، کمپریز کو الٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ایب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

عذیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بیٹے ہیں۔ بشری ان کی بسوی اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشری کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نوای اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشری اور نسیم بیگم میں رواجی ساس بسو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصنفین میں بسو سے لگاوت دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشری کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ سناچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشری کی زندگی نوزیدہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکل جوائے روز بشری کو دلنا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عذیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشری کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن زائدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشری اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عذیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر نوزیدہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشری اور عذیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشری کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹ اور گاڈس کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہیں۔

فون پر پتا چلتا ہے کہ شہر آتے ہوئے عفان اور فاروق صاحب ذکیہ کی وادعات میں تعلق ہو گئے۔ عفان کے قریبی دوست ذہیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹ سے سات لاکھ روپے وصول کرائی ہے۔ ذہیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

We Are Anti Waiting WebSite

• ہاؤس ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ڈاؤن لوڈ کی جا سکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہر ای سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety



اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقبولین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ نسیم بیگم سے جس لاکھ روپے سے شرط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشری سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔ حیدرہ خالہ عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زیر کا ایسے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں جبکہ عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔ یہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آجاتا ہے کہ وہ انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے۔ سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔ رقم مہمانہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر سوا اور اس کے گھر والوں کو مورد الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشری کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل طیش میں بشری کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا ابارشن ہو جاتا ہے۔ عدیل شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔

اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ زیر کے ہاتھوں لٹ جلتے پر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آجاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو بتا چلتا ہے کہ زیر نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بنا کر دیے ہیں اور اب مفروضہ ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم عاصمہ کو ایک مکان دلایا جاتا ہے۔ بشری اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کر دیتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل سخت پریشان ہے۔

عدیل مکان کا اوپر والا بورشن بشری کے لیے سیٹ کروا دیتا ہے اور کچھ دنوں بعد بشری کو مجبور کرتا ہے کہ وہ فوزیہ کے لیے عمران کا رشتہ لائے۔ نسیم بیگم اور عمران کسی طور نہیں مانتے۔ عدیل اپنی بات نہ مانے جانے پر بشری سے جھگڑتا ہے۔ بشری بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ عدیل طیش میں بشری کو طلاق دے دیتا ہے اور مثال کو چھین لیتا ہے۔ مثال بیمار پڑ جاتی ہے۔ بشری بھی حواس کھو دیتی ہے۔ عمران بہن کی حالت دیکھ کر مثال کو عدیل سے چھین کر لے آتا ہے۔ عدیل عمران پر اغوا کا پرجا کھواتا ہے۔

عاصمہ اسکول میں ملازمت کرتی ہے مگر گھریلو مسائل کی وجہ سے آئے دن چٹنیاں کرنے کی وجہ سے ملازمت چلی جاتی ہے۔ اچانک ہی فوزیہ کا کہیں رشتہ طے ہو جاتا ہے۔

باسوی قلب

دلہن بنی فوزیہ یہ کمال کاروبار کیا تھا۔
یہ نسیم بیگم ہی کا خیال نہیں تھا بلکہ اس تقریب میں موجود سب ہی لوگوں کا خیال تھا۔ فوزیہ کے انگ انگ سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔

ساتھ بیٹھا خالد نہ صرف سچ رہا تھا بلکہ ہر کسی نے ایک جیسی جوڑی کہہ کر خوب تعریفیں بھی کیں۔
نسیم کی خوشی کا بھی کچھ ٹھکانا نہیں تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے صدیوں کا بوجھ کسی نے یک لخت ان کے کندھوں سے اتار دیا ہو۔

”اے بہن! تمہاری بہو کہاں ہے؟ اپنے عدیل کی بیوی شادی کی کسی تقریب میں نہیں تھی۔ کیا لڑ بھڑ کر میکے جا بیٹھی ہے؟“ خالد بھابھی کی بہواتنی معصوم تھی نہ سارا اور خاندان میں پھیلی اس خبر سے یقیناً ”ما آشنا بھی نہیں ہو گی مگر کجنت نے ایسے موقع پر ساری خوشی کا جیسے مزا ہی کر کر کر دیا ہو پوچھ کر۔“ نسیم نے پہلے تو یوں ظاہر کیا جیسے

نفسوں کیوں انہوں نے سستی ہی نہیں مگر وہ بھی سو ڈھبوں کی ایک تھی۔
”اے آبا۔۔۔ سنتیں نہیں تمہاری بہو نہیں نظر آرہی مجھے۔ کسی اور سے پوچھنا اچھا نہیں لگا۔ ہو جاتی ہیں گھر دل میں سو باتیں پر ایسے موقع پر تو بہو کو موجود ہونا چاہیے۔“ شمسہ کی یہی عادت سارے خاندان کو بری لگتی تھی۔ وہ کسی بات کے پیچھے پڑ جاتی تو اس کے نیچے ادھیڑ دیتی تھی۔

”کچھ تو اپنے عدیل کی طرف دیکھا نہیں جا رہا۔ کیسے اکیلا اکیلا لگ رہا ہے۔“
”ہاں تو پیچھن تھے گھر بسانے والے اس بشری کے؟“ نسیم جیسے پھٹ کر بولیں۔
شمسہ تو یوں دھول بن کر دیکھنے لگی جیسے کسی بہت بڑے انکشاف کی منتظر ہو۔

”شمسہ! میں صاف بولوں اتنی کم نسیم تم بھی نہیں ہو عن تو لی ہوگی اڑتی پڑتی کوئی ایسی بات۔۔۔ پر زخموں پر نمک چھڑکنے کا تو اس خاندان کو ہر کا ہے۔“ نسیم اس پر الٹ پڑیں۔

”اللہ توبہ۔۔۔ توبہ۔۔۔ سو بار میری توبہ۔ میں نہ تین میں نہ تیرہ میں اور مجھے کون ایسی باتیں بتائے گا بھلا! جو میں نے کبھی دلچسپی لی ہو۔ ہمیشہ زندگی بھر ایک ہی اصول رہا ہے میرا۔ اپنے کام سے کام رکھو بابا!“ وہ خود کو خوب معصوم ظاہر کرنے پر اور زور لگاتے لگی۔

نسیم بری طرح بے زار ہو گئیں۔ پیچھا چھڑانے کے لیے صاف کہہ دیا۔

”طلاق دے دی ہے عدیل۔ نے اس کو۔ جینا رو بھر کر رکھا تھا اس نے میرے نیچے کا۔ دن رات فرمائشیں ضدیں۔۔۔ ہر وقت ناک میں دم کیے رکھتی تھی۔ مروجہ تھا برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے سو تین حرف بولے اور جوتلی پکڑ کر چلتا گیا۔“ نسیم نے یوں سینے پر ہاتھ رکھ کر چار لائنوں میں پوری کہانی کہہ دی جیسے عدیل نے برا مردوں والا کارنامہ انجام دیا ہو۔

”اوتی طلاق دے دی؟“ وہ صدمے سے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”سچ۔۔۔ سچ بے چارہ بچہ۔۔۔ کیسا اکیلا سا نظر آ رہا ہے اجزا ہوا۔“ وہ جی بھر کے تڑپتی اور ہمدردی سہجے میں سو کر بولی۔

”اجڑیں اس کے دشمن۔ میرا بچہ گھریا والا ایسی اچھی نوکری گاڑی گھر کیا نہیں میرے نیچے کے پاس۔ لڑکیوں کا کوئی کال پڑ گیا ہے۔ ابھی اسی فنکشن میں دس ماؤں نے میرا پلو پکڑ کر صاف اپنی بیٹیوں کے رشتے میرے آگے ڈال دیے ہیں۔ پر اب کے تو میں کوئی دھوکا نہیں کھاؤں گی۔ اپنے نیچے کے لیے خوب چھان پھٹک کر سولے کر آؤں گی۔“ نسیم سینہ ٹھونکت کر بولیں۔

شمسہ لمحہ بھر کو تو کھلے منہ کے ساتھ دیکھتی رہ گئی۔ کچھ بول ہی نہ سکی۔ نسیم نے طلاق کی بات سنا کر اسے انوس

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو	راحت جبین	قیمت: 250 روپے
☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں	فائزہ افتخار	قیمت: 600 روپے
☆ محبت بیاں نہیں	لبنی جدون	قیمت: 250 روپے

شکوے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

کرنے کا چانس بھی نہیں دیا تھا۔
 عدیل کی نئی شادی کی بات شروع کر دی تھی۔
 ”ایک لڑکی بھی تھی نام عدیل کی اس بشری سے؟“ شمسہ کو ارد گرد بھاگتے بچوں کو دیکھ کر کچھ یاد آیا۔
 ”نسیم نے اسے کہا جانے والی نظروں سے دیکھا۔
 ”کبھی شغل سے ایسے بل معصومہ بنی کھڑی ہے جیسے میں اس کی بھینگی غلطی کو اپنے عدیل کے لیے مانگ ہی لوں گی نا!“

”ہاں ہے تو۔ وہ عدیل سے کپاس ہی رہے گی بچی تو اسی کی ہے۔“ وہ پھر سے اسی طرح سینہ چوڑا کر کے بولیں۔
 ”اچھا! شمسہ کچھ خاموش سی ہو گئی۔
 ”کیوں کیا ہوا؟“ نسیم کو اس کے اتنے فخر ”اچھا“ سے کچھ وحشت سی ہوئی تو گھبرا کر پوچھنے لگیں۔
 ”آپا! بڑا نہیں ماننا۔ وہ ہوا جو تو ہو گیا تا تمہارا عدیل جب اگر تم پر بند کی لڑکی ڈھونڈو گی تو یہ لڑکی دم چھلا ہوگی عدیل کا تو تمہارے خیال میں لوگ کسی خوشی دے دے دس کے رشتہ کنوں کی پوری تھی یہ شمسہ۔ جو بات نسیم کے دل میں کسی سنبولے کی طرح کندلی مارے بیٹھی تھی کیسے اس نے کھناک سے کہہ دی۔ نسیم فوراً ”تو جیسے کچھ بول ہی نہ سکیں۔“

”میں تو کہوں آنا! اس لڑکی کو ماں کے حوالے کر دو سیدھا سیدھا۔ تم یا عدیل کیوں یہ مصیبت اٹھاؤ۔ ایک تو پالنے کا کشت پھر بڑھاؤ لکھاؤ۔ لڑکی ذات اس کی جو کیداری الگ سے دوسرے عدیل کے رشتے کے رستے میں رکاوٹ پھر آخر میں یہاں کا مسئلہ۔ اپنی فوزیہ کو لے لو اچھے رشتے کی تلاش میں سمجھو! انتوں پسینہ آ گیا۔ اب تم سوچ لو خوب اچھی طرح۔“

”نسیم تو اس کی شکل ہی دیکھتی رہ گئیں۔
 کیسے شمسہ نے دو وہ کا وہ بانی کا پانی کر کے رکھ دیا تھا۔
 ”تو لو آپا! نسیم! کیا میں نے غلط کہا؟“ وہ نسیم کو مت بنا دیکھ کر فخریہ لہجے میں پوچھنے لگی۔
 ”اب یہ ساری باتیں میں اور تم تو سمجھ سکتے ہیں۔ عدیل کو کون سمجھائے گا؟ تو اس بالشت بھر کی لڑکی کے لیے باولا ہوا جا رہا ہے۔ جیسی جاؤ گئی ماں تھی اسی ہی بیٹی ہے اسے اور کچھ سوچتا ہی نہیں۔ سمجھو مارے باندھے اس نے بسن کی شادی کے انتظامات کیے ہیں۔ ہریات کو مجھے دس دس بار کہتا رہا ہے۔ پھر بھی دس کام ادھورے رہ گئے۔ وہ تو اللہ نے کرم کیا فوزیہ کی ساس بلکہ سارا سسرال ہی ایسا اچھا اور مہربان ملا کہ آدھا ادھورا چیز بھی انہوں نے ماتھے۔ شکر ڈالے بغیر قبول کر لیا۔ اب عدیل کو یوں چھوڑ تو نہیں سکتی تا میں!“ نسیم کو تو جیسے سب کچھ کہنے کو کسی ہمدرد کا کاندھا مل گیا کہتی چلی گئیں۔

”لو اس عدیل کو کیا ہو گیا۔ اب دفتر جائے گا یا اس بچی کی دیکھ رکھ کرے گا بلکہ میں تو کہوں آنا! یہ تمہاری سہ من کی ہوشیاری ہوگی ساری۔“ وہ قریب ہو کے یوں رازداری سے بولی جیسے سہ من کا کوئی وہاں ضرور ہی موجود ہو گا۔

”کیا مطلب؟“ نسیم جیسی گھاگ عورت کی عقل شمسہ کی ذہانت کے سامنے چوہٹ ہو گئی تھی جیسے!
 ”میری بھولی آپا! تمہاری سہ من اپنی چھو کرسی کو سد اگھر میں بٹھا کر رکھے گی کیا؟“ نسیم تو فکر کر دیکھے گئیں۔ وہ واقعی شمسہ کا مطلب نہیں سمجھتی تھیں۔
 ”آپا! وہ اس کی شادی عدت ختم ہوتے ہی فوراً کرنے کی کوشش کرے گی دو باجویا اس جیسے طلاق والے اسے بھی جلد یا بدیر مل ہی جائیں گے۔“ شمسہ نسیم سے جڑ کر بیٹھ گئی۔

”ہیں ہمنوار اتو ملنے سے رہا۔ کم عمر تو نہیں ہے بشری۔ اوپر سے یوں ہی لڑکیوں کا سا بناؤ سگھار کیے پھرتی ہے۔“ نسیم کو پھر خواجہ خواجی بھر کر بشری پر غصہ آیا۔

ایک دم انہیں لگا کہ وہ جس کام کو بہت آسان سمجھ رہی تھیں وہ تو بہت کار دشوار ثابت ہونے والا ہے عدیل کا وہ سراسر رشتہ تلاش آسان نہیں ہو گا اور اتنے دنوں تک گھر کی گاڑی کیسے چلے گی۔ کون چلائے گا کیسے ہو گا

”نسیم تو زمانے ہوئے کام کاج سے فارغ بیٹھی تھیں۔ کچھ فوزیہ نے سنبھال لیا تو کچھ بشری نے۔ اب پھر۔ نے سرے سے لڑکی ڈھونڈنا خاندان کی چھان چٹک۔ لڑکی کے چال چکن اور دوس کبھی سے۔
 ”یہ کیا پنگالے لیا عدیل نے؟“ نسیم کو آخر میں۔ عدیل پر ہی غصہ آیا۔

”ظاہر ہے اب وہ سراسر رشتہ بھلے کتنا ہی اچھا کیوں نہ ملے۔ وہ بھی بشری کو ایک بچے کے ساتھ تو قبول نہیں کریں گے نا۔“ شمسہ اپنی ہی راگنی چھینڑے ہوئے تھی۔

نسیم خالی نظروں سے اُسے دیکھ کر رہ گئیں۔ ساری خوشی باؤن چھو ہو گئی تھی۔
 فوزیہ جاری تھی اور پورے گھر اور گھر داری کی ذمہ داری نسیم کے بوزھے کندھوں پر آ رہی تھی۔
 وہ تو سالوں سے صوفے اور بستر پر بیٹھی۔ بس حکم چلا رہی تھیں یا کیڑے نکال رہی تھیں۔

”سو وہ تمہاری سہ من تو یہی چاہے گی کہ بچی باپ کے پاس چلی جائے پر آپا! میری مانو تو بالکل بھی یہ غلطی نہیں کرنا۔ درہم پر کڑ کر رو دگی۔“ وہ نسیم کے پریشان چہرے سے قطع نظر بولے جا رہی تھی۔

”کیا مطلب۔ میں کیوں رو دگی؟“ نسیم جلے کٹے انداز میں بولیں۔
 ”تو تو کیا آنے والی آسانی سے اس بچی کو قبول کر لے گی۔ عدیل کی زندگی سیٹ ہونے سے پہلے ہی نئی مصیبتوں کا شکار ہو جائے گی۔“ وہ سر جوڑے۔ نسیم کے کانوں میں زہر گھولے جا رہی تھی۔

فوزیہ اسٹیج پر بیٹھی ماں کو یوں خود سے غافل دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی۔
 ”امی کو نظر نہیں آ رہا کہ بیٹی داماد کے پاس آ کر بیٹھیں میری ساس اللہ میاں کی گائے کب سے آ کر بیٹھی ہیں ان کو پسنائو نیوں کا زور دکھاتا ہے پر امی کو تو کوئی ہوش نہیں۔ اب وہ کس کے زیرے ماں کو پیغام بھجوئے۔ کوئی اپنا قریبی نظر بھی تو نہیں آ رہا تھا۔“

”کیوں جھوٹ بولا میں نے کچھ تھا! شمسہ فخریہ انداز میں نسیم کو سارے زریں مشوروں سے نواز کر سراسر اٹھا کر بولی۔

”سب صحیح کہا تم نے مگر یہ عدیل کو کون سمجھائے۔“ نسیم تو بس رووی دینے کو تھیں۔
 ”تم ماں ہو آپا! بہت کچھ کر سکتی ہو۔ میں نے تو یہ بھی سنا ہے عدیل نے بشری کو طلاق تمہارے کہنے پر دی جب ایک بار وہ اپنا گھر تمہارے کہنے پر اجازت ملتا ہے تو دوسری بار بسانے کے لیے تمہارے کہے پر کیوں نہیں عمل کر سکتا۔“ اور نسیم کا جی چاہا اس شمسہ کا گلا ہی دبا دیں۔ منحوس کیسی بکواس کر رہی تھی مگر اس وقت اس سے بھڑکنے کا موقع نہیں تھا۔

”ہاں دیکھو جو رب کو منظور میں دیکھوں ذرا فوزیہ کی ساس بھی اسٹیج پر بیٹھی ہے۔“ بالآخر نسیم کو رخصت ہو کر جانے والی بیٹی کا خیال آ ہی گیا۔

شمسہ سے جان چھڑا کر ست قدموں سے وہ اسٹیج کی طرف بڑھ گئیں۔ شمسہ اب دو سری عورت کے ساتھ بیٹھی فوزیہ اور خالد کی جوڑی پر کھلے عام تبصرے کر رہی تھی جن میں سے ایک بھی اگر نسیم سن لیتیں تو واقعی شمسہ کا گلا ہی دبا دیتیں۔

”بس ای۔ بالکل بھی نہیں۔ میں ایسا مکر بھی نہیں کر سکتی۔“ بشری نے جلدی سے مثال کو اپنے ساتھ پین لیا۔

”باگلی ہو گئی ہو تم اور مجھے بھی اپنے ساتھ پاگل کر دو گی۔ ایک جو میری بات تمہاری سمجھ میں آ رہی ہو۔ حد ہے کوئی کم عقلی کی بھی۔“

اتنے دنوں سے ذکیہ جو ضبط کے جاں گسل مرحلوں سے گزر رہی تھیں جیسے پھٹ ہی پر ہیں۔
”اور تم جاؤ۔ باہر جا کر کھیلو۔ عمران آ گیا ہے اس سے کہو تمہیں کسی پارک میں لے جائے۔ ہر وقت اسے ساتھ چمٹائے رکھتی ہو۔ بڑی ہو رہی ہے یہ۔ اب اس کو خود بھی کچھ کرنے دو۔“ ذکیہ نے زور سے مثال کو کھینچ کر ماں سے الگ کیا۔

لحہ بھر کو تو بشری شاکڈ سی ماں کو دیکھتی رہ گئی۔ ماں کا رویہ بہت بدلا ہوا تھا۔
محسوس تو وہ اسی دن سے کر رہی تھی جب سے اسے ٹھیک سے ہوش آیا تھا مگر وہ تین دن سے یہ بدلاؤ کچھ زبان ہی محسوس ہو رہا تھا مثال بھی ڈر کر بائی کو دیکھنے لگی۔ اس نے کچھ بے چارگی سے ماں کی طرف دیکھا۔ جیسے اس سے اجازت طلب کر رہی ہو کہہ جائے یا نہیں۔

”سنا نہیں تم نے۔ جاؤ کھیلو جا کر باہر۔ مجھے تمہاری ماں سے کچھ بات کرنی ہے“ ذکیہ اور بھی سختی سے بولیں تو مثال اور بھی ڈر گئی اس نے مڑ کر ماں کی طرف بھی نہیں دیکھا۔ آسٹنگی سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔
”مثال رکو۔ آؤ میرے پاس۔“ بشری تو اسے ایک لمحہ کے لیے خود سے جدا نہیں کرتی تھی۔ جیسے ابھی عدیل کہیں سے آکر اسے چمچین کر لے جائے گا۔

”آؤ ادھر باہر نہیں جانا تم نے۔“ وہ مضطرب ہو کر میں بولی۔
”کوئی اس کو چمچین کر نہیں لے جا رہا۔ نکال دو اس وہم کو اپنے دماغ سے۔ تمہارے پاس ہی ہے یہ۔“ ذکیہ بے زار کوفت بھرے لہجے میں بولیں۔
بشری نے عجیب سی نظروں سے ماں کو دیکھا۔

اس بے زاری اور کوفت میں کون سے اشارے تھے؟ جو بشری کو سمجھ لینے چاہیے تھے۔
”تنگ آگئی ہیں آپ ہم دونوں سے؟“ ذکیہ نے گرتی سے بولی۔
”تم سے نہیں تمہاری کم عقلی سے۔ نادالی سے۔“ ذکیہ نے بھی بے لفاظی سے کہہ دیا۔
”کیا مطلب۔ میں نے کیا کیا ہے؟“ بشری نے دروازے کے باہر سے نظر آتے مثال کے سرخ فراق پر نظریں جما کر پوچھا۔

”عدیل۔ آیا تھا پھر۔“ ذکیہ کچھ دیر بعد بہت سوچ سمجھ کر بولیں۔
”تو میں کیا کروں؟“ بشری کا چہرہ ایک دم سے جیسے پتھر کا بن گیا۔
”وہ مثال کو کچھ دن کے لیے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔“ ذکیہ بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات کر رہی تھیں۔

”میں یہ مکر بھی نہیں ہونے دوں گی۔“ بشری بے چلک لہجے میں بولی۔
”باپ ہے وہ اس کا۔ جیسے تم اس کی ماں ہو۔ تمہارا حق ہے مثال کو پاس رکھنے کا تو اس کا بھی حق ہے۔“ ذکیہ نے تے انداز میں کہہ رہی تھیں۔ جیسے وہ دل میں بہت کچھ طے کر چکی ہوں۔

بشری کو ان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ خوف سا آیا۔
”ای۔ اور باپ ہوتا اسے اپنی ذمہ داری جو اللہ نے اس پر ایک بیٹی کی شکل میں ڈالی ہے اس کا احساس ہوتا تو وہ بچہ اور اسے اپنی زندگی سے کاٹ چھیننے سے پہلے سوچتا۔“

بشری کو احساس ہو رہا تھا کہ ذکیہ آج اس معاملے کو ٹھکانے لگانا چاہتی ہیں تو وہ بھی اس پر بات کرے گی بیچھے نہیں ہے گی۔

”ہو گیا جو اس سے ہونا تھا غصے میں۔ ماں بہن نے جتنی اسے آگ لگا رکھی تھی اور یہ بھی سچ ہے کہ کمان سے لگا تیرا پس کمان میں نہیں آسکتا۔“ ذکیہ جیسے عدیل کو رعایتی نمبروں سے پاس کرنے کا ارادہ کر چکی تھیں۔
”تو۔۔۔؟“ بشری تنگ کر بولی۔

”آگے کا سو جواب۔“ ذکیہ معنی خیزی سے بولیں۔
”آگے کا ہی تو سوچ رہی ہوں۔ اب مجھے صرف اپنی بیٹی کے لیے جینا ہے اسے پالنا ہے اور اس کی اچھی تعلیم اور نہایت پردھیان دینا ہے۔ یہ کبھی عدیل کے پاس جائے اور کبھی میرے پاس آکر رہے اور اس کی نفسیات تقسیم ہو کر رہ جائے۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں۔“ بشری نے بے دھڑک اپنی پلاننگ ماں کو سنا دی۔ ذکیہ کا جی چاہا اسے خوب کھری کھری سنا دیں مگر اس کھری کھری کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ اس خیال نے انہیں روک دیا۔

”نوزیہ کی شادی ہو گئی ہے۔“ ذکیہ کچھ دیر بعد بولیں۔ بشری نے غصے سے ماں کی طرف دیکھا۔
اس کی پلاننگ کا یہ بھونڈا سا جواب ماں نے کیا اسے تپانے کے لیے دیا ہے۔
”میں منحوس نے دفع تو ہو ہی جانا تھا ایک دن۔ میری بچی کا گھر تو نہ خراب کرتی۔“ ذکیہ نفرت سے منہ میں بڑھا لیں۔ بشری نے کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

باہر خزاں شروع ہو چکی تھی۔ درختوں کے ہرے پتے پیلے پڑتے جا رہے تھے۔ ہر طرف ایک ایک اور اسی ایک گہرا سناٹا۔ ادھر ادھر بھٹکتی ہوائیں جب اس کے کمرے کی کھڑکی آکر بجائیں تو اسے اپنے بیڈ روم کی وہ کھڑکی یاد آنے لگتی جس کے پیچھے امرود کا پتھر تھا جس کے پتے ایسی ہوا کے ساتھ کچھ ایسے شور مچاتے جیسے تالیاں بجا رہے ہوں۔

ماں وہ دن تو ایسے ہی تھے جو اس نے عدیل کے ساتھ گزارے کہ ہر طرف خوشیاں تھیں۔ رنگ تھے اور۔
”تم سن رہی ہو میں کیا کہہ رہی ہوں۔“ ذکیہ اسے ایک ٹک باہر دیکھتے رہنے پر کچھ جھنجھلا کر بولیں۔
بشری خالی خالی نظروں سے ماں کو دیکھ کر رہ گئی۔
”کیا کہہ رہی ہیں؟“ وہ تھکے ہوئے انداز میں بولی۔

ذکیہ کو لمحہ بھر کے لیے اس کی شکل دیکھ کر بہت ترس آیا۔ جی تو چاہا کہ جو کچھ وہ کہنے جا رہی ہیں اسے ابھی کچھ دنوں بعد کے لیے اٹھا رکھیں مگر وہ عمران کا بے زار رویہ بھی دیکھ رہی تھیں۔
”اس سے پہلے کہ عمران کا یہ رویہ بشری پہ کھلے وہ بہت گہرائی سے کچھ محسوس کرے یا عمران ہی کچھ ایسا کہے۔“

”نہیں۔۔۔ یہ بھڑک بھی قائم رہنا چاہیے۔ کم از کم بشری کی زندگی نئے سرے سے جب تک سیٹ نہیں ہو جاتی۔“ ذکیہ نے دل میں عزم کیا۔ عمران کی چلتی بات بھی رک گئی تھی۔ اس کی بے زاری کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

ابھی بہت کچھ نئے سرے سے شروع کرنا تھا ذکیہ یکدم ہی خود کو بوڑھا محسوس کرنے لگیں۔

نہیں ہوں گی۔" وہ بے لچک لہجے میں کہہ کر اٹھی اور باہر نکل گئی۔

ذکیہ سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔
 "اس لڑکی کو میں اب کیسے سمجھاؤں اور کب تک میں اسے یہاں بٹھاسکوں گی۔ میری زندگی کا کیا پتا اور یہ
 مران۔ یہ میرا لحاظ نہیں کرتا۔ موڈ ہو تو ٹھیک ورنہ تو کون میں کون۔ اور یہ بشری۔" انہیں بہت کچھ سوچنا تھا
 اور دل غم تو جیساؤف ہوتا جا رہا تھا۔ اس بشری کو کون سمجھائے۔ میں تو ہار گئی اس کے آگے۔
 ہاں وہ انسپکٹر طارق بھلا شخص ہے۔ وہ اگر اس کو مثال کو عدیل کو دینے کی دھمکی دے تو۔ شاید انہیں راہ
 نبھانی دی تو وہ سوچنے لگیں۔



گھر میں ایک دم سے گھبرانا مچا گیا تھا۔ سب مہمان ایک ایک کر کے چلے گئے تھے۔
 اور نسیم جو سوچتی تھیں جس رات فوزیہ کو رخصت کریں گی۔ اس رات وہ خوب مزے سے سوئیں گی۔ سکون
 جیسا انہیں اس رات نصیب ہو گا جیسا سکون انہیں کسی اور بات سے نہیں مل سکتا۔
 مگر اب تو انہیں گھر کی طرف دیکھ کر خوف سا آ رہا تھا۔ پورا گھر بھامیں بھامیں کر رہا تھا۔
 سارا فنکشن ہوٹل میں تھا۔ گھرانہ چھوٹا اسی طرح صاف ستھرا رہا تھا جیسے وہ پھر کو فوزیہ پارلر جانے سے پہلے
 اپنی عمرانی میں صاف کروا کے گئی تھی۔
 "یہ عدیل کہاں رہ گیا۔" دونوں ہاتھوں سے پنڈلیوں کو دباتے ہوئے انہوں نے کوفت سے سوچا۔
 "ایسا گویا تم بدھ بنا پھر تارا ساری شادی میں اس نے پوچھا سبھوں نے سوال کیے اب میں اس سے کچھ
 کہوں گی تو بھڑک اٹھے گا اس ذرا سی چھو کمری کے عم میں پاگل ہوا جا رہا ہے۔"

وہ کڑھ کر سوچتی چلی گئیں۔
 پھر کچھ سوچ کر فون اٹھا کر بشکل عدیل کا نمبر نکال کر ملانے لگی تھیں کہ گھر کا گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔ فون رکھ
 کر اس کا انتظار کرنے لگیں۔
 "میں بس وہ ہوٹل والوں کا کچھ حساب رہ گیا تھا۔ وہی کایئر کرنے میں کچھ ٹائم لگ گیا۔" وہ بے حد تھکا ہوا سنجیدہ
 اور بہت اجنبی سا لگ رہا تھا۔ نسیم بگم جو بہت کچھ سوچے ہوئے تھیں کہ عدیل کو خوب سنائیں گی کہ آج اس بشری
 کی وجہ سے کیسے کیسے انہیں خاندان بھری باتیں سننا پڑیں مگر عدیل کو اتنا سنجیدہ دیکھ کر کچھ ایسا بول ہی نہ سکیں۔
 "تھک گئے ہو بہت۔" وہ یہی کہہ سکیں۔

"ہاں" وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔
 "آجاتی مثال بھی۔ وہ بشری سے بھیج دیتی تو وہ پھوپھی کی شادی تو دیکھ لیتی۔ فوزیہ آخری لمحے بھی جاتے ہوئے
 مثال کی راہ دیکھتی رہی۔" صرف عدیل کے مزاج کا درجہ بھانپنے کے لیے انہوں نے اس طرح مثال کا ذکر چھیڑا۔
 عدیل کچھ نہیں بولا۔

دونوں بالکل خاموش تھے۔
 نسیم بیگم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اب کیا بات کریں جس سے عدیل کا مزاج کچھ کھلے اور عدیل کے پاس تو
 جیسے کوئی بات ہی نہ رہی تھی کرنے کو۔ "وہ سلٹی کی دونوں بیٹیوں کو دیکھا تم نے لگتا ہی نہیں اتنے سال کینڈا میں
 رہ کر آئی ہیں وہ لڑکیاں۔" نسیم نے موضوع کے لیے راہ ہموار کی۔
 "ہی! آپ کو کچھ چاہیے تو نہیں۔ میں تھک گیا ہوں کافی سوئے جا رہا ہوں۔" اس نے جیسے نسیم کی بات سنی

"مثال کو کچھ دنوں کے لیے باپ کے پاس بھیج دو۔" ایک گھرا سانس لے کر بدقت وہ بات زبان پر لے آئیں۔
 بہت دنوں سے دل کے اندر کے جارہی تھی۔
 "ہرگز نہیں، کبھی نہیں۔" وہ تڑپ کر بولی۔
 "بات سن لو پہلے میری پوری۔" وہ سختی سے بولیں۔
 "امی! کچھ نہیں سنوں گی میں۔" وہ قطعیت سے بولی۔
 "مثال کی شکل دیکھی ہے تم نے؟" ذکیہ نے دل گیری سے کہا۔
 بشری ایک دم سے کچھ بولی نہیں سکی۔

"گھبرا ہوا ہے اسے۔ وہ ٹھیک ہے۔ خوش ہے۔" وہ کچھ بچھے ہوئے لہجے میں بولی۔
 "کیا خوشی اسی کو کہتے ہیں، ٹھیک ہونا یہ ہوتا ہے پچی سرسوں کا پھول بنی ہوئی ہے۔ کھلائی ہوئی، مرجھائی ہوئی۔
 چھوٹی سی پچی اور اس کا چہرہ دکھو جیسے اسے ہنسے ہوئے زمانے گزر گئے ہوں۔" ذکیہ آنکھوں میں نمی بھر کر بولیں۔
 "امی! بشری کے ہونٹ کانپنے اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔
 "ابھی کچھ دن لگیں گے اسے سب کچھ سمجھنے میں۔ سیٹ ہونے میں۔" وہ ذرا دیر بعد جیسے خود کو ڈھارس دیتے
 ہوئے بولی۔

"اور کتنے دن۔ بشری! عقل کو ہاتھ مار بیٹا، وہ پچی تم دونوں کے ساتھ بہت بلی ہوئی ہے۔ وہ تم دونوں کے بغیر
 نہیں رہ سکتی۔ سوچ ڈر۔" ذکیہ دہائی دے کر بولیں۔
 "لیکن امی! اب اسے رہنا ہو گا۔" بشری خود کو جیسے مضبوط کرتے ہوئے قطع لہجے میں بولی۔
 "تم دونوں کی غلطی کی سزا اس ننھی جان کو ابھی سے کیوں دے رہی ہو تم۔" ذکیہ جتانے والے انداز میں
 بولیں۔

"ہم دونوں کی غلطی؟" وہاں کی غلطی پکڑ کر بولی۔
 "میری کیا غلطی ہے کہ میں چپ چاپ آپ کی دی ہوئی مٹھائی کا ٹوکرا پکڑ کر ان کے پاس چلی گئی جو آپ نے
 مجھے کہا۔ وہی جا کر بول دیا۔" وہ بے میری غلطی؟ "وہ اس دن کا وہ سب ترین منظور ہوا کر بولی جسے سوچتے ہوئے بھی اس
 کی آنکھوں میں کڑیاں چھینے لگتی تھیں۔
 اس نے پھر سے منہ دوسری طرف کر لیا۔

"جو ہوا سو ہوا۔ اب اس کو جتنا کہنے میں گے تکلیف ہی بڑھے گی۔" ذکیہ بات پھانسنے کے موڈ میں تھیں۔
 "صرف میری تکلیف۔" بشری اضطراب سے بولی۔
 "اتنی خود غرض مت بنو۔" ذکیہ سے برداشت نہیں ہوا۔
 "پہلے دن سے میں۔ تمہارا بھائی تمہارے ساتھ ہیں۔ دن رات کا سارا آرام سکون چین سب تمہاری ایک
 آنکھ کے اشارے سے جڑا ہے تم روٹی ہو، ہم روتے ہیں۔ تم مسکراتی ہو تو ہمیں چین کا سانس آتا ہے۔" ذکیہ
 بہت کچھ اُسے گوا کر بولیں۔

"امی! اب میری سمجھ میں آ رہا ہے۔ کہ عورتیں گھر والوں کے ہوتے ہوئے بھی دارالامان کیوں جاتی ہیں۔"
 وہ اذیت پسندی سے بولی۔
 "بشری! ذکیہ کو تو جیسے کسی نے پتھر کھینچ کر مار دیا۔" یہ سمجھتی ہو تم؟ "وہ دکھ کے گہرے سمندر میں اتر گئیں۔
 "امی! میں مثال کو اس شخص کے پاس اس گھر میں نہیں بھیجوں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ اب کوئی مجھے
 مجبور نہیں کرے گا۔ میں عدت گزاروں گی یہاں۔ اس کے بعد میں کچھ نہ کچھ سوچ لوں گی۔ آپ دونوں پابوہ

ہی نہیں۔ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔
"نہیں۔ ماں بائی کا گلاس لادو روز تو فوزیہ رکھتی تھی ابھی سوچا بھی تھا کہ خود جا کر لے کر آتی ہوں پھر مجھ سے
لہجے میں مسکینی سمو کر نسیم کہنے لگیں مگر عدیل اس سے پہلے ہی پالی لینے جا چکا تھا۔
گلاس نسیم کے سر ہانے رکھ کر وہ کچھ کئے بغیر مڑ کر جانے لگا۔
"عدیل! نسیم کو اکیلے پن سے عجیب سی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔
"میں تو کہتی ہوں کل کسی طرح جا کر مثال کو لے آؤ مجھ سے تو گھر کا سونا پین دکھا نہیں جا رہا۔" وہ لہجے میں نرمی کی
لیے ہوئے بولیں۔

عدیل نے پہلے عجیب سی نظروں سے ماں کو دیکھا پھر کچھ بھی جواب دے بغیر خاموشی سے چلا گیا۔
"اب کیا ہو گا۔ یہ لڑکا تو بہت عجیب سا ہو گیا۔ مجھے تو اندازہ نہیں تھا کیسے یہ کھلے گا۔ اس کے دل میں کیا ہے وہ
پچی گھر آئے گی تو شاید یہ ٹھیک ہو جائے۔ بعد میں شادی کر دوں گی خود ہی پچی کی طرف سے دھیان ہٹ جائے گا تو
اسے بشری کے پاس واپس بھیج دوں گی۔" نسیم کو فوراً یہ اس مسئلے کا سوجھا۔

جی فرمائیے :

"ہمیں آپ کا اوپر والا پورشن دکھانا تھا۔ عاصمہ دروازہ کھول کر کچھ متبذب سی کھڑی رہ گئی۔
سامنے کھڑی عورت ارجیتر عمر تھی۔ پینتالیس چھیالیس سال کی۔ حلیے سے اچھے کھر کی گلگ تھی۔
اس کا چہرہ اس کی آنکھیں اسے بہت عجیب سی لگیں۔ جانے کیوں بظاہر وہ اتنے اچھے لباس میں تھی۔ دونوں ہاتھوں
میں سیاہ اور سفید کالج کی ساٹھ چوڑیاں تھیں۔ باقی اس نے کوئی زیور نہیں پہن رکھا تھا۔
"آپ کو کس نے بھیجا ہے یہاں۔" اب اسے کچھ تو پوچھنا تھا۔
"الیاس بھائی نے۔ انہوں نے کہا تھا کہ آپ کا اوپر والا پورشن خالی ہے۔" وہ ذرا بھاری آواز کی مالک تھی۔
اس کے ہاتھ پر گہری گہری دھتین لکیریں تھیں۔

یہ جھرتیاں تھی نہیں تھیں کہ اس کے چہرے کی باقی جلد کسی ہوئی تھی۔
"آپ کے ساتھ کون ہے۔" اس کے ساتھ کوئی بھی نہیں تھا۔
"ہر کسی کے ساتھ کوئی نہ کوئی تو ہوتا ہے خواہ اس کا ہمراہی کیوں نہ ہو۔" طئزیہ انداز میں ہنسی تھی۔
"جی؟ عاصمہ ٹھنہک کر رہ گئی۔

"ناوت ہے میری مذاق کرنے کی۔" اگرچہ یہ مذاق نہیں تھا مگر اس عورت کو لگا تھا تو خود ہی مزے لے کر بولی۔
"وہ میری اماں اور میری بہنیں ہیں میرے ساتھ۔ دونوں گاؤں گئی ہوئی ہیں دونوں میں آئیں گی۔ اس سے
پہلے تین گھنٹیاں چھوڑ کر وہ رہی تھیں۔ وہ مالک مکان۔ مطلب وہ آدمی۔" وہ رکھی جیسے کوئی موزوں سا باندہ سوچ رہی
ہو۔

"آدمی تو شاید بہتر ہو انسان اچھا بالکل نہیں تھا۔" وہ سر ہلا کر بولی۔
عاصمہ اس کی باتوں پر کچھ چکر اسی گئی۔ "میں سمجھی نہیں۔" عاصمہ نے دل میں سوچ لیا اس عورت کو گھر
بالکل نہیں دیتا۔

"اگر آپ مجھے گھر رکھاویں تو میں کچھ سوچ لوں کیونکہ مجھے گھر تاج ہی چاہیے۔" وہ عورت کچھ جھلت سے
بولی عاصمہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ صاف جواب کیسے دے۔
الیاس کو یوں اس عورت کو اکیلے نہیں بھیجنا چاہیے تھا۔

"ویسے میں آپ کی تعریف کرنا چاہ رہی تھی کہ آپ نے جس طرح اپنے شوہر کے بعد اپنے بچوں کو سنبھالا
ہے وہ واقعی قابل تعریف ہے۔" وہ عورت سخن میں آچکی تھی۔ کمروں سے جھلکتا سلیقہ اور صفائی دیکھ کر تعریفی
انداز میں بولی۔

"جی۔ آپ کو کیسے پتا چلا؟" عاصمہ کو کچھ حیرت ہوئی۔ "یہ آپ کے ماتھے پر جو بیوگی کی لکیر ہے بالکل معدوم
ہی جس سے اندازہ ہو رہا ہے کہ چند ماہ۔ سال پورا نہیں ہوا ابھی آپ کے شوہر کو مرے ہوئے۔ ہے نا؟" وہ
عاصمہ کے ماتھے پر انگلی پھیر کر بولی۔ عاصمہ کو جیسے کرنٹ لگا۔ اس کی انگلی برف کی طرح سرد تھی۔ اسے لگا جیسے
کسی نوک دار چیز نے اس کی پیشانی کو ذرا سا چھیل دیا ہو۔ اس نے بے اختیار اپنی پیشانی کو چھوا۔ "اور بھروسا ایک
بار جو ایسے ویسے مختص پر کر چکی ہیں۔ اس کے بعد آپ کا محتاط انداز آپ کے لیے بہت سود مند رہے گا۔" وہ
عاصمہ کی نظروں کو اپنے حصار میں لے کر بولی۔ عاصمہ جیسے اس کی نظروں کے گھیرے میں الجھ کر رہ گئی۔ سو اسے
اب بھیجنا چاہتی تھی۔ خود دور جانا چاہتی تھی۔ مگر اس عورت کی نظروں نے جیسے اسے بے بس کر دیا تھا وہ جیسے جکڑی
گھڑی تھی۔ سوہ عورت اس کی طرف دیکھتے ہوئے پللیں بھی نہیں جھپک رہی تھی۔ عاصمہ شدت سے دباں سے
بنانے کی خواہش مند تھی مگر اس کے دونوں پاؤں زمین نے پکڑ لیے تھے۔ "ابھی چند مہینے تمہیں نوکری نہیں ملے
گی بلکہ سال بھر تو ہے ہی نہیں ایسا کوئی سلسلہ۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر ہولے سے گہری آواز میں
بولی۔ عاصمہ تو کچھ بول ہی نہیں پاری تھی۔ "میں اچھا کرایہ دوں گی اور یہ اس کا ایڈوانس اور یہ دو مہینے کا کرایہ۔
بس میری صرف ایک شرط ہے کہ اوپر نہیں آؤ گی اور نہ تمہارا کوئی بچہ ورنہ مشکل ہو جائے گی ہم دونوں کے
لیے۔" وہ اپنے برف جیسے سرد اور سنگھان ہاتھ سے عاصمہ کے ہاتھ میں رٹم تھما چکی تھی۔

"ویسے ہم دونوں بہنوں کی طرح رہیں گی۔ تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔" اس نے آہستہ سے
عاصمہ کے چہرے پر پھونک ماری۔ پللیں دوبارہ جھپکیں اور یونہی اس کی طرف لگا جیسے وہ کسی کی سخت
گرنٹ سے آزاد ہوئی ہو۔ اسے کسی نے دھکا دے کر پرے کیا ہو۔ وہ جھمر جھری سی لے کر پیچھے ہوئی۔

"یہ لو پمے حساب کتاب تو ماں جی میں ہی جٹا ہے۔" وہ بڑے بے تکلف انداز میں بولی۔ عاصمہ حرزہ سی یونہی
نوں کو ہاتھ میں پھرانے لگی۔ ورنہ اسے کوئی کتنی کوئی حساب کتاب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ "میرا نوکرا ابھی
میرا سامان لے کر آ رہا ہے۔ باہر سے بیڑھیاں ہیں نا۔ اس لیے مجھے تمہارا یہ گھر پسند آیا ہے۔ پھر اس کی چھت بھی
ہے۔ مجھے ایسا ہی گھر چاہیے تھا جس کے اوپر کھلا آسمان ہو۔" وہ سر اٹھا کر اوپر والے پورشن کو دیکھے جا رہی
تھی۔ "چاہاں؟ اس نے ہاتھ عاصمہ کے آگے پھیلا دیا۔ عاصمہ خاموشی سے اندر گئی اور دیوار سے لگی کیل پر لگی
چاہاں لا کر اس نے عورت کو تھما دیں۔ "ہوں بہت سمجھ دار ہو تم اور فرماں بردار بھی۔ تو وہ چاہاں مٹھی میں لے کر
جیسے خوش ہو کر بولی۔ "یہ اپنی چھوٹی بچی کو دودھ میں ملا کر دے دو۔ وہ کبھی بیمار نہیں ہوگی۔" اس نے دو سرا ہاتھ
کھول کر ایک پڑیا سی اس کے آگے کی۔ عاصمہ بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ "لے لو تمہارے نانڈے کی چیز ہے
بلکہ تم سب بھی اسے گھول کر ایک ایک گھونٹ پی لو تو کبھی کوئی بیمار نہیں پڑے گا تم سمجھ رہی ہو تاں میری
باتیں۔" کہتے ہوئے وہ بے تکلفی سے اندر کے کمروں کا چکر بھی لگا آئی۔ عاصمہ وہیں گڑھی کھڑی تھی۔ اس کے سر
میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔

"سر میں درد ہے تو لاؤ میں دبا دیتی ہوں۔ تمہارا سر۔" وہ اس کے سامنے آ کر بہت محبت بھرے انداز میں
بولی۔ عاصمہ لڑ کر پیچھے ہٹی۔

"نہیں اب میں ٹھیک ہوں۔" اس نے اپنی آواز اجنبی سی لگی۔ "تم ڈر تو نہیں گئیں۔" وہ لڑکیوں جیسی ہنسی
کے ساتھ بولی۔ عاصمہ ڈرے ہوئے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔ "میں اوپر ہوں۔ ابھی میرا نوکرا سامان لانے کا تو

میں باہر والا دروازہ کھول دوں گی۔ ہمیں زحمت نہیں ہوگی۔ وہ کہہ کر سیرھیوں کی طرف بڑھ گئی۔
"اور ہاں کوئی اوپر نہیں آئے گا۔ میری صرف یہی شرط ہے۔" وہ کہہ کر سیرھیوں سے عاصمہ کو دیکھتی رہی جیسے ابھی قے آجائے گی۔ مجھے اس عورت کو گھر میں نہ لانا چاہیے تھا۔ یہ عورت۔ اچھی لگتی ہے مگر مجھے کس کی اتنی جلدی بھروسا نہیں کرتا۔ وہ خود ہی نفی میں سر ہلا کر بولی۔ "مجھے ہاشم بھائی کہہ کر بھی گئے تھے کہ ڈیڑھ کے بچہ کو کسی کرائے دار کو گھر میں نہیں گھسانا۔ مگر یہ عورت یہ تو بہت بے ضروری ہے۔ مجھے اس سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔" اس کا دل عجیب طرح سے دورائے دے رہا تھا۔ اس نے مٹھی میں ٹھنڈے پینوں سے کیلے ہوئے نونوں کو سیدھا کیا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ جتنا کر ائیے پچھلے کرائے دار دیتے تھے یہ اس سے دو گنا تھا اور پھر دو ماہ کا لینڈ اس سے سب تو کوئی بھی نہیں دیتا۔ مگر یہ ایک ہی عورت۔ اور کوئی اوپر نہیں آئے گا۔ یہ کیا شرط ہوئی بھلا۔ مجھے ایسا بھائی سے بات کرنا چاہیے۔ مگر میں اچھی عورت ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہی ہونے لگیں۔ وہ وہیں آڑی ترچھی ہو کر لیٹ گئی۔ اور تھوڑی دیر میں وہ گہری نیند سو چکی تھی۔ نوٹ اس کے ہاتھوں میں کیلے پڑے تھے اور چھتہ کھڑی وہ عورت عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ کھڑی سوئی ہوئی عاصمہ کو دیکھے جا رہی تھی۔



"مگر انسپکٹر صاحب! میری بیٹی۔" وہ مثال کو مجھے واپس نہیں کرے گی۔ میں اس کی فطرت کو جانتی ہوں۔" بشری سخت متذذب تھی۔ انسپکٹر طارق مثال کو ساتھ لگائے کھڑا تھا۔
"محترمہ! آپ کو میرا اعتبار تو کرنا چاہیے میں نے آپ کو اپنی گارنٹی دی ہے۔ جس طرح اس گڑیا کو میں آپ سے لے کر جا رہا ہوں۔ اسی طرح میں اسے واپس آپ کو لادوں گا۔ رات کو یہ آپ کے پاس ہوگی یہ میرا وعدہ ہے آپ سے۔" انسپکٹر طارق پر اعتماد لہجے میں بولا۔ بشری نے متذذب نظروں سے ماں اور بھائی کی طرف دیکھا وہ نونوں کچھ گھنٹوں کے لیے مثال کو بھیجنے کے لیے راضی تھے۔ پھر یہ انسپکٹر طارق جس طرح اس نے بشری کو قائل کیا اور سچی بات ہے انسپکٹر طارق میں قائل کرنے کے علاوہ کچھ ایسی دھمکادینے والی صلاحیت تھی کہ بشری واقعی ڈر گئی تھی۔ قانون کے ذریعے عدیل مثال کو مستقل اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔ اور ہمارے ملک میں قانون پولیس ہی تو ہے۔ اور بشری کے سامنے یہ انسپکٹر ہی قانون تھا۔

ہانی کا ش! یہ سب کچھ کرنے سے پہلے بیٹی کی خوشی اس کی زندگی کا بھی سوچ لیتیں۔ فوزیہ تو اپنے گھر چلی گئی صرف چند دنوں کے فرق سے صرف چند دنوں کے لیے وہ اتنی خود غرض بے حس نہ ہوتیں۔ ان کا دل چاہا وہ باؤں میں بار بار کر رہیں اور عدیل کے سامنے اقرار کریں کہ آج جو اس کی حالت ہے اس کی ذمہ دار صرف اس کی خود غرضی ہے۔ مگر وہ بھی ہو جائیں تو اولاد کی زندگی اسی طرح بخر اور رویراں ہو جایا کرتی ہے۔
"اب عدیل! اب ہم نے مثال کو واپس نہیں بھیجا۔ ہم دونوں ماں بیٹا اسے مل کر پال لیں گے۔ ہماری گڑیا ہمارے پاس ہی رہے گی۔" دل کم بخت اور ضمیر بد تیز کے شروع عمل سے گھبرا کر نسیم نے جھپٹ کر مثال کو اپنے ہاتھ لگاتے ہوئے عدیل سے کہا۔ "نہیں امی! عدیل آنکھیں صاف کرتے ہوئے آہستہ سے مسکرایا۔
"ہم یہ نہیں کر سکتے۔"

"کیوں نہیں کر سکتے لو ہماری بیٹی ہے ہمارا مال۔ کوئی اور حق جتا نہیں سکتا۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولیں۔ عدیل ماں کو دیکھ کر رہ گیا۔ "حق جتانے کے قابل رہا ہی کب ہوں میں۔" وہ گہرے دکھ سے بولا۔ "بابا! میں اب کے پاس ہوں نا۔" مثال بے اختیار باپ کے ساتھ لگ کر بہت تسلی بھرے انداز میں بولی۔
"ہاں میری بیٹی میری جان میرا سب کچھ تم ہی تو ہو۔ تم ہو تو ہمارے بابا کے سینے میں بھی دل دھڑکے جا رہا ہے۔ تم مجھ سے چھن جاؤ گی نا تو یہ دل بھی چپ ہو جائے گا۔" وہ اسے ساتھ لگا کے جذب کے عالم میں بولا۔
"اللہ نہ کرے عدیل! میرے بچے! تو باپ سے تو میں بھی تیمی ماں ہوں۔ ایسا التا سیدھا بولتے وقت میرا بھی خیال کر لیا کر۔" نسیم بیگم پیار بھری دھونس سے بولیں۔ عدیل صرف مسکرا کر رہ گیا۔

"اب میری بیٹی بتائے آج کہاں کہاں جانا ہے شاپنگ پر پہلے اور پھر پلے لینڈ میں آؤں کہ ہم اور جو کچھ میری گڑیا کے گی۔"
"بابا! ہم گھر میں رہتے ہیں یاں داد کے پاس۔ یہ بھی تو اکیلی ہیں۔" جو بات عدیل نہیں محسوس کر سکا تھا۔ وہ چھوٹی سی بیٹی نے جان لیا۔ نسیم کی آنکھوں سے تو آنسو ہی بننے لگے عدیل بھی چپ ہو گیا۔
"جان! آج میں نے آپ کی خاطر آفس سے چھٹی کی ہے۔ ہم تھوڑی دیر میں آجائیں گے تو پھر داد کے پاس ہی ہوں گے۔" وہ بھی کو ہلا کر بولا۔
"بلکہ امی! آپ بھی ہمارے ساتھ چلیے نا آپ تو کہیں بھی آتی جاتی نہیں۔" ماں کی دل جوئی کے خیال سے وہ کہہ ہی گیا۔

"نہیں۔ عدیل! یوں بھی ابھی فوزیہ اور خالد نے آنا ہے ملے گھر رہیں ہوں گی تو اچھا نہیں لگے گا۔ اگلے ہفتے انہوں نے چلے جانا ہے تم تھوڑی دیر کے لیے مثال کو لے جاؤ پھر یہ آکر پھوپھی سے بھی مل لے گی جا! میری گڑیا! کچھ وقت باپ کے ساتھ گزار لے۔" وہ دل سے مثال کو پیار کرتے ہوئے بولیں۔ "ہاں یہ دن بھی آنے تھا۔ وقت گزارنے کو میرے بچے نے ترنا تھا اپنی بیٹی کے ساتھ۔" وہ انہیں جانتے دیکھ کر آہ سی بھر کر بولیں۔
"سب میری جلد بازیوں کے رنگ ہیں۔" اس سے پہلے کہ پھر سے ضمیر تارنا شروع کرے۔ وہ یوں ہی اٹھ کر صحن میں نسلنے لگیں۔

"فوزیہ اور خالد آئیں گے تو کھانے کے لیے کیا ہوگا۔ میں نے عدیل سے کہا بھی نہیں کہ آتے ہوئے کچھ لے آئے اتنے دنوں سے ماں بیٹا جس طرح بازار کی روٹیاں کھا رہے ہیں۔ سالن تو جیسے تیسے بنا لیتی ہوں۔ یہ مگر مستقل حل تو نہیں مجھے دو چار دنوں میں عدیل سے بات کرنا ہوگی وہ اگلے کی بلانگ سوئے لگیں۔
"بلکہ فوزیہ سے کتنی ہوں۔ وہ عدیل سے بات کرے۔ میری بات یہ تو بھڑک اٹھے گا۔ مگر فوزیہ کی بات کم از کم تحمل سے سن تو لے گا۔ یہ صحیح رہے گا۔ اب فوزیہ آئی تو اس سے بات کرتی ہوں۔ بھائی یہ گھرداری کے سلسلے مجھ

وہ ساری رات بابا بابا پکارتی رہی تھی۔ اگرچہ صبح اٹھ کر اس نے باپ کے پاس جانے سے انکار بھی کیا تھا۔ مگر بشری جانتی تھی کہ اس معصوم کا دل کیسے باپ سے ملنے کے لیے تڑپ رہا ہے۔ اتنے سارے دن تو وہ عدیل سے ملے بغیر کبھی بھی نہیں رہی تھی۔ مثال کی شکل اس کی زرد رنگت اور کبھی ہوئی آنکھوں نے اس کے لیے اس مشکل فیصلے کو جیسے آسان کر دیا تھا اور پھر چند گھنٹوں کی کیا بات تھی۔ تین بجے سے۔ شام سات آٹھ بجے تک۔ مثال پھر اس کے پاس ہوگی۔ اس نے دل پر پھر رکھ کہاں کہہ دی۔ عمران اور انسپکٹر طارق مثال کو لے کر چلے گئے اور وہ آنسو چھپانے کے لیے وہاں سے اٹھ کرھاگ گئی۔ عدیل کے لیے یہ لمحات نا قابل یقین تھے۔
اتنے سارے دنوں کے بعد اس کی مثال اس کی زندگی اس کی زندگی کا مقصد سب کچھ اس کی بیٹی مثال اس کی بانہوں میں تھی۔ وہ یا گلوں دیوانوں کی طرح اسے جوئے جا رہا تھا۔ پیار کیے جا رہا تھا۔ کبھی رو رہا تھا۔ کبھی نہیں رہا تھا۔ بیٹی کی دیوانگی دیکھ کر نسیم کی بھی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ یوں سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے پہلی بار بڑے ملال اور دکھ کا شکار ہوئیں۔ کاش! وہ اپنے بیٹے کو ایسے مستعل نہ کرتیں۔ کاش! وہ فضول ضد ان کے داغ میں کبھی

بروہیا سے نہیں چلنے والے۔" وہ خود ہی اپنے آپ سے باتیں کرتے اور ہر اوہر سہلٹی نی وی کار سموت اٹھا کر ادا چلا کر یونسی چینل گھماتے ہوئے کچھ سوچتی چلی گئیں۔

"یہ اچھی عورت نہیں ہے۔" واثق شام کے دھلے کپڑے اتار کر لایا تو ماں سے بولا۔
"آنا گوندھتی عاصمہ چونک کر رہ گئی۔"

"کون سی عورت؟" وہ لمحہ بھر کو سمجھ نہیں سکی۔
"جو عورت آپ نے رہنشمہ رکھی ہے۔" وہ منہ بنا کر بولا۔
"رہنشمہ پر عورت۔" عاصمہ کی ہنسی نکل گئی۔

"بیٹا اچھی عورت ہے یوں نہیں کہتے۔" وہ سمجھانے کو بولی سوا واثق طریقے سے اپنے اور بہنوں کے کپڑے الگ کرنے لگا۔

"میں جو کہ رہا ہوں وہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ کس طرح کی ہے۔ مطلب ماما آئی ایم کنفیوڈڈ۔ میں کیسے کہوں۔ she looks بہت عجیب سی دکھتی ہے اور اس کی آنکھوں میں ماما آپ سے نہیں رکھیں۔" وہ پوچھ جو بہت سمجھ دار بہت سانا بچہ تھا اس عورت کے الگ ہونے کو بھلا کیسے محسوس نہ کرنا۔ عاصمہ ٹھنک کر رہ گئی۔
"تم اس سے ملے تو نہیں؟" ایک دم سے اسے۔ خوف نے گھبرائو واثق کا بازو سختی سے پکڑ کر بولی۔
"نہیں ماما۔" ماں کے انداز سے کچھ ڈر کر بولا۔

"میں نے صرف اسے دیکھا تھا اور۔" وہ بولتے ہوئے رک گیا۔
"اور کیا دیکھا؟" وہ کچھ خوف زدہ سی تھی۔

"مجھے نہیں پتا ماما پر کمرے میں دھواں سا تھا۔" وہ رک کر بولا۔

عاصمہ اور بھی پریشان ہو گئی۔ اس کی ذہنی ہوتی رقم سے وہ جا کر تھوڑا بہت راشن لے آئی تھی اگرچہ اس کا نہیں مان رہا تھا مگر صرف یہی سوچ کر کہ الیاس بھائی سے جا کر کہوں گی کہ کسی اور کرائے دار کو ڈھونڈیں مگر۔
"نورا" یہ خرچ کی ہوئی رقم کہاں سے بھرے گی رات سے گھر کا راشن بھی ختم تھا۔ نوکری کا کوئی سلسلہ نہیں تھا خالی ٹیوشن سے گھر تو نہیں چل سکتا تھا۔ بجلی اور گیس کے بل بھی جمع کر دانے والے تھے۔
"ماما کیا سوچنے لگیں آپ؟" واثق ماں کو گہری سوچ میں گم دیکھ کر بولا۔

"میں جا کر الیاس انکل کو بلا کر لاؤں۔" وہ ماں کا چہرہ پڑھنے لگا تو بخوبی جان گیا تھا تسلی دینے والے انداز میں بولا۔
"واثق میں کچھ رقم خرچ کر چکی ہوں اس عورت کے ایڈوانس سے۔" اسے بھی واثق سے اپنی پریشانی کہہ دینے کی عادت ہو گئی تھی۔ رہا نہی ہو کر بولی۔

"تو وہ تو ہم نئے کرائے دار سے لے کر انہیں واپس کر دیں گے۔ آپ باقی کی رقم خرچ نہیں کریں۔" وہ چٹکی بجاتے ہی مسئلہ حل کرتے ہوئے بولا۔

عاصمہ مسکرا دی۔ اس کا بیٹا واثق بہت سمجھ دار تھا جو بات سامنے رکھی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔
"ہوں ٹھیک ہے جاؤ بڑا کر لاؤ ایسے میں خالہ حمیدہ بوتیں تو مجھے اتنی پریشانی نہیں ہوتی۔ وہ سارا معاملہ سنبھال لیتی ہیں اب تو اکیلی ہی پڑنے لگی ہوں میں پتا نہیں وہ کب آئیں گی۔" وہ بڑبڑا کر بولی۔

"میں جو ہوں ماما آپ کے ساتھ۔" وہ بڑے عزم سے بولا۔ عاصمہ کو واقعی اس پر فخر سا ہوا۔ اس عورت نے جس طرح عاصمہ کو تربیت کر کے گھر حاصل کیا تھا اگر وہ واثق کو تاویلی تو شاید وہ ڈر جاتا۔

"امی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں یہ تو میرے جیتے جی ممکن نہیں۔" بشری تڑپ کر بولی۔
"ذکیہ نے اس کی بات یوں سنی جیسے اس نے بہت معمولی سی بات کی ہو۔" یا جیسے انہیں پہلے ہی پتا تھا کہ بشری یہی کہے گی۔

"نہیں امی! وہ پھر زور دے کر بولی۔
"آج نہیں تو کل۔ کل نہیں تو کچھ مہینوں بعد تمہیں اس بات کو سوچنا ہوگا۔" ذکیہ بے نیازی سے بولیں۔ بشری شانڈھی ماں کو دکھتی رہ گئی۔

"بہر حال تم ساری زندگی یوں ہی تو نہیں بیٹھ سکتیں۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے اور بچی کا ساتھ اس سے بہر حال تحفظ کے لیے اور پرورش کے لیے ایک مرد کے سارے کی ضرورت پڑے گی تمہیں یہ سوچنا ہی ہوگا۔" ذکیہ نے بہت طریقے سے یہ سب کہا جیسے بشری جو بھی رد عمل ظاہر کرے انہیں فرق نہیں پڑے گا۔ بشری نے ناراضگی سے ماں کی طرف دیکھا۔

"میں ایسا کبھی نہیں کروں گی میں فیصلہ کر چکی ہوں۔" وہ پھر سے سخت لہجے میں بولی۔
"تمہاری عدت کچھ دنوں میں ختم ہونے والی ہے دو ایک جگہ میں نے بات چلائی ہے اور مجھے امید ہے۔"
"امی۔" وہ اتنی زور سے چیچی کہ بستر برسوی مثال بھی ڈر کر اٹھ بیٹھی۔
"ماما۔ کیا ہوا؟" اس کی نیند بہت کچی ہو گئی تھی۔ سزا سے کھٹکے سے ڈر کر اٹھ جاتی تھی۔
"کچھ نہیں میری جان تم سو جاؤ کچھ نہیں ہوا۔" وہ اسے ساتھ لگا کر تھکنے لگی۔ ذکیہ مطمئن سی بیٹھی تھیں۔
"تمہیں بتا ہے سیم عدل کے لیے لڑکی دیکھتی پھر رہی ہے۔" وہ اپنے تئیں دھماکا کرتے ہوئے بولیں۔ بشری کے ہاتھ مثال کو تھکتے وہیں رک گئے۔

"وہ اپنے بیٹے کا کر سکتی ہے تو میری بچی تم تو پوچھ۔"
"امی اس سے آگے کچھ نہیں۔" وہ سخت لہجے میں ماں کو ٹوک کر بولی۔
"میرا عدت ختم ہو جائے تو آپ عمران کی شادی کی تاریخ رکھیں۔ اس کی شادی کریں میں کہیں بھی جاؤ کر لوں گی اور اوپر والے کمرے میں چلی جاؤں گی۔ آپ اور آپ کے بیٹے سو کی زندگی میں دخل نہیں دوں گی۔ اس لیے آپ مجھ سے دوبارہ یہ سب نہیں کہیں گی۔" وہ حتی انداز میں بولی۔

"بشری تم سمجھ نہیں رہیں میری بچی یہ پہاڑی عمریوں نہیں گزرے گی، تمہیں ایک ساتھی کی اور مثال کو ایک باپ کی ضرورت ہے۔" وہ اب کے کچھ عاجزی سے بولیں۔
"عدل جیسا باپ مل سکتا ہے مثال کو کہیں۔" وہ طنز سے بولی۔

"نہیں" ذکیہ قطعیت سے بولیں۔
"مگر اس کے باوجود اسے ایک باپ کی چھت چاہیے۔ تو تمہیں ایک مرد کا تحفظ۔"

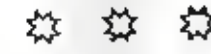
"امی مجھے نیند آرہی ہے مجھے سونے دیں۔ پلیز!" وہ اکٹا کر بستر لیٹتے ہوئے بولی۔
"اسکینڈ طارقی شادی کرنا چاہتا ہے تم سے۔" ذکیہ نے اپنے تئیں ایک اور ہم پھوڑا۔ اور بشری ساکت سی ماں کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

"امی یہ کیا کہا آپ نے۔" وہ خوف زدہ سی سوئی ہوئی مثال کو ایک نظر دیکھ کر بولی۔
"وہ شادی شدہ ہے لیکن بیوی کی سال بھر پہلے بچے کی ڈیلیوری کے دوران موت ہو گئی تھی بہت سلجھا ہوا سمجھ

دارِ محض پھر خاندان بہت اچھا ہے مثال سے تمہاری محبت اور دلبستگی سے بھی بخوبی واقف ہے اس لیے اس رشتے میں رکاوٹ نہیں بنے گا کہ۔ تم سے مثال کو دور کر دے۔ ”ذکیہ بہت مطمئن تھیں۔ یہ رشتہ حقیقتاً ”ذکیہ کے لیے کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ ایسا اچھا خوب رو جوان پھر ایسی نوکری ”اچھا گھر“ خاندان“ سمجھو تو کنوارا بشری کو اس سے اچھا رشتہ کہاں سے مل سکتا تھا۔

انہوں نے تو دل میں سوچ لیا تھا چاہے کوئی بہت بڑا ڈراما کرنا پڑے اپنی جان لینے کا وہ بشری کو مجبور کر کے ہی چھوڑیں گی طارق کا ہاتھ تھامنے کے لیے۔ جب سے اسپیکر طارق نے یہ پیغام دیا تھا ذکیہ تو ہلکی پھلکی ہو گئی تھیں۔ اب انہیں صرف بشری کی عدت ختم ہونے کا انتظار تھا۔

”انی! آپ انہیں انکار کر دیں ورنہ میں کہہ دوں گی کیونکہ مجھے دو سری شادی نہیں کرنی۔ کبھی نہیں پہلی نے جتنے دکھ دیے ہیں۔ اس کے بعد میں ایسا سوچوں گی بھی نہیں اور آپ مجھے مجبور نہیں کر سکتیں۔“ کہہ کر وہ کوشلے کر لٹ گئی ذکیہ وہیں بیٹھی کچھ سوچی رہیں۔



عاصم کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ یوں ہی عشاء کی نماز کے بعد لیٹے لیٹے سی آئی۔ ابھی کچن میں برتن بھی دھونے والے تھے اور بچوں کے یونیفارم بھی استری کرنے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد اس کی آنکھ کھلی تو بچے بھی سوچکے تھے وہ جلدی جلدی اٹھ کر کام بنانے لگی۔ برتن دھو کر کچن صاف کیا اور کچن بند کر کے کمرے میں آکر کپڑے استری کرنے لگی۔ بارہ بجے کو تھے۔

اس نے بچوں کے اوپر کبیل ڈالا اور خود باہر نکل آئی۔ باہر کافی خشکی سی تھی۔ وہ یونی شہلے لگی۔

بےوجہ ہی عفتان کی یاد ستانے لگی۔ اس کی آنکھیں بھینکنے لگیں۔

”عفتان! میں بہت شہلے لگی ہوں ابھی سے ابھی تو آپ کے بعد چند قدم بھی نہیں چلی اور لگتا ہے یہ سڑک بھی تمام نہیں ہوگا۔“ وہ ٹھنڈی دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیے یونی روئے گئی۔

ایک دم سے اسے زور کی کھانسی آئی اور پھر آئی ہی چلی گئی۔

وہ منہ کے آگے ہاتھ رکھے کھانسی کو روکنے لگی۔

صحن میں سرخ رنگ کا دھواں سا پھیلا ہوا تھا۔

وہ ایک دم سے ڈر گئی۔

”سرخ دھواں۔ تو نہیں ہوتا۔“ وہ تیزی سے بچوں کے کمرے کا دروازہ بند کرنے دوڑی۔

مگر اسے مسلسل کھانسی آتی جا رہی تھی۔

”یہ اس وقت کس نے کیا جلایا ہے۔ کیا ہے یہ۔“ اس نے بمشکل آنکھیں کھولنے کی کوشش کی دھواں ان کی اپنی چھت سے آرہا تھا۔

وہ خوف زدہ سی کھڑی رہ گئی۔

لحمہ بہ لحمہ دھواں بڑھتا جا رہا تھا۔

”یہ طبیعت عورت کر کیا رہی ہے آخر؟ آخر یہ کوئی وقت ہے آگ جلانے کا۔ میں منع کرتی ہوں اسے جا کر۔“

وہ آخر برداشت نہ کر سکی تو تیزی سے بیرونی دروازہ کھول کر آہستہ قدموں سے اوپر کی سیڑھیاں چڑھ کر میں کوئی نہیں تھا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔

وہ کچھ دیر باہر کھڑی رہی آگے بڑھے یا واپس چلی جائے پھر وہ آہستگی سے بند دروازے کی طرف بڑھی۔ کمرے کی کھڑکی ذرا سی کھلی تھی اور دھواں وہیں سے نکل رہا تھا۔

اس نے ذرا سا آگے ہو کر دیکھا اور سائکس کی کھڑکی رہ گئی۔ اندر کے عجیب منظر نے اس کو جیسے وہیں کھڑکی کے ساتھ جکڑ دیا۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہ گئی۔



”اسپیکر طارق! اس نے تو آنکھیں بند کیں اور چھم سے اس شخص کا سراپا اس کے سامنے آگیا۔

وہ دوبار اس شخص سے ملی تھی مگر اسے ایسا کچھ محسوس نہیں ہوا تھا۔

”ہی جو کچھ کہہ کر گئی ہیں۔ اس بات میں کتنی حقیقت ہوگی بھلا؟“ وہ سوچنے لگی۔

”ہو بھی تو مجھے نہیں سوچنا۔ میں کیوں سوچ رہی ہوں یہ سب جب مجھے اس شخص کے بارے میں یادو سری شادی کے بارے میں سوچنا ہی نہیں تو۔“ اس نے خود کو جھڑکا۔

”دو سری شادی۔ آہ!“ اس نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔ عدیل کے علاوہ عدیل کے سوا۔ ایک شخص تھا جو اس کی زندگی میں عدیل سے بہت پہلے آیا تھا اور اس نے اس کو بہت سوچا اور چاہا ابھی تھا۔ مگر وہ تو بہت پہلے کی بات تھی عدیل سے پہلے کی بات۔

عدیل کے بعد تو اس نے کبھی بھول کر بھی اس گزرے کل کو نہ سوچا تھا۔ نہ چاہا تو پھر یہ تیسرا شخص کہاں سے بیچ میں آگیا۔

”نہیں مجھے نہیں سوچنا میں ہی۔ نہیں میں طارق سے بات کر کے اسے صاف خود انکار کر دوں گی ورنہ ای تو سمجھا سمجھا کر مجھے بالکل کرویں گی۔ ماں باپ الگ الگ کر دینے کے بعد میں اپنی بیٹی کو کسی تیسرے اجنبی شخص کے حوالے کروں۔ کبھی نہیں۔“ وہ فیصلہ کر کے مطمئن سی ہو کر سونے کی کوشش کرنے لگی کہ گیٹ پر پہنچنے میں نے اسے چونکا دیا۔

”اس وقت کون آسکتا ہے بھلا۔“ بارہ بج چکے تھے۔

تین بار مسلسل بیل کے بجنے پر اسے مجبوراً اٹھنا ہی پڑا شاید عمران بھی آج جلدی سو گیا ای نے تو نیند کی گولہ لی ہوگی۔

”کیس عدیل تو نہیں۔ نہیں وہ نہیں ہو سکتا۔ گیٹ کے پاس پہنچ کر وہ سوچنے لگی۔

پھر سے بیل بجنے پر بے اختیار پوچھے بغیر اس نے گیٹ کھول دیا۔

”تم۔ یہاں!“ وہ سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر شاکند سی کھڑی رہ گئی۔

(باقی آئندہ ماہ انشاء اللہ)



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، نارل کوالٹی، کیریڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر پویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشری ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشری کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشری اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصلحتاً بنی ہوئے لگاوت دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشری کو سسرال میں بہت کچھ برواشت کرنا پڑتا ہے۔ سناچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشری کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشری دولہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشری کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشری اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشری اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشری کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹ اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہیں۔

فون پر پتا چلتا ہے کہ شہر آتے ہوئے عفان اور فاروق صاحب زمین کی واردات میں قتل ہو گئے۔ عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹ سے سات لاکھ روپے وصول کر پائی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔



اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقتولین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ نسیم بیگم سے ہیں لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشری سے ذکر نسیم سے تین لاکھ روپے لائے کو کہتا ہے۔ حمیدہ خالدہ عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زبیر کا ایسے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں جبکہ عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زبیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آجاتا ہے کہ وہ انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔ رقم مہمانہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر سر اور اس کے گھروالوں کو مورد الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشری کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل طیش میں بشری کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا ابا رشن ہو جاتا ہے۔ عدیل شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہونو ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔

اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ زبیر کے ہاتھوں لٹ جلتے پر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آ جاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو بتا جاتا ہے کہ زبیر نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بند کر دیے ہیں اور اب مفروضہ ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم عاصمہ کو ایک مکان الاپاتا ہے۔ بشری اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط تیرتی ہے۔ دوسری صورت میں بہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل سخت پریشان ہے۔ عدیل مکان کا اوپر والا بورڈن بشری کے لیے سیٹ کر دیتا ہے اور یہ کچھ دنوں بعد بشری کو مجبور کرتا ہے کہ وہ فوزیہ کے لیے عمران کا رشتہ لائے۔ نسیم بیگم اور عمران کسی طور نہیں مانتے۔ عدیل اپنی بات نہ مانا۔ نہ جانے پر بشری سے جھگڑتا ہے۔ بشری بھی اہل دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ عدیل طیش میں بشری کو طلاق دے دیتا ہے اور مثال کو پھینک دیتا ہے۔ مثال بیمار ہو جاتی ہے۔ بشری بھی اس کو دیتی ہے۔ عمران بہن کی حالت دیکھ کر مثال کو عدیل سے پھینک کر لے آتا ہے۔ عدیل عمران پر انوکھا پیر چاکو اورتا ہے۔

تیسویں قسط

بشری سامنے کھڑے اونچے لمبے احسن کمال کو دیکھ کر بے یقینی ہوئی جا رہی تھی اس کے لبہ قد کے سائے میں اس کا اپنا وجود اور بھی اندھیرے میں آ گیا تھا۔
"تھنک یہ گاڈ! تم نے مجھے پہچانا تو۔" وہ پہلے کی طرح بے وجہ تہنہ لگا کر بولا۔ وہی تہنہ جس سے بشری کبھی بہت جڑا کرتی تھی۔
بشری کا دل کچھ بھی بڑے سے بڑا نقصان ہو جاتا احسن کمال یونسی منہ بھاڑ کر جب تہنہ لگا تا تو بشری لہجے میں اس کے کھتے سیاہ کھٹکھریا لے بالوں والا سرونچ دیا کرتی تھی۔
مگر آج جب وہ اس سے تکی انداز میں منہ بھاڑ کر ہنسنا تو پہلی بار وہ اسے اچھا لگا۔
گئے دنوں کا کوئی بھی پھنسا سا نہیں ہوا وہ آئے موسموں میں بالکل غیر متوقع طور پر سامنے آجائے تو اس کی ہر اچھی بری اور باریا رہنے بھی آئے مگر غصہ ہرگز نہیں آتا۔
بشری کو بھی غصہ نہیں آیا چند لمحوں کے لیے سہی وہ اتنے مہینوں سے جس جمود کا شکار تھی اس کو بھول سی گئی۔
"اے... سو تو نہیں کہیں تم کھڑے کھڑے۔ سمندر کی گھوڑی۔۔۔ کی جانور سوتا ہے تاکہ کھڑے کھڑے پانی کے اندر نہاں۔" وہ اپنی ہی لہجی انگلیوں والا بڑا سا مردانہ ہاتھ اس کی آنکھوں کے آگے لہرا کر بولا۔
اور وہی بھونڈا سا خطاب دینے کا انداز لے لیتا ہوتا ہے۔ ہوتے ہی وہ ہنس پڑی۔ احسن نے زور سے اس کے چپٹ

لگائی۔

"شکر ہے تم لوٹ آئیں ورنہ مجھے واقعی تمہارے سر پر کوئی بھاری پتھر یا کچھ ایسا مارنا پڑتا کہ تمہاری یادداشت لوٹ آئے۔" وہ چہرے تک تہنہ لگا کر بولا۔
وہ بے وجہ مسکرائے گئی۔ بہت دنوں بعد تو کوئی ایسا بات کرنے والا ملا تھا جو اس کے حالیہ سانچے سے بے خبر تھا۔

"تم کہاں سے آئے۔" وہ مسکراہٹ دبا کر بظاہر سرسری لہجے میں بولی۔
"کچھ بھروسے بشری کو اس سے ایسے ہی جواب کی امید تھی۔
"آمان سے گئے بھروسے میں اتنے ہمیشہ سے تمہارے محاورے کا حال برابر ہے۔"
"ماضی تو اچھا تھا پھر حال کیسے برا ہو سکتا ہے۔" وہ فوراً اپنی پکڑی جانے والی غلطی کو معنی خیز معنی پر سنا تا ہوا بولا۔

"بابا آئے کہاں سے ہو اتنے سالوں بعد۔" بشری کچھ زچ ہو کر بولی۔
"بس ہمیں کھڑے کھڑے کل کی دیوان بنی سوال یہ سوال کرتی چلی جاتا۔ جسے وہ بچپن میں الف لیل دیکھتے تھے تو شہزادی بننے کے ہوئے مسافر سے پوچھتی تھی اے بندہ خدا تو کون کہہ دے اور کیا چاہتا ہے؟ تین سوالوں میں پوری زندگی کا خلاصہ دریافت کرنا ان عربوں کا ہی فن ہے۔"
بشری زور سے کانوں میں انگلیاں گھساتے ہوئے ایک طرف ہو کر اشارہ کرنے لگی۔
"شکر ہے تمہیں خیال تو آیا۔" اس نے آگے پیچھے پڑا بڑا سا سوٹ کیس اندر کی طرف دھکیلا۔
بشری مزے لگی اس کی آواز سن کر ہنس گئی۔
"آؤ ناں سیٹھی رائیگ میری جان تھنہ گئی۔" وہ مڑ کر اندھیرے میں کسی سے مخاطب تھا۔
بشری چونک کر دیکھنے لگی۔
دو دس تیس سال کا خوش شکل سہمی دونی صورت والا ایک بچہ تھا۔ احسن کمال اب اسے اپنے ساتھ لگائے اندر لارہا تھا۔

"سنو بشری! وہ رک گئی۔
"یہ میرا بیٹا ہے سیف کمال۔۔۔ ہے نامیرے بچپن کی تصویر وہی آنکھیں اوی تلوار جیسی ناک اور لڑکیوں جیسے نازک ہونٹ بھی اتنی تھیں نامہ اور نیا ہمارے نے کیا نہیں دکھاتے ہوئے تھنہ جی جی اسٹک بھی لگا دی تھی یاد ہے نا تھیں اور پھر میری دونوں ست پٹائی۔ اتنی تھی اپنی کے ہاتھوں۔"
دو پہلے کی طرح بولتا ہی چلا جا رہا تھا پھر اس کو با لیل اسٹک کے بشری اس کی باتوں میں بہتی بہت دور نکل گئی تھی۔
بچہ اب باپ کے مسلسل بولنے سے بھی اکتا گیا تھا۔
"بابا ہم نہیں بیٹھ نہیں سکتے اور مجھے نیند بھی بہت آرہی ہے اور بھوک بھی لگی ہے۔" وہ باپ کا باقاعدہ بازو ہلا کر متوجہ کرتے ہوئے بولا۔
"اے دیار! بس بس۔۔۔ سو رہی ہار۔۔۔ رہی سو رہی بہت عرصے کے بعد کسی اپنے کو دکھا ہے نا تو نہ جذبات قابو میں ہیں نہ زبان" وہ بے ساختہ کہہ گیا۔
بشری نے اسے چونک کر دیکھا۔
اس کے جذبات بھی تو کچھ بے لگام ہوتے جا رہے تھے۔ ماضی کے ہنستے کھیلے دنوں میں کہیں کھو گئے تھے وہ کچھ دیر کے لیے۔۔۔ بھول گئی تھی کہ وہ بشری ہے اور اسے ابھی کچھ ہی ہنستے پہلے طلاق ہوئی ہے اور اس کی

وہ اریبہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے بستر تک لے کر آئی اور اسے آہستہ آہستہ تھکتے ہوئے سلانے لگی۔ خود اس کی آنکھیں بھی نیند سے بوجھل ہوئی جا رہی تھیں۔

رات بھر کارت جگا تھا پھر ایسے خوفناک مجھے؟

وہ جیسے گہری نیند سے ہنر پر اٹھ گئی۔ چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”تمہیں نہیں سمجھے ان لمحوں میں غافل نہیں ہونا۔ یہی تو مانگنے کی خالص گھڑیاں ہیں۔ ہم جیسے طلبہ گاروں کے لیے ان لمحوں میں ہانگی گئی سلامتی رد ہوتی ہے نہ وہاں پلٹانی جاتی ہیں۔ مجھے آج خدا کے ور کو ہلانا ہے اپنے بچوں کی سلامتی اور ان کے لیے رزق اور تحفظ مانگنا ہے آج مجھے سونا نہیں۔“ اس کا دل بوری طرح حیرت دار ہو چکا تھا۔ اگر وہ ڈر کر بیٹھ گئی۔ اس عورت کے جاوہ نوٹنے کے آگے ہار گئی۔ خوفزدہ ہو گئی تو پھر اس دلدل میں اترتی چلی جائے گی۔

بے شک اس عورت کی باتوں سے اس کا دل متزلزل ہو رہا۔ جب اس نے صاف لفظوں میں بتایا تھا کہ ایک مرد سے دھوکا کھانے کے بعد عاصمہ کا محتاط رویہ اچھا ہے۔ اور پھر یہ کہ ابھی اسے نوکری نہیں ملنے والی اور۔ اور کچھ باتیں جو اس کے حافظے میں گڈا ہوتی جا رہی تھیں مگر کچھ لمحوں کو سہی اس کا کمزور بے یقین سادل یقین کرنے لگا تھا۔

کچھ ہی دیر میں وہ وضو کر کے مصلحہ چھائے اپنے رب کے آگے بڑے دل سے بڑی لگن سے رکوع و سجود میں لگتی تھی۔

تہجد کے نفل پڑھنے کے بعد وہ بڑے صوفے کے ساتھ اپنے رب کے ساتھ سرگوشیاں کرتے ہوئے اسے ایک ایک کر کے اپنے سارے مسائل اور اپنے محدود وسائل کے بارے میں بتاتی چلی گئی۔

وہ خدا رب تعالیٰ جو پتھر میں موجود کیرے کے رزق سے غافل نہیں رہ سکتا اس کے مسائل سے کیسے بے خبر ہو سکتا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ یہ سب کہتی چلی گئی۔

ایک ایک کر کے اس دل پر دھیرے چھونے بڑے بھاری ہلکے وزنی سارے پتھر پٹے چلے گئے۔ اسے کھپ اندھیرے میں روشنی دکھائی دینے لگی تھی۔ ایک دم سے اپنا کمزور وجود بہت مضبوط اور طاقت ور لگنے لگا تھا۔

جس وہ مصلحہ تمہہ کر رہی تھی تو بہت کچھ سوچ چکی تھی۔

کم از کم اسے پارانٹس اور ڈرنا تو بالکل بھی نہیں اور خود کو مضبوط ظاہر ہی نہیں کرنا بتانا بھی ہے۔ وہ خود کو جسمانی طور پر بھی ہر رانی سے لڑنے کے لیے آمادہ کر چکی تھی۔ آج اسے پہلی بار لگا تھا وہ بیوگی کے بعد اپنے پیروں پہ کھڑے ہونے کے لیے تیار ہے۔

وہ احسن اور اس کے بچے کو کھانا دے کر بغیر اس کے ساتھ شامل ہوئے۔ اگرچہ وہ اصرار کر رہا تھا مگر وہ سرور کا بہانہ کر کے اسے ذکیہ کے حوالے کر کے چھوڑ آئی تھی۔

وہ اس کا چہرہ یوں ہی بڑھ لیا کرتا تھا۔ یہی خوف بشری کو اس سے دور بھاگ رہا تھا۔

مگر کب تک۔۔۔ اس کا بھاری سوٹ کیس تو کچھ اور کمرہ رہا تھا۔

بہت سال پہلے جب اس کی انگلی میں احسن کمال کے نام کی انگوٹھی اس کی چچی نے بہت محبت اور پیار سے ڈالی تھی۔ احسن کمال کچھ زیادہ ہی اس پر اپنا حق جتانے لگا تھا۔

بشری دوست بنانے کی تو احسن کمال کی پسند اور اجازت سے۔

کھیل کھیلے کی تو اس کی مرضی اور پسند کے۔ حتیٰ کہ اوقات بھی وہ ہوں گے جس میں احسن کمال اپنی پڑھائی اپنے کلب اور اپنے دوستوں کی مینٹی سے فارغ ہو گا اور وہ اوقات چاہے رات نوبت کے بعد کے ہوں۔

بشری کے کپڑوں کی شاپنگ امی اور چچی مل کر کیا کرتی تھیں مگر پھر احسن کمال نے اس میں بھی دخل دینا شروع کر

مثال جیسی کڑیا کھڑ کر رہ گئی۔
”سن لو اب تو پچھ بھی تمہیں ٹوک رہا ہے تو پھر بیوں کا کیا حال ہو تا ہو گا۔ بے چارے موت میں خاموش رہتے ہیں اور تم سمجھتے ہو تمہاری باتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔“ بشری بچے کے ٹوکنے پر مظلوم ہو کر بولی۔

”چلو بیوں بھی ہوتا ہے اپنے جذبات کو چھانے کا ایک یہ بھی طریقہ ہے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جیسے جھانک کر بولا بشری لمحہ بھر کو شپٹا سٹی گئی۔ اسے ابھی بھی بشری کے اندر تک جھانکنا آتا تھا۔

وہ نظرسرجا کر رہ گئی۔ وہ ابھی بلکہ کبھی بھی نہیں چاہ سکتی تھی کہ اس کا بھید کھلے۔ وہ بنا کچھ کے تیزی سے اندر جانے لگی۔

”چلو بیٹا! یہاں کے میزان کچھ ایسے ہی ہیں۔ خود ہی ڈھیٹ بن کر ہمیں اندر جانا ہو گا۔ بٹ ڈونٹ دری۔ تمہیں یہاں کھانا بھی ملے گا اور بہت مزے کی نیند بھی آئے گی۔ یہ میں تمہیں گارنٹی دیتا ہوں۔“ وہ بچے کا ہاتھ

تھامے ابھی بھی مسلسل بولتا ہوا پتھے آ رہا تھا اور بشری کا جی چاہ رہا تھا وہ اس سے چھپ کر کہیں اس جگہ روپوش ہو جائے جہاں سے وہ اسے بھی نہیں نہ دیکھ پائے۔

مگر یہ اب ممکن نہیں تھا!



اس عورت کے پاس ایک سیاہ رنگ کا ڈیہہ پڑا تھا۔ جس میں سرخ رنگ کا مائع تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے اپنے آگے تسلی میں چلی آگ میں اس ڈبے سے کچھ سرخ مائع لیتی اور اس کے پھینٹے آگ پر مارتی۔

آگ سے شعلے سے نکلنے اور سرخ دھواں کمرے میں بھرنے لگتا۔

وہ سرخ مائع۔۔۔ خون تھا۔

اسے لگا اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا ہے۔

اس نے بے اختیار منہ کے آگے ہاتھ رکھ لیا۔

نہیں اسے خودیہ قابو رکھنا تھا اگر اس عورت کو ذرا بھی یہاں اس کی موجودگی کا شک ہو گیا تو وہ کچھ بہت برا بھی کر سکتی ہے۔ اس کے ساتھ اس کے بچوں کے ساتھ۔

وہ تیزی سے الٹے قدموں پیچھے ہوتے ہوئے دل میں درود شریف آیت الکرسی اور قرآنی آیات پڑھنے لگی۔

اس کے قدم جو بھاری ہو رہے تھے اسے اٹھانا محال تھے۔ اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ آیات کا درود شروع کرتے ہی بھاری پتھر سے قدم اٹھنے لگے۔ وہ ایک ایک سیڑھی ایک ایک زینے پر رک رہی تھی۔

اس کے دل کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ کچھ ایسا انہونا انوکھا احساس تھا جو اس کے دل کو جڑے جا رہا تھا۔

”یا اللہ رحم فرما معافی بے دے ہمارے گناہوں کی حفاظت فرما میری اور میرے بچوں کی۔ میرا تیرے سوا کسی پر یقین نہیں۔ تو وحدہ لا شریک ہے۔ جاوہ بھی بہت اثر کرتا ہے۔ اے رب باری! اگر تو چاہے تو رحم کر میں تیرے رحم کی طلب گار ہوں تو میری بے چاری بے کسی سے واقف ہے۔ تو جانتا ہے صرف تو جانتا ہے میں کتنی بے بس ہوں بے کس ہوں رحم کر مجھ پر میرے یتیم دیسیر بچوں پر۔ رحم رحم۔“

وہ وضو کے بغیر ہی اپنے کمرے کے ٹھنڈے فرش پر بے اختیار سجدہ ریز ہو گئی تھی۔

وہ جانے کتنی دیر یونہی زمین پر اکڑوں جھکی خدا کے آگے گڑگڑاتی رہی۔

”مما۔۔۔ ممما آپ کو کیا ہوا ہے۔“ تھی اریبہ اس کا کندھا ہلاتے ہوئے نیند سے بھری آنکھوں کے ساتھ پوچھ رہی تھی۔

عاصمہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

گریہ زاری سے اس کی آنکھیں سوچ گئی تھیں۔ گھول جیسے ٹھہر سا گیا تھا۔ بے قراری کو قرار مل گیا تھا۔

جو تے باریک ہیل کے سینڈل بشری کی جان تھے اور احسن کمال نے ان پر بین لگانا۔
"تم یہ سینڈل پہنتی ہو تو یوں لگتا ہے جیسے سر کس میں کرب و کھاری ہو۔ یا فیوز بلب چھینج کرنے لگی ہو یا بغیر بانس کے تمہارے گھر کے چالے صاف کرنے ہوں۔"
وہ انتہائی بد تمیزی سے بصرے کرتا بشری رو ہی پڑتی۔ اس نے باریک ہیل والے سینڈل پہننے چھو ڈیے مگر ان کی خواہش اس کے دل سے مرز مکی۔
عدیل سے شادی ہوتے ہی اس نے ان گنت ایسے سینڈل خریدے تھے۔ نازک اور قیمتی۔ عدیل کو بھی اس کی پسند کا ظم تھا۔ وہ اکثر ہی اسے ان جو توں کی دل کھول کر شاپنگ کراتا۔
گیارہ ماہ دونوں کی مٹھی رہی۔

جب تک احسن کمال کو نازیہ بھٹی سے عشق نہیں ہو گیا۔
بشری تو اس کی حد سے زیادہ جہانی محبت سے عاجز ہی آچکی تھی۔ اگر احسن کمال اس نفی کو ختم کرنے کا اعلان نہ کرتا تو وہ خواہ اس کے نام کی انکو بھی اتار کر بیچیک چکی ہوتی۔

مگر اچھا یہ بوا کہ پہل احسن کمال نے کی۔ گرین کار! ہولڈر نازیہ بھٹی اس کے دوست زبیر بھٹی کی فرسٹ کزن تھی۔

اس نے بھی کھٹ ہے احسن کمال کو اوکے کر دیا۔

ان دنوں چچی شرمندگی کے مارے کئی دن تک ذکیہ اور بشری سے نظر بھی نہیں ملا پائی تھیں اور پھر چٹ سے ایک دن ان لوگوں نے گھر شفٹ کر لیا تھا۔

بس رسمی طور پر ملنے کے لیے آئیں وہ بھی اوپر سے دل سے۔ نس نس کر اہر اہر کی باتیں کرتی رہیں۔

ذکیہ نے تو غصے میں وضو کیا اور جا کر نماز کی نیت کر لی۔

وہ دنوں ہی کچھ دیر نہ تھی رہیں پھر اچھی آواز میں سب کو فی ایمان اللہ کہہ کر چلتی بنیں۔

اس کے بعد احسن کی شادی کا کارڈ بھی اپنی بس کے ہاتھوں بھجوایا۔ مگر کوئی تیار ہی نہیں۔ ذکیہ کو بے مد غصہ تھا۔

لیکن بشری بہت خوش تھی کہ اس جیسے دم گھٹ منگیتر سے ہمیشہ کے لیے چھینکارا مل گیا۔

پھر احسن کمال کے نازیہ کے ساتھ امریکا جانے اور وہیں رینج ٹیس جانے کی خبریں ملتی رہیں۔ چچی کچھ عرصہ بیمار ہو کر بیٹے سے ملنے کی آس لیے خاموشی سے دنیا سے چلے گئیں۔

اور احسن کمال کا باب ان کے گھر اور بشری کی زندگی میں ہمیشہ سے اب بند ہو کر رہ گیا۔ اس نے دانستہ و نادرستہ طور پر اس سب کو بھٹا دیا تھا پھر عدیل آ گیا۔ اس کی زندگی میں اور سب بند پڑتا جا گیا۔

اس نے شادی کے آٹھ نو سالوں میں کبھی مڑ کر احسن کمال کو نہیں سوچا۔ ایک بار امی نے شاید اس کے امریکا سے چکر لگانے کا ذکر بھی کیا مگر بشری تو اپنی خوشیوں بھری زندگی میں کچھ ایسی گمن تھی کہ وہ کچھ سن ہی نہ سکی۔

اور اب اتنے سالوں بعد یہ کیوں آیا؟

وہ مثال کو سوتے میں یار کرتے ہوئے بے وجہ اس کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔

وہ آج ہی اتنا ہی باتولی اور کھلندرا تھا۔

ہاں اس کے کھلندریے بن میں کچھ کی نہیں آسکی تھی کہ اسے ایک بار بھی احساس ندامت یا شرمندگی نے نہیں گھیرا کہ ماں کے منہ کو ہی سہی۔ لوگوں نے ان کے ساتھ بھی کھٹ منٹ کی تھی اور وہ یہاں کس استحقاق سے آیا۔ کیا اس وجہ سے کہ چچی نے بچا کا حصہ اس گھر سے لیا ہی نہیں تھا؟

پھر ان کے خاموشی سے گزر جانے پر احسن کمال کے مستقل لاپتا ہونے پہ امی نے کئی بار شکرانے ادا کیے تھے۔

ورنہ گھر کی ملکیت میں آو ہا تو ان کے جو ا لے کرنا پڑا۔

اب یہ آگیا تو یقیناً" بوا رہ چاہتے گا۔ اگرچہ امی نے بعد میں سارا گھر گرا کر گئے سڑکے سے ماڈرن طرز کا بنوایا تھا۔ مگر ملکیت میں وہ ابھی بھی برابر کا حصے دار تھا۔
"خیر یہ امی اور عمران کا سرورہ تھا بشری کا نہیں۔" آخری سوچ اس کے غنوںگی میں اُدبے دماغ میں ہی آئی تھی۔

اور بہت سارے دنوں اور بہت سیاری کالی راتوں کے بعد یہ ایک اکیلی رات آئی تھی جس میں آخری سوچ اس کے دماغ میں عدیل یا مثال کی نہیں تھی کسی اور کی تھی۔

اور وہ کسی اور آنے والے دنوں میں جیسے ہر رات اور ہر دن میں اس کی سوچ پر قابض ہونے والا ہے۔ اس نے اس لمحے ذرا بھی نہیں سوچا تھا۔



"نہیں فوزیہ! ہرگز نہیں۔ تم اور امی کان کھول کر سن لو! یہ بات کسی بھی طرح ممکن نہیں۔" عدیل سنتے ہی ہتھکے اٹھ گیا۔

فوزیہ نے بے بسی سے ماں کی طرف دیکھا۔

کل اس کی فلائٹ بھی خالد کے ساتھ اور جانے سے پہلے نسیم نے یہ پہاڑ سا مرحلہ اس کے ذمے لگایا تھا کہ وہ عدیل کو کسی بھی طرح نگت کی بیٹیوں میں سے کسی ایک کے لیے راضی کر لے۔

مگر عدیل تو یہ سنتے ہی جیسے آب بولہ ہو گیا۔

"تو کیا اس بے وفائی کی یادوں کو سینے سے اگا کر بیٹھے رہو گے ساری عمر۔ ابھی تمہاری عمر سے ہی کیا یوں بھی اتنے پانڈا ہیں اس نے میری بیانی کیا تھا۔ ایک بچی کے سوا۔ یا بے شمار فرمائشوں اور جھڑوں کے سوا۔" نسیم بھی خم

خونک کر میدان میں آئیں۔

کئی وقت تھا اس بھرتے سیر کے پیٹھے پر ہاتھ رکھتے۔

"امی! زیادہ بہتر ہو گا کہ آپ آئندہ اس کا تذکرہ نہیں کریں گی ورنہ۔" وہ ایک دم سے پہلے والا غصیلہ جذباتی عدیل بن گیا تھا۔

"ورنہ کیا کرے گا۔ ایڈنٹ لے کر سر پھاروے گا میرا۔" نسیم بھی آج حساب بے باق کرنے پہ تلی تھیں۔ ورنہ فوزیہ کے جانے کے بعد عدیل سے بات کرنا ناممکن ہو جاتا۔

"ورنہ میں یہ گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔" وہ سرد لہجے میں بولا اور "ورنہ" سے آگے تو یہ نسیم نے یا فوزیہ نے ایسا بھی نہیں سوچا تھا۔ اگر عدیل اس پر عمل کر لیتا تو۔"

نسیم کو جھڑی سے آئی۔ وہ ایسا سوچ بھی نہیں کرتی تھی۔

فوزیہ نے آنکھوں میں ماں کو ابھی کچھ ٹھہرانے کا مشورہ دیا مگر ایسے نازک لمحے نسیم کی زندگی میں پہلے بھی بہت آئے تھے اور انہیں اچھی طرح علم تھا کہ کس موقع پر کیا کرنا ہے۔

وہ بے اختیار دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پچھک پچھک کر رونے لگیں اور روٹی چلی گئیں۔

"امی! ایلی پلینز جو صلہ کریں گیا ہو گیا ہے۔" گویا ایسے بے قابو ہو کر روئے جا رہی ہیں۔ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔" فوزیہ کن اٹھیں عدیل کی طرف دیکھتے ہوئے رندھی آواز میں بولی۔

"مر جانے دو مجھے۔ جان خلاصی ہو میری۔ اب زندہ رہ کر دیکھی بھی کیا۔ بیٹے کی محتاج ہو گئی ہوں اب اس کی دہمکیاں ہی تو سنوں گی۔ مر جاؤں میں تو اس سے اچھا۔ اللہ موت دے دے گئے۔ ایسی زندگی۔" وہ حسب عادت سینے پر ہاتھ مار کر داؤ پٹا کرنے لگیں۔

عدیل کے ماتھے کی رگ ہلچل کر رہی تھی۔ وہ بے پھرتی گئی۔ اس نے نفی سے ہونٹ بھینچ کر خود کو کچھ بہت سخت آنے سے روکا اور ایک جھگڑت اٹھ کر نیزی سے چلا گیا۔ ہم کا داؤ پٹا ہے۔ ہلے میں گم گیا۔

فوزیہ نے ایسے بھی کسی جھگڑے سے کم نہیں تھا۔
 کیم کا یہ تیرہدہف تسخہ تھا جس کے آگے عدیل بار جاتا تھا کہ وہ ماں کے آنسو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ موم
 کی طرح پکھل جاتا تھا۔
 مگر آج تو وہ کسی پتھر کی طرح بے حس بنا رہا اور پھر یوں لا تعلق سے اٹھ کر چل رہا۔
 ”امی! اب بھائی کی شادی کا خیال فی الحال دل سے نکال دیں۔ بھائی ابھی کسی بھی صورت میں شادی نہیں
 کریں گے۔“ فوزیہ نے ماں کو مشورہ دیا۔ کیم کے آنسو تو وہیں ٹھہم چکے تھے۔
 ”تو کیا میری بوڑھی ہڈیوں میں دم ہے جو میں سارے گھر کو سنبھالوں اور ہانڈی چولہا بھی کروں اس عمر میں؟“ وہ
 چیخ کر بولیں۔

فوزیہ بے بسی سے ماں کو دیکھ کر رہ گئی۔
 ”میں نے بیروں خالہ سے بات کی ہے نا۔ وہ اور ان کی بیٹی صبح سے آجایا کریں گی اور رات تک سارا کام پختا کر
 جایا کریں گی۔“ وہ کچھ دیر بعد ماں کو تسلی دینے کو بولی۔
 ”اب میں گھر غیروں کے حوالے کروں؟“ وہ چمک کر بولیں۔ فوزیہ کچھ بول ہی نہ سکی۔
 ”ماں جانے تو ابھی بھی دس لڑکیاں ہیں اس کے ساتھ شادی پر راضی۔“ وہ ملال بھرے لہجے میں بولیں۔
 ”زبردستی کریں گی تو کچھ بھی کر سکتے ہیں وہ۔“ فوزیہ نے سمجھایا کیم کچھ سوچنے لگیں۔
 ”اگر مثال کو یہاں لے آئیں پکا پکا۔ اس کے کاموں کو دیکھتے بھاننے کے لیے کوئی عورت چاہیے ہوگی پھر تو ماں
 ہی جائے گا۔“ وہ ذرا دیر بعد جوش بھرے لہجے میں بولیں۔
 ”دیکھ لیں مثال کی ذمہ داری آپ اٹھائیں پامیں گی۔ میں تو سستی ہوں رہنے دیں اسے ماں کے پاس ہی۔ یہاں
 آئے گی تو بھائی کی ساری توجہ اس کی طرف ہو جائے گی۔ آپ کی طرف دھیان دے گے اور نہ دو سہری شادی کے
 لیے راضی ہوں گے۔ اتنی چھوٹی میں ہے مثال کہ اس کی دیکھ بھال کے لیے کسی عورت کے ساتھ کی اسے
 ضرورت پڑے۔“ فوزیہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔

کیم ہل مسوس کر رہ گئی۔
 کوئی بھی تو دوست نظر نہیں آ رہا تھا اور عدیل کی دو سہری شادی بھی ضروری تھی۔ فوزیہ اب ادھر ادھر کی باتیں
 کیے جا رہی تھی مگر کیم کا داغ اسی ایک نقطے کی تلاش میں تھا تھا کہ ایسے عدیل کو شادی پر راضی کریں۔



”ہیلو! وہ کچن میں مثال کے لیے ناشتہ بنا رہی تھیں جب وہ صبح سویرے اس کے سر پر سوار ہو گیا۔
 ”اٹھ گئے تم۔ میں تو ابھی تھی رات بہت دیر میں سوئے ہو تو صبح دیر تک سو گے۔“ بشری مروتا ہوئی۔
 ”ہائے سوئی! تمہاری بیٹی ہے نا؟“ وہ مثال کی سنہری پونیاں ہلا کر اسے جھک کر یہاں کرتے ہوئے بولا۔
 ”ہوں! بشری کی آنکھوں میں ذہیر ساری محبت سمٹ آئی۔
 ”بہت کیوٹ ہے۔ تمہارے بچپن سے زیادہ۔“ وہ اسے چڑانے کو بولا مگر بشری کو اچھا لگا۔ مثال کی تعریف تو
 اسے اپنے سے بڑھ کر لگتی تھی۔
 ”تمہارا بیٹا ابھی سویا ہوا ہے؟“ بشری مثال کے آگے ناشتہ رکھتے ہوئے بولی۔
 ”ہاں وہ دیر تک سوئے گا۔ میں تو صبح جلدی اٹھنے کا عادی ہوں اور واک کے لیے جانے کا۔ آج کچھ دیر
 ہوئی۔“ وہ بولتے ہوئے مثال کے آگے رکھے آلیٹ کو چھری سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹنے لگا۔
 ”تمہاری بیوی نہیں آئی ساتھ؟“ بشری نے رات سے روکا ہوا سوال پوچھ ہی ڈالا بالآخر۔
 اس کے ہاتھ لمحہ بھر کو ٹھہم سے گئے۔

”صبح کہوں بشری! وہ سہرا بچا کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔ ہم دونوں کو ہی جیون

سنا بھی قدر کرنے والے نہیں ملے یا شاید ہم ہی ان کے قابل نہیں تھے؟“
 بشری کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ اس کے ساتھ بیت جانے والے سائے کو یوں ایک جملہ میں سمیٹ
 کر اپنی بھی کہانی اس میں بیان کر جائے گا۔
 اور وہ جو رات سے ڈری ہوئی تھی کہ جب احسن کمال عدیل کے بارے میں پوچھے گا پھر جھگڑے اور طلاق کی
 وجہ اور پھر مثال اور اس کے فیوچر کے بارے میں خوفناک اندیشوں کا اظہار کرے گا تو وہ کیسے اس کا سامنا کرے
 گی۔
 اس نے کتنی آسانی سے ایک جملہ میں کہہ دیا جبکہ اسے یقین تھا ذکیہ نے رو رو کر بشری کی بد نصیبی اس کی
 پہاڑی زندگی اور اس کی بچی کی برباد زندگی کے قصہ کو کتنا طویل کیا ہو گا اور احسن کمال۔
 وہ پل بپلا سے دلچسپی سے دیکھنے لگی۔

”بلکہ میں تو کتنا ہوں وہی ہمارے قابل نہیں تھے سو ان پر چار حرف بھیجو ہم اپنی باتیں کرتے ہیں۔“ وہ چھری
 رکھ کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولا۔
 ”کیا مطلب؟“ وہ پوچھی۔
 ”یہی کہ آج تم مجھے ناشتے میں کیا کھلانے والی ہو۔“ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔
 ”جو تم کہو۔“ بشری خوش دلی سے بولی۔
 ”مراٹھا، اٹلیٹ اور رات کا سالن ساتھ گرم گرم چائے کا فل ساڑنگ۔“ وہ بے تکلفی سے بولا۔
 بشری اٹھ کر فریج سے آنا نکالنے لگی۔
 ”کم تازہ، بھجے سینف کو کون سے اسکول میں داخل کرانا چاہیے۔“ وہ اب مثال کو بچا ہوا ناشتہ زبردستی کر رہا
 تھا۔ برا بھلا پلٹتے ہوئے بشری کے ہاتھ رک سے گئے۔
 ”کیا مطلب؟“

اب یارا تم مطلب بہت پوچھنے لگی ہو، ایسی کوڑھ مغز کو تم کبھی بھی نہیں تھیں۔“ وہ چڑ کر بولا۔
 ”تم آنا مستقل یہاں آگے ہو۔“ وہ سنبھل کر بولی۔
 ”آف کورس۔“ وہ اب نصیحت سے مثال کا منہ صاف کر رہا تھا اور وہ وہ کا گلاس اس کے آگے رکھ رہا تھا۔
 بشری کو اس کے انداز بہت اچھے لگ رہے تھے۔
 اس نے بہت آرام سے مثال کو سارا ناشتہ ختم کرا دیا تھا۔

”دیسو نا وہاں میں نے بڑا اس اشارٹ کیا تھا۔“ باب کچھ عرصہ کی پھر بعد میں بزنس میں آ گیا۔ ابھی کچھ عرصہ
 پہلے یہاں کی دو کمپنیوں کے ساتھ بہت اچھی ذیل ہو گئی۔ پارٹنرشپ بھی چل رہی ہے اور کچھ دوسرے معاملات
 بھی تو مجھے لگا، مجھے پاکستان واپس آ جانا چاہیے۔“ وہ افسانہ بیانے لگا۔
 ”بلکہ بشری! اگر تم ہانڈ نہیں کرو تو مجھے تمہاری تھوڑی سی سہیل چاہیے ہوگی یہاں سہیل ہونے میں۔“ وہ بے
 تکلفی سے کہہ رہا تھا۔ بشری اب اس کے لیے آلیٹ بنا رہی تھی۔
 ”مجھے یہاں اپنے اور سیفی کے لیے گھر دیکھنا ہے۔ آفس کا ارتج منٹ میں کر لوں گا۔ سیفی کا اسکول تم کرواؤ گی
 اور کچھ گھر کو سیٹ کرنے میں۔ کیا تم تھوڑا نا تم دے سکو گی مجھے؟“

وہ بہت طریقے سے پوچھ رہا تھا۔
 ”ہوں کیوں نہیں۔“ بشری کو کنا بڑا۔
 ”اوکے تو آج ہی سے کام اشارٹ کیا جائے۔ اسپیشلی گھر دیکھنے کا۔“ بشری ہاتھ روک کر اسے دیکھے گئی۔
 ”ارے۔ آلیٹ کو مکہ بن جائے گا واپس آ جاؤ۔“ وہ زور سے بولا تو وہ جلدی سے آلیٹ پلیٹ میں نکالنے لگی۔

”چلو د چار دن بعد شروع کر دیں گے سروے جس میں نم ایزی فیل کرو۔“ وہ ناشتہ کرتے ہوئے اطمینان سے
 بولا۔

عاصمہ کو شش کے باوجود کچھ بول نہیں پائی۔
”دروازہ کھولو مجھے بات کرنا ہے تم سے۔“ وہ حکمہ انداز میں بولی۔ عاصمہ جہاں کھڑی تھی وہاں سے ہل بھی نہیں سکی۔

”تو تم دروازہ نہیں کھولو گی؟“ وہ اور بھی حقارت بھرے انداز میں بولی۔
”نہیں۔“ اللہ جانے کیسے وہ اپنے پورے جسم کی قوت مجتمع کر کے بول پائی۔
”اوہ تو اتنی جرات آگئی ہے تم میں، مبارک ہو پھر تو تمہیں۔ تم بہت جلد اپنے بچوں کو بھی رونے والی ہو۔“ وہ منحوس لہجے میں بولی۔

اور دوسرے لمحے دروازے کے باہر مختلف آوازیں آنے لگیں۔
”اے ابھرنے کرو۔ تم زلخا ہوتا۔ زلخا شمشاد۔“ کوئی بہت ہی بھاری رعب دار آواز تھی۔
”سرجی! ایسی عورت سے شناخت کی کیا ضرورت ہے۔ اس مردود کو تو میں نے خود موقع، واردات سے پکڑا تھا مگر یہ مجھے جل دے کر بھاگ گئی۔“ دوسری خوشامدی سی آواز ابھری۔

”آپ کون ہیں جی۔ نہیں۔ جانے دیں مجھے اور پر اپنے گھر۔“ وہ اب کے ذرا گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔
”اپنے گھر کی بیٹی۔ تیرے باپ نے خرید کر تیرے نام کیا تھا۔“ یہ یقیناً ”کسی پولیس والے کا لہجہ تھا۔ مگر ڈر کی وجہ سے عاصمہ نے دروازہ نہیں کھولا۔

”یہ ہے وہ انسپکٹر صاحب! جاؤ ٹونا کرتی ہے اور لوگوں کو بے وقوف بنا کر تمہیں ایشیٹی ہے۔“ یہ الیاس کی آواز تھی۔ عاصمہ صاف پہچان گئی۔

”ارے جی جاؤ ٹونے کو گولیا ماریں۔ یہ تو بڑی مردود عورت ہے۔ ڈیڑھ مہینے سے مختلف جگہوں پر اس کی تلاش میں چھاپے مار رہے ہیں۔ پھانسی کا پھندا اس کا انتظار کر رہا ہے۔ وہی خوشامدی آواز تھی۔ اب کے عاصمہ سے رہا نہیں گیا۔

اس نے روپے کو اچھی طرح چرے یہ اور سر ریلیٹا اور ذرا سا دروازہ کھول دیا۔
پا پھولیس والے کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ الیاس تھا۔ زلخا کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔
آنکھوں کی جاوٹی طاقت ناپید تھی۔ اس وقت آنکھوں میں التجا اور بے بسی تھی۔
عاصمہ کو یک گونہ اطمینان ہوا۔

”اپنے شوہر کو قتل کر کے بھاگی ہے یہ۔ پکڑی گئی تھی عین موقع واردات سے مگر بچ نکلی، سارے ثبوت گمواہ اس کے خلاف سب کچھ موجود ہے۔ اب کے نہیں بچ سکے گی۔ چل لگ آگے۔“ انسپکٹر غرا کر بولا۔

”سرجی! آپ لوگوں کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا نام تو عذرا ہے۔ آپ عاصمہ بہن سے پوچھ لیں۔ انہوں نے خود چھان بین کر کے مجھے کرائے پر اپنے گھر کا اور والا پورٹن دیا تھا۔ کیوں عاصمہ بہن۔۔۔؟“ وہ کانپتی آواز میں اپنا لہجہ بھلے لہجے میں عاصمہ کے ذرا قریب ہونے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

”الیاس بھائی! میں اس عورت کو جانتی بھی نہیں یہ زبردستی۔“ عاصمہ نے اسے نفرت سے دیکھتے ہوئے کہنا چاہا۔

”بہن جی! آپ کو بولنے کی ضرورت نہیں۔ میں کافی ہوں اس عورت سے پنشنے کے لیے اور دیکھیں آپ کی جان چھڑانے کو اللہ نے کیا انتظام فرمایا۔ خود سے مدد بھیج دی۔“ الیاس اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔

”اب تم خود چل کر آگے گاڑی میں بیٹھو گی یا تمہاری ڈنڈا ڈوبلی کی جائے۔“ پولیس والا نخرے سے بولا۔
”سرجی! میں بے گناہ ہوں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ آپ قسم لے لیں۔ قرآن اٹھو لیں مجھ سے۔ میں تو۔“ وہ

پشیمانی کچھ نہیں بولی۔ اس کے پاس بے گناہی کا کپڑا دیکھتے ہوئے جو لمبا بند گز کے لمحہ بھر کو رکی۔
”میں امی سے ناشتے کا پوچھ لوں۔“ وہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔
احسن اسے جاتا دیکھتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔



”غلطی ساری آپ کی ہے عاصمہ بہن! آپ کو بغیر قانونی کارروائی کے اس عورت کو اپنے گھر میں داخل نہیں ہونے دینا چاہیے تھا۔“ الیاس ساری بات سن کر کچھ پریشانی سے بولا۔

”میں جانتی ہوں۔ غلطی میری ہے لیکن بھائی آپ یقین کریں میں کچھ اس طرح سے بے بس ہو گئی تھی کہ۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں دبا کر بولی۔

”آپ اس سے ملیں گے تو یقین کریں۔ میں نے ایسی عورت پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ وہ جاؤ ہی نہیں کرتی، سامنے والے کو بے بس بھی کر دیتی ہے۔ اور خدا کے لیے کچھ کریں میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ وہ رات بھر چلے کانتی سے اور۔۔۔ یا اللہ! میں کیا کروں؟“

وہ روئی نہیں مگر آسو کنٹرول کرنا بھی مشکل ہو جاتا تھا۔
”خیر آپ پریشان نہیں ہوں، میں اس کا بندوبست کر لوں گا۔ بس آپ کو اپنے گھر کے اندر والا دروازہ بند رکھنا ہے ہر صورت جو راستہ اوپر کی طرف جاتا ہے وہ۔“ وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا تھا۔

”وہ تو بند سے اسی دن سے جس دن وہ عورت آئی تھی اور اتنی چھوٹی ہے۔ کتنی تھی میری ماں اور بہنیں ایک دو دن میں آجائیں گی۔ کوئی بھی نہیں آیا۔“ عاصمہ حقیقتاً ”پیشانی“ تھی۔

”خیر یہ اس کا انتظام تو میں کر لوں گا۔“
”بھائی! آج ہی کچھ کریں۔ میں اس جاؤ گرنی کو مزید ایک رات بھی اپنے گھر میں رہا اشت نہیں کر سکتی۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”آپ رسکوں ہو کر گھر جائیں۔ میں کچھ نہ کچھ کرتا ہوں۔“ الیاس نے اسے تسلی دے کر بھیج دیا۔
مگر گھر آ کر بھی اس کا دل گھر کے کاموں میں نہیں لگ رہا تھا۔ سارا اہمیان اوپر کی طرف تھا جہاں بالکل خاموشی تھی۔

”کبجنت رات بھر جاگ کر جاؤ ٹونا کرتی ہے اور دن میں بڑی سوتی ہے۔“ وہ خواہ مخواہ جملائے جا رہی تھی۔
غصہ اپنی لے بسی پر آ رہا تھا کہ اپنے گھر میں بھی وہ کتنی لاچار ہے ایک ناپسندیدہ انسان کو نکال باہر نہیں کر سکتی۔

”بچے اسکول سے آجائیں تو میں حمیدہ خالہ کے گھر جاؤں شاید ان کے کچھ آنے کا پتا چل سکے۔“ اس نے بے دلی سے کہا بنا دیا۔

دھونے والے کپڑے کافی اکٹھے ہو چکے تھے۔ مگر وہ ابھی دھونا نہیں چاہتی تھی۔ پھر اوپر چھت پر سوکھنے کے لیے ڈالنے چاہتا پڑا اور اسے ابھی اس عورت کا سامنا نہیں کرنا تھا۔

بیرونی دروازے پر ہونے والی دستک سے وہ چونکی۔
”اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ بچے تو ابھی نہیں آئیں گے۔“ وہ سوچتی ہوئی دروازے تک گئی۔

”کون؟“ اس نے دروازے کی چھری سے جھانکتے ہوئے پوچھا۔ اور دوسرے لمحے دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ وہ عورت دروازے کی چھری میں نظریں جمائے دیکھ رہی تھی۔

”تو تم باز نہیں آئیں غلط حرکت کرنے سے۔“ وہ عجیب پھٹی ہوئی آواز میں عاصمہ پر نظریں جمائے کہہ رہی تھی۔

اب گڑبوائے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑے مغافیاں مانگ رہی تھی۔
 ”سرجی! پیشہ در ہے ایسے نہیں مانے گی اس کا علاج کرنا پڑے گا۔“ اس نے بندوق کے بٹ سے اسے آگے دھکیلا تو پھر وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔
 گلی میں ایک دو لوگوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔
 تینوں پولیس والے اسے دھکیلتے ہوئے آگے لے گئے۔
 ایک پولیس والا واپس آتا دکھائی دیا۔ عاصمہ روزہ بند کرتی رک گئی۔
 ”بہن جی! اوپر اس کا سامان ہے اور سرجی نے کہا ہے کہ اوپر کے کمرے ابھی سیل کیے جائیں گے۔“ وہ پاس آکر بولا۔
 عاصمہ پریشان نظروں سے الیاس کی طرف دیکھنے لگی۔
 ”آپ پریشان نہیں ہوں۔ میں جاتا ہوں ساتھ۔“ الیاس پولیس والے کے ساتھ بیرونی سیڑھیوں سے اوپر چلا گیا۔
 عاصمہ فکر مند سی صحن میں ٹھلنے لگی۔ آٹھ گھنٹے بعد الیاس نے دروازے پر دستک دی۔
 ”کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے الیاس بھائی!“ وہ خوف زدہ ہی تھی۔
 ”اللہ کا شکر ادا کریں۔ اس نے آپ کو بہت بڑی گڑبڑ سے بچالیا ہے۔“ وہ گہرا سانس لے کر بولا۔
 ”کیا مطلب؟“ وہ اور بھی پریشان ہو گئی۔
 ”شام تک پولیس یہاں سے اس کا سارا سامان اٹھالے جائے گی تو اسے کھول دیں گے۔ اس کا سامان کچھ خاص نہیں ہے۔ جادو ٹونے کے کچھ آلات ہیں۔ شاید اپنے قتل والے کارنامے کو پھپانے کے لیے اس نے جادو گرنی کا ہروپ بھرا تھا۔ سہرا لٹنڈے آپ پر فضل کیا۔ آپ شکر ادا کریں۔“
 ”شکر ہے اس کی ذات کا۔“ وہ آستکی سے بولی۔ ”اس نے کسی بڑی مصیبت سے بچالیا۔“
 ”نی اٹھال میں اوھر ہی ہوں۔ جب تک اوپر کا سیل ختم نہیں کیا جاتا میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ آپ بالکل پریشان نہیں ہوں گا۔“ وہ کہہ کر جانے لگا۔
 ”بہت شکریہ الیاس بھائی! آپ نے ساتھ دیا تو۔۔۔“
 ”اللہ ساتھ دینے والا ہے جی اور بہن جی! آپ بچوں سے اس واقعہ کا ذکر نہ کیجئے گا پھوٹے سے دل دماغ ہوتے ہیں ان کے۔ وہ ڈر جائیں گے تو اوپر کے پورشن سے خوف کھانے لگیں گے۔“ وہ احتیاطاً بولا۔
 ”جی بالکل۔ میں سمجھتی ہوں۔ بھائی! آپ کا ایک بار پھر شکریہ۔“ وہ سہرا کر بولی تو الیاس کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا گیا۔
 ”وہ میرے پیارے اللہ! ایک بار۔ اپنی پوری زندگی میں صرف ایک بار میں بورے خلوص سے تیرے آگے جھکی اور تو نے مجھے اس طرح سے نوازا۔ اس طرح سے میری بے کسی پر رحم فرمایا۔ اگر میں تا عمر تیرا شکر ادا کروں۔ کچھ خلوص دل سے پکارتی رہوں تو۔ تو بڑا مہربان ہے تو بڑا رحیم ہے۔ مجھے بخش دینا اور میرے گناہوں سے سیاہ ہوتے دل کو بھی حق اور یقین کی روشنی سے منور کر دے۔“
 وہ بالکل رات والے انداز میں پھر خدا کے آگے سجدہ ریز تھی۔

کہا۔
 ”نہیں۔۔۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔
 ”کیوں؟“ وہ اس کے پاس آگیا۔
 ”مجھے نہیں کھیلنا۔“ وہ منہ دو سرے طرف پھیر کر بولی۔
 ”وہی تو پوچھ رہا ہوں کیوں نہیں کھیلنا۔“ وہ اصرار سے بولا۔
 ”میری مرضی۔“ وہ اڑل بن سے بولی۔
 ”چلو ٹھیک ہے، نہیں کھیلے۔ ہم باتیں کرتے ہیں۔“ وہ صلح جو انداز میں بولا۔
 ”نہیں۔ مجھے تم سے باتیں بھی نہیں کرنا۔“ وہ دکھائی سے بولی۔
 سیفی کچھ حیران سا سے دیکھنے لگا۔
 ”تم مجھے پسند نہیں کرتیں؟“ وہ کچھ پریشان ہو کر بولا۔
 ”نہیں۔“ وہ کھٹ سے کہہ گئی۔
 سیفی کا منہ اتر گیا۔
 ”کیوں؟“ وہ ذرا اور بعد پھر بولا۔
 ”میں جواب نہیں دینا چاہتی۔“ وہ پکا سامنہ بنا کر بولی۔
 ”نہیں تم تو مجھے اچھی لگی ہو اور تمہاری ماما بھی مجھے اچھی لگی ہیں۔ شی ازوری نائس۔“ وہ نرمی سے بولا۔
 ”مثلاً؟“ وہ ایک دم غصے میں آگئی۔
 ”مثلاً۔ میں نے ایسا کیا کہا ہے۔“ وہ پریشان ہو گیا۔
 ”تم کون ہوتے ہو میری ماما کو پسند کرنے والے اور تمہارے بابا۔ تم لوگ یہاں کیوں آئے ہو جاؤ اپنے گھر جہاں تم لوگ پہلے رہتے تھے۔“ وہ غصے میں سرخ چہرہ لیے بولتی چلی گئی۔
 اور باہر سے آتی بشری اس کا یہ روپ دیکھ کر حیران سی رہ گئی۔ اس کے پیچھے ذکیہ بھی تھیں۔
 ”سن لو اپنی بیٹی کے فرمان انہیں اب یہاں آنے والے مہمان بھی برے لگنے لگے ہیں۔“ وہ جتا کر بولیں۔
 ”مثلاً میری بہن! اولی گیسٹ سے ایسے کہتا ہے۔“ وہ نرمی سے مثال کو اپنے ساتھ لگا کر بولی۔
 ”مہمان! سن لو لوگوں کو پسند نہیں کرتی۔“ وہ بے لحاظ لہجے میں بولی۔
 ”کیوں بیٹا! احسن انکل تو بہت اچھے ہیں اور سیفی بھی۔“ وہ اس کے بال سنواریتے ہوئے نرمی سے بولی۔
 ”بٹ۔۔۔ آئی ڈونٹ لائیک۔۔۔ ایم۔“ وہ قطعیت سے بولی۔
 بشری کچھ کہہ نہ سکی۔ مثال اس سے ہاتھ چھڑا کہ اندر چلی گئی۔ سیفی اکیلا ہال سے کھینے لگا۔
 ”ابھی سے اس بچی میں خود سری آتی جا رہی ہے۔ تم نوٹ کر رہی ہو بشری؟“ ذکیہ خبردار کرنے والے انداز میں بولیں۔
 بشری تھکے ہوئے انداز میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ کچھ بول ہی نہ سکی۔

نوز پھل چلی گئی۔
 اور تیم کے لیے جیسے گھر کیا پورا شہر ہی ایک دم سے سونا ہو گیا۔
 پروین اور اس کی لڑکی آتیں۔ شتم شتم سارا کام بناتیں۔ دو ٹائم کی ہانڈی چڑھاتیں۔

Monthly Shuaa February 2014

مگر وہ اپنے ہی دھیان میں گم تھی۔
”مما! وہ غلی کے ماموں نے پھر پیغام بھیجا تھا کہ اپنی ’مما سے کہو وہ آکر ہمارا اسکول جوائن کر لیں۔“ وہ پھر سے ماں کو متوجہ کرنے کو بولا۔

”واٹن! خاموش ہو جاؤ، جتنی تمہاری عمر ہے نا اتنی بات کیا کرو۔ جب میں تمہیں منع کر چکی ہوں مجھے اس جگہ جا ب نہیں کرنی تو۔ اور کان کھول کر سن لو۔ آئندہ کسی کے سامنے اپنی مجبوریوں کے رونے نہیں رونو۔ یہ دنیا بہت دھوکے باز ہے۔ بہت سے جال ہیں اس کے پاس سنا تم نے۔“ وہ ایک دم سے اس پر برس پڑی۔
واٹن پریشان ساماں کی شکل دیکھتا رہ گیا۔

یہ بات خاصہ کو بھی آج ہی سمجھ میں آئی تھی کہ اپنی مجبوریوں اور بے بسی کا حال ہر کسی سے نہیں کہنا چاہیے۔ حتیٰ کہ الیا سے بھی نہیں۔ خالہ حمیدہ سے بھی نہیں۔ ہر ایک کے ساتھ ایک فاصلہ ضروری ہے۔ سننے کے لیے اس کا اللہ موجود ہے تو پھر ادھر ادھر کسی دوسرے سے کیوں کہتے پھریں۔ وہ جو اس کے دل کا حال جانتا ہے اب اسے کسی اور رازدار کی ضرورت نہیں۔
وہ فیصلہ کر کے مطمئن انداز میں انہہ کر اندر چلی گئی۔



”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی؟“ بشری کے لیے یہ بات کسی جھٹکے سے کم نہیں تھی۔
”اب کیا اس پر بھی انکار کرو گی۔“ وہ طنزیہ لہجے میں بولیں۔ بشری کو بہت برا لگا۔
”تو آپ کے خیال میں مجھے اقرار کر لینا چاہیے جھٹ سے۔“ وہ ناگوار سے بولی۔

ذکیہ بیٹی کی شکل دیکھتی رہ گئیں۔
”انکار کرو گی تو میں تجھوں کی تمہیں کفرانِ نعمت کی عادت پڑ گئی ہے۔“ وہ جتا کر بولیں تو بشری اچکھ کمرہ ہی نہ سکی۔

”بہر حال! حسن! جمال نے ابھی پروپوزل دیا ہے۔ وہ تم سے بھی بات کرے گا۔ بشری! میرے خیال میں اس سے اچھا رشتہ اور نہیں ہو گا۔ یوں تو طارق والے پروپوزل میں بھی کچھ کمی نہ تھی۔ لیکن یہ تو اپنے گھر کی بات ہے۔“
ذکیہ نرمی سے بولیں۔
”امی! جب مجھے شادی کرنی ہی نہیں۔“ وہ زور کر بولنے لگی۔
”میری بچی! جلد بازی نہیں کرو۔ خدا ایسی کرم نوازیاں ہر کسی پر نہیں کیا کرتا۔ آج اس نسیم کا حلیہ دیکھتا تھا تم نے۔“

بشری کچھ نہیں بولی کہ اس موضوع پر بات کرنا بہت تکلیف دہ تھا۔
”عدیل دوسری شادی پر راضی نہیں۔ اس نے اپنی ہر آس صرف مثال سے جوڑ رکھی ہے اور مثال کو آج تمہنے دیکھا۔ کیسے وہ بچی دادی کے آگے پیچھی جاری تھی۔ بیٹا! ناخنوں سے ماس جدا نہیں ہو سکتا۔ تم لا کھ اپنا سب کچھ اس بچی کے لیے بچھاؤ ورنہ تو بھی یہ ددھیال سے دور ہو گی، نہ باپ کی محبت کو نظر انداز کر سکتی ہے۔ تم سوچ لو اس لا حاصل تپیا میں تمہارے ہاتھ کیا آئے گا۔“ ذکیہ کہہ کر رک کر بول رہی تھیں۔
”اس بچی کے لیے سب کچھ تیاگ دو گی۔ یہ گل کو جوان ہو کر باپ کے ساتھ چلتی بنی۔ میری زندگی تو بھتھا چراغ ہے اور عمران۔ اس کی طرف سے میں تمہیں کوئی گارنٹی نہیں دے سکتی۔ وہ دل چاہے تمہارا بنے۔ ورنہ آج گھر میں بیوی آئی تو وہ اس کا ہو جائے گا۔“

اکثر شام میں رات کی روٹیاں پکا کر پھاٹ میں رکھ کر چلتی بنتیں۔
نسیم موٹے کپے کناروں والی اودھ کی روٹیوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتیں اور انہیں بشری کے ہاتھوں کے پھٹکے یاد آنے لگتے۔

پینڈیا فوزیہ بنا بھی لیتی تو روٹیاں بشری ہی بنا تی تھی کہ نسیم کو اسی کے ہاتھ کی روٹی چاہیے ہوتی تھی۔
چن کارا شن ہنٹوں میں نہیں ڈنوں میں بار بار حتم ہونے لگا۔ عدیل تو اکثر ہی رات کا کھانا باہر کھا کر آتا۔ معلوم نہیں کھاتا بھی تھا یا نہیں۔ بس آکر کمرے میں بڑ کر سوجاتا۔
نسیم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہاتھوں کی لگائی گریں اب وہ انتوں سے کیسے کھولیں۔ تھوڑی سی غلبت، تھوڑی سی جلد بازی نے کیسے زندگی کی کایا پلٹ ڈالی تھی۔
ان کے تو چند سال ہی تھے اور برے نعلے کٹ ہی جاتے مگر عدیل کی پوری زندگی۔ اگر وہ دوسری شادی نہیں کرتا تو اس کی مجرم نسیم ہی ہوتیں۔ وہ ابھی سے بیٹے سے نظریں چرانے لگی تھیں۔
رشتہ والی ان کے کہنے پر تین چار اچھے گھروں کے رشتے لائی بھی تھی۔ مگر عدیل تو کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔

اور تو اور نسیم کو اب مثال بے طرح یاد آتی اور اس بن تو ان سے صبر ہی نہیں ہو سکا۔ وہ ذکیہ کی طرف پہنچ گئیں مگر وہاں موجود احسن کمال کو دیکھ کر وہ تو جیسے دنگ ہی رہ گئیں۔ مثال گیٹ پر ہی مل گئی تھی۔
”واو! واو۔“ نو ڈکرہ نسیم کی ناگلوں سے لپٹ گئی۔
اور کچھ فاصلے پر احسن کمال کے ہمراہ ہر کی طرف جاتی بشری بے اختیار ٹھٹک کر رہ گئی۔
نسیم نے مثال کو خوب چمنا چمنا کر لیا کیا۔
”اپنی مانی کو بلا کر لاؤ مثال! میں نے ان سے بات کرنی ہے۔“ وہ وہیں گیٹ پر کھڑے بشری کو دیکھ کر لا تعلق بنتے ہوئے بولیں۔

”واو! اندر آ جا میں۔ اندر بیٹھ کر بات کر لیں۔“ مثال بڑے مودب انداز میں میزبان بنی کہہ رہی تھی۔
بشری کوچھی بھر کر غصہ آیا۔
”جن کی نسل ہے یہ دیکھتا۔ ان ہی پر بڑے گی۔ بے عروت، بے لحاظ، تم لاکھ اسے بھر بھر دودھ کے کنورے پلاؤ۔ یہ نسل ڈنگ مارنے سے باز نہیں آئے گی۔“ بشری کو وہیں کھڑے کھڑے ذکیہ کی بات یاد آنے لگی۔
مثال نے بڑے پیار سے دادی کا ہاتھ پکڑ کر انہیں لان میں پڑی کرسی پر بٹھایا اور خود مانی کو بلا نے چلی گئی۔
بشری آہستگی سے اندر چلی گئی تو احسن کمال خاموشی سے باہر نکل گیا۔ نسیم کے لیے ایک بڑا موقع ہاتھ لگ گیا۔



شام تک اوپر والے پورشن کی سیل ختم کر دی گئی۔
الیا نے جلد اچھے گرائے دار لانے کا وعدہ بھی کیا تھا مگر اب وہ واقعی ڈر گئی تھی۔
نیا آنے والا کسی اور ڈھب کا نکل آئے تو پھر وہ کیا کرے گی۔
ابھی تو غیب سے مدد آئی پولیس کی۔ اگر واقعی کوئی جرائم پیشہ آکر رہنے لگا۔ اسے یا بچوں کو نقصان پہنچا گیا تو۔
وہ اکیلی عورت کیا کرے گی۔ وہ اب بہت کچھ سوچنے لگی تھی۔
”مما! اب آپ ایسے کسی کو گھر میں نہیں گھسنے دیں گی اور دروازہ تو بغیر پوچھے دیکھے بالکل نہیں کھولیں گی۔“
واٹن اسے تاکید کر رہا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM WWW.PAKISTANWEB.PK

بشری کی آنکھوں میں نہ چاہئے ہوئے بھی انہی کی نگاہ نے اس کی لاچارگی کا نقشہ ہی کچھ ایسا کھینچا تھا۔

”میری بیٹی! میری زندگی میں پھر سے اپنے گھریار کی بوجاؤگی تو میں سکون سے آنکھیں بند کر سکوں گی۔ یوں طلاق کے بعد ایک بھی رشتہ خود سے آجائے تو فی زمانہ اسے مجھ سے سمجھا جاتا ہے اور اللہ نے تمہارے لیے دو دو رشتے بھیجے ہیں۔“

میں نے اسپیکر طارق کو بھی صاف جواب نہیں دیا لیکن میری مانو تو احسن کمال جیسا رشتہ کسی بھی طرح ٹھکرانے کے لائق نہیں۔ تم سوچو اور خوب ٹھنڈے دل اور دماغ سے غور کرو۔ بہت جلدی نہیں۔ ابھی وہ گھر ڈھونڈ رہا ہے اور پھر دیکھو! اس رشتے میں تو ماں، بہن والی کوئی چیخ چیخ بھی نہیں۔ ان چیزوں کی وجہ سے پہلے تمہارا بسا بسا گھرا جڑا۔ اسپیکر طارق کی تو پھر ماں سلامت ہے اور ہم کسی کی زندگی کی کمی کی دعا کیوں مانگیں۔ بہر حال تم سوچ لو۔“

بشری کی خاموشی کو نیم رضامندی جانتے ہوئے ذکیہ کہہ کر انہیں اور باہر نکل گئیں۔

اور سچ بات تو یہ ہے کہ صبح والا منظر بشری کی نظروں میں جیسے جم سا گیا تھا۔ مثال جس طرح وادی سے لپٹی تھی پھر انہیں کسی پر بٹھا کر تالی کو بلانے لگی راستے میں کھڑی ماں کو نظر انداز کر کے۔

”میں مثال پر جتنی بھی اپنی زندگی قربان کر دوں یہ باپ اور وادی کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ انہیں فراموش نہیں کر سکتی۔ پھر میں کیا کروں عدیل کی جگہ کسی اور کو۔ وہ بھی احسن کمال ایک نکتہ چین انسان جس کے ساتھ منگنی کا ایک ناخوشگوار عرصہ بھی وہ گزار چکی تھی۔ اس نے نہ اعمال ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔“

وہ ابھی کچھ بھی نہیں سوچنا چاہتی تھی۔ مگر اس کے باوجود سوچے جا رہی تھی کہ ان دنوں بارہ دنوں میں احسن کمال کی وجہ سے اس کی زندگی ایک دم سے بدل سی گئی ہے۔

اسے اب عدیل بہت کم یاد آتا تھا۔

اسے اپنے ساتھ ہونے والے سانچے سے پہنچنے والے زخم کی ٹہسیں بہت کم محسوس ہوتی تھیں۔ اسے بار بار خود اذیتی کا احساس بھی بہت کم ہونے لگا تھا۔

وہ بہت کچھ جو بہت برا تھا۔ بھولنے لگی تھی۔ اور اس میں سارا کمال احسن کمال کا تھا۔

احسن کمال بہت بدل گیا تھا۔ اس نے اتنے سارے دنوں میں ایک بار بھی اسے نہ عدیل کے حوالے سے کچھ کہا تھا نہ پوچھا تھا۔

نہ اس کی آئندہ زندگی کا کوئی خوفناک ڈرا دیا تھا۔ وہ گھر کے سروے کے دوران اسی کی رائے کو مقدم رکھ رہا تھا۔

کل اس نے اس کے ساتھ فرنیچر دیکھنے جانا تھا۔ گھر وہ فائل کر چکے تھے۔ ایسا گھر جس کا خواب بشری نے عدیل کے ساتھ سوچا تھا مگر جسے خرید احسن کمال رہا تھا۔

اور جس میں اسے تو نہیں رہنا تھا مگر پھر بھی وہ بہت خوشی سے اس کی ڈیکوریشن، تزئین و آرائش کے لیے پرجوش تھی۔ کیوں؟

”میں جانتا ہوں۔“ عدیل نے نسیم کی مریج مسالے سے گھڑی کہانی سننے کے بہت دیر بعد کہا بھی تو یہ مختصر سا جملہ۔

”کیا... یعنی وہ اس لڑکے کے ساتھ گلہ جھڑے اڑاتی پھر رہی ہے اور...“

”امی! وہ نہ اب میری بیوی ہے نہ میرا اس سے کوئی تعلق ہے تو بہتر ہے وہ جو بھی کر رہی ہے اسے کرنے دیں کہ اس کی ذاتی زندگی سے اب مجھے کوئی سروکار نہیں۔“ وہ تو ایک دم سے جیسے برف کی سل بن گیا تھا۔

”تیری لڑکی کی ماں تو ہے نا۔ کیا تربیت کرے گی وہ اس کی۔ یہ نہیں سوچتے تم۔“ نسیم نے عدیل کی کمزوری کو چھیڑا۔

وہ لمحہ بھر کو چپ ہو گیا۔

”میں آج کل میں کیس فائل کروا رہا ہوں مثال کی کسٹڈی کے لیے اگر بشری دو سری شادی کر لیتی ہے تو یہ بات میرے حق میں اور بھی اچھی ہوگی۔ اس طرح مثال کے مجھے ملنے کے چانسز بڑھ جائیں گے اور مجھے بشری کی دو سری شادی کا بہر حال انتظار تھا۔“ وہ کہہ کر اٹھ کر چلا گیا۔

اس کا رد عمل نسیم کی توقع کے برعکس تھا۔

”مثال تو اس کے حواسوں پر چھا گئی ہے اس چھٹکی کی فکر ہے اور اپنی زندگی کی کچھ فکر نہیں کہ اس کا بھی کچھ کرنا ہے۔ وہ بڑبڑانے لگی۔“

”اگر بشری شادی کر لیتی ہے اور مثال یہاں آجاتی ہے تو اس کو سنبھالے گا کون۔ اور یہ عدیل پھر تو کبھی دو سری شادی نہیں کرے گا۔ یا اللہ! میں کیا کروں یہ فوزیہ بھی اتنی دور جا کر بیٹھ گئی۔“ وہ سخت پریشان تھیں۔



”میں جانتا ہوں جس طرح میں نے تم سے منگنی کی اور پھر جس طرح غلط طریقے سے توڑ کر چلا گیا اور منگنی کے دوران میں تمہیں پریشان کرتا رہا۔ تمہارے دل میں میری جگہ بہت پسندیدہ نہیں۔“ دونوں چاندنی چاندنی میں باہر لان میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ جب احسن کمال نے ایک دم سے کہنا شروع کر دیا۔

”ان دنوں میرے لیے کچھ بھی اہم نہیں تھا۔ میری ترجیحات ہر روز بدلتی تھیں۔ تم مجھے بہت اچھی لگتی تھیں مگر جب تم منگنی کے بعد میری دسترس میں آ گئیں تو میں نے تمہیں تنگ کرنا شروع کر دیا۔ کبھی کسی بات پر، کبھی کسی بات پر اور میں دل میں توقع کرتا تھا کہ تم مجھ سے لڑو گی اور پہلے کی طرح ری ایکٹ کرو گی مگر تم مجھ سے مزید دور ہوتی چلی گئیں اور میں اس ضد میں تمہیں اور ستا تا کہ ایسے میں نازیہ آئی۔“

ان دنوں گرین گارڈ کس کا خواب نہیں تھا۔ میں نے اس غیر متوقع تحفے کو خدائی نعمت سمجھا اور فوراً سے پیشتر اپنی ترجیح بدل دی۔ میں نے صرف اپنے لیے سوچا اور پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

لیکن یقین کرو اور اس یقین کو دلانے کے لیے میرے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ نازیہ بھٹی جس احسن کمال کو اپنے ساتھ امریکالے کر گئی وہ کوئی اور احسن کمال تھا۔ اصل والا احسن تو پیچھے کہیں تمہاری معصوم صورت کے ساتھ بندھا رہ گیا۔

بشری! مجھے وہاں جا کر معلوم ہوا میں تو تمہارے عشق میں گرفتار ہو چکا ہوں۔ پھر اس کے بعد آنے والے ہر مہینے سال، ہفتے دن گھڑیاں اس عشق کو بڑھاتی چلی گئیں اور میں بے بس ہوتا چلا گیا۔“

وہ کہتا جا رہا تھا اور بشری کسی بہت کی طرح ساکن بیٹھی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

بیکم

عدیل اور فوزیہ نسیم بیکم کے بچے ہیں۔ بشری ان کی بیوی اور ذکیہ بیکم کی بیٹی ہے۔ عمران بشری کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیکم کی نوایس اور نسیم بیکم کی پوتی ہے۔ بشری اور نسیم بیکم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیکم مصلحت پر مبنی ہوئے لگاؤ و کھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیکم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشری کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ سناچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشری کی سند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشری اور لہنا نظیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل نظیر کا بشری کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن زاہدہ اور ذکیہ بیکم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشری اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیکم کو بتانے سے منع کرتا ہے۔ بشری اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشری کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کراڑے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹ اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہیں۔ عاصمہ کو فون کے ذریعے کوئی اطلاع ملتی ہے جسے سن کر وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔

فون پر پتا چلتا ہے کہ شہر آتے ہوئے عفان اور فاروق صاحب ڈیکتی کی واردات میں قتل ہو گئے۔ عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹ سے سات لاکھ روپے



وصول کراپاتی ہے۔ زہر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔ اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقولین کو رکھتا ہے۔ زاہدہ نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشری سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔ حمیدہ خالدہ عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زہر کا اکیلے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں جبکہ عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زہر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آجاتا ہے کہ وہ انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے۔ سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔ رقم مہانہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر سو اور اس کے گھر والوں کو مورد الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشری کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل طیش میں بشری کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا ابارشن ہو جاتا ہے۔ شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔

اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دکھاتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے بے خبر آکر خود کشی کی کوشش کرتی ہے تاہم سچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آجاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو پتا چلتا ہے کہ زہر نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بند کر دیے ہیں اور اب مغرب ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم عاصمہ کو ایک مکان دلا پاتا ہے۔ بشری اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کر دیتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل سخت پریشان ہے۔ عدیل مکان کا اوپر والا اور بشری کے لیے سیٹ کواڑتا ہے اور کچھ دنوں بعد بشری کو مجبور کرتا ہے کہ وہ فوزیہ کے لیے عمران کا رشتہ لائے۔ نسیم بیگم اور عمران کسی طور نہیں مانتے۔ عدیل اپنی بات نہ مانے جانے پر بشری سے جھگڑتا ہے۔ بشری بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ عدیل طیش میں بشری کو طلاق دے دیتا ہے اور مثال کو چھین لیتا ہے۔ مثال بیمار پڑ جاتی ہے۔ بشری بھی حواس کھو دیتی ہے۔ عمران بہن کی حالت دیکھ کر مثال کو عدیل سے چھین کر لے آتا ہے۔ عدیل عمران پر اغوا کا پرحال کھڑا ہوتا ہے۔

عاصمہ اسکول میں ملازمت کر لیتی ہے مگر گھریلو مسائل کی وجہ سے آئے دن چھٹیاں کرنے کی وجہ سے ملازمت چلی جاتی ہے۔ اچانک ہی فوزیہ کا کہیں رشتہ طے ہو جاتا ہے۔ انسپکٹر طارق دونوں فریقین کو سمجھا بھگا کر مصالحت پر آمادہ کرتے ہیں۔ ذکیہ بیگم کی خواہش ہے کہ عدیل مثال کو لے جائے تاکہ وہ بشری کی کہیں اور شادی کر سکیں۔ دوسری طرف نسیم بیگم بھی ایسا ہی سوچے بیٹھی ہیں۔ فوزیہ کی شادی کے بعد نسیم بیگم کو اپنی جلد بازی پر پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔ انسپکٹر طارق ذکیہ بیگم سے فوزیہ کا رشتہ مانتے ہیں۔ ذکیہ بیگم خوش ہو جاتی ہیں مگر بشری کو یہ بات پسند نہیں آتی۔ ایک پراسراری عورت عاصمہ کے گھر بطور کرائے دار رہنے لگتی ہے۔ وہ اپنی حرکتوں اور انداز سے جاہلوں نے والی عورت لگتی ہے۔ عاصمہ بہت مشکل سے اسے نکال بیاتی ہے۔

بشری کا سابقہ منگیترا حسن کمال ایک طویل عرصے بعد امریکا سے لوٹ آتا ہے۔ وہ گرین کارڈ کے لالچ میں بشری سے منگنی توڑ کر نازیہ بھٹی سے شادی کر لیتا ہے۔ پھر شادی کے ناکام ہو جانے پر ایک بیٹے سیفی کے ساتھ دوبارہ اپنی بیوی ذکیہ بیگم کے پاس آجاتا ہے اور دوبارہ شادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ بشری تذبذب کا شکار ہو جاتی ہے۔

— ۱۲ —
چوہوئیں قیامت

احسن کمال پہلے بھی اتنا بڑا فنکار تھا یا یہ اضافی خوبی اب اس میں پیدا ہوئی تھی بشری آہستہ آہستہ اس سے متاثر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اسے اپنی باتوں میں کچھ اس طرح سے الجھاتا کہ وہ کسی اور طرف نہ دیکھ پاتی نہ زیادہ سوچ بچار کرتی۔ وہ ہر مشورے میں اسے شامل کرتا اور اولیت اس کی رائے کو دیتا بشری کا کھویا ہوا اعتماد جیسے بحال ہونے لگا تھا۔ بہت دنوں بہت سارے دنوں کے بعد اس نے اپنے اوپر پھر سے دھیان دینا شروع کیا تھا۔ اس پر کون سے رنگ کھلتے تھے۔ کن رنگوں میں وہ خود کو بہت الگ سا محسوس کرتی تھی۔ کون سا فیشن کا لباس اس کے نازک بدن پر اٹھتا تھا نہ چاہتے ہوئے اس کے ہاتھ الماری سے ان ڈریسز کے ڈیزائننگ لگتے۔ اگرچہ کچھ مزاحمت بھی اس کے اندر ہوتی۔ وہ متذبذب سی گو گو کیفیت میں وہ لباس واپس الماری میں رکھ دیتی مگر آگے ہی روزیاد چار دن بعد جب نما کر نکلتی تو عجلت میں بالکل غیر شعوری طور پر وہی لباس نکال کر زیب تن کر لیتی۔

”یہ وہ سوٹ ہے نا جو پایا آپ کے لیے میری کچھلی برتھ ڈے پر لے کر آئے تھے؟“ وہ شرٹ پہن چکی تھی۔ دوپٹہ ابھی ڈیسک میں تھا جب مثال اندر آکر اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ بشری کو جیسے کسی نے سچچ کر پھرا دیا ہو۔ اس کے تیزی سے برٹ کرتے ہاتھ وہیں پر ٹھک گئے۔ اس کے ریشمی تازہ شیپو کنڈیشنر کے بال بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔

”مما! یہ سوٹ آپ پر بہت اچھا لگتا ہے۔ پایا بھی یہی کہتے تھے نا!“ مثال ثمرین کے پاس آکر اس کی شرٹ پہ نرمی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

بشری کے خون میں ابال اٹھا تھا جیسے سب کچھ تمس تمس کر ڈالے گا۔ شاید مثال کو بھی۔ اس نے زور سے کھینچ کر ہینو برش ڈریننگ ٹیبل پر مار دیا۔

”تم جانتی ہوتی۔ بتایا ہے نا میں نے تمہیں کہ اب تمہارے پایا سے میرا کوئی رشتہ نہیں۔ کیوں بار بار اس شخص کا نام لیتی ہو میرے سامنے۔ مجھے تکلیف دینے میں تمہیں مزا آتا ہے۔ ہاں مزا تو آئے گا۔ ہونا اسی پتھریل انسان کی بیٹی۔ اس سنگ دل فیملی کا حصہ جس نے مجھے دھکے دے کر گھر سے نکالا۔ یہ بات تمہیں یاد نہیں آتی۔“ وہ پہلی بار یوں سچ کر مثال سے بولی تھی۔ مثال خوف زدہ سی ذرا سا پیچھے ہٹ گئی۔ اس کی سرمئی آنکھوں میں ڈر اور وحشت تھی۔

”مما!“ سفید پڑتے لیوں سے صرف یہی نکل سکا۔ ”تم مجھے خوش دیکھنا ہی نہیں چاہتیں۔ میں اس گھنپا انسان کا بیٹہ کر سوگ مناتی رہوں۔ اندھیرے کمرے میں پڑی روٹی رہوں۔ خود کو فراموش کر دوں بھول جاؤں کہ اس زندگی پر اس کی خوشیوں پہ کچھ میرا بھی حق ہے یہی چاہتی ہوتی تم۔“ اس کے اندر کا پوریشن جیسے باہر نکل رہا تھا۔ مثال ڈری ہوئی خوف زدہ سی دیوار کے ساتھ جا لگی تھی۔

”تنے دنوں اتنے مہینوں سے میں یونہی پڑی ہوں زنگ آلو سی۔ تمہیں کبھی ماں پر تو ترس آیا نہیں۔ میرا تو خیال آیا نہیں اور باپ۔ اس کو تم بھولتی نہیں۔“ اس روز کیسے دادی کے آگے پیچھے پھر رہی تھیں تم۔ وہ ذلیل عورت جس کی وجہ سے آج ہم یہاں پڑے ہیں۔ جانتی ہوتی تم اسی عورت کی وجہ سے ہو اٹھا یہ سب۔“ مثال پھٹی آنکھوں اور سفید ہونٹوں کے ساتھ پلکیں جھپکے بغیر یک ٹک چینی چلاتی ماں کو دیکھے جا رہی تھی۔

”اتنی نا سمجھ اور منحی بھی نہیں ہو تم۔ اب سمجھ سکتی ہو ان ساری باتوں کو کہ کن لوگوں کی وجہ سے ہم دونوں امی کے گھر آ رہے ہیں۔“ اس کے اندر سے اٹھے غصے کا ابال کچھ ٹھنڈا پڑنے لگا تھا۔ اسے اپنی چیختی آواز کی گونج سی سنائی دی تو اسے لگا کہ وہ مثال کو کچھ زیادہ ہی بول گئی ہے۔

کچھ دیر خاموش رہ کر غصے پر قابو پانے لگی۔
”مثال میں بھی تو تمہاری ماں ہوں بیٹا! تمہیں میرا بھی تو خیال ہونا چاہیے۔ تمہیں حاصل کرنے کے لیے جس طرح میں تمہارے باپ سے لڑ رہی ہوں۔“ وہ اب کے نرم لہجے میں بولی اور آگے بڑھ کر مثال کا ہاتھ پکڑ لیا پھر اسے اپنے ساتھ صوفے بٹھا کر خاموشی سے دیکھتی رہی۔

”ایک بات بتاؤ مجھے مثال! بہت دیر بعد وہ اس کے غصے سے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر نرمی سے بولی۔
”سوری۔۔۔ ماما! آپ کو غصہ آ گیا تھا۔ میں تو۔۔۔“ مثال ماں کی محبت پا کر آنکھوں میں آنسو لیے بولی۔
”ہاں۔ بہت غصہ آ گیا تھا۔ اگرچہ نہیں آنا چاہیے تھا۔ اس سارے میں تمہارا تو کوئی قصور نہیں ہے۔“

اس کا غصہ جھاگ کی طرح جھینٹ گیا تھا۔
مثال ماں کو پیار اور ہمدردی سے دیکھنے لگی۔
”ماما! پہلے تو کبھی ایسے نہیں چلائی تھیں۔ انہیں میری بات بہت بری لگی ہوگی۔ مجھے ماما کا بھی خیال کرنا چاہیے۔“ وہ اب جانب داری سے ماں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔
”مثال اگر تمہیں صرف میرے پاس رہنا ہو؟“ بشری بہت سوچ سوچ کر بولی تھی۔

مثال نا سمجھی سے ماں کی طرف دیکھنے لگی۔
”ہیں آپ کے پاس بھی تو ہوں نا۔“ وہ بہت ہولے سے ماں کی گود میں سر رکھ کر افسردگی سے بولی۔
”اگر ماما نے ناراض ہو کر اسے خود سے دور کر دیا تو اسے تو پاپا کے گھر کا راستہ بھی خود سے نہیں آتا۔“ پہلی خوف زدہ کرنے والی سوچ بھی اس کے دل میں آئی تھی۔

”نہیں مثال! بشری جیسے اسے سمجھانے کے لیے موزوں الفاظ سوچنے لگی۔ مثال بڑی بڑی آنکھیں کھولے سر اٹھا کر ماں کو دیکھ رہی تھی۔
”اگر تمہیں صرف میرے پاس رہنا پڑے۔ یا پھر صرف اپنے پاپا کے پاس مطلب۔ ہم دونوں میں سے صرف ایک کے ساتھ۔“

بشری اس کے بال سہلاتے ہوئے رک کر بولی۔ مثال یک تک اس کی طرف دیکھنے لگی۔
”تم رہ لوگی میرے ساتھ صرف۔ یا اپنے پاپا کے ساتھ صرف۔“ وہ ”صرف“ پر زور دے کر بولی۔
”بولو مثال! مجھے تمہارا جواب چاہیے۔“ وہ پیار سے اس کی کشادہ پیشانی چوم کر بولی۔

”ہا حق میں نے اپنی گڑیا کو اتنا ڈانٹا۔“ بشری کے دل میں ملال سا ابھرا۔
”ماما۔ میں نہیں رہ سکتی ایسے۔“ وہ ڈرے ہوئے انداز میں اٹک کر بولی۔
”کیا مطلب بیٹا! میں نہیں سمجھی۔“ بشری اس کی پونہ ٹھیک کرتے رک کر بولی۔
”ماما! میں آپ کی طرف سے آپ کے پاس۔ یا پاپا کے پاس۔ نہیں رہ سکتی۔ میں آپ دونوں کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے آپ دونوں کے ساتھ رہنا اچھا لگتا ہے۔ میں۔“ وہ کہتے کہتے ماں کے سینے میں منہ چھپا کر سسکنے لگی۔

بشری جیسے ساکت سی رہ گئی۔
وہ تو سمجھ رہی تھی شاید اتنے دنوں میں مثال۔ یہ بات سمجھ گئی ہوگی کہ یہ ممکن نہیں اور پھر جس طرح اسے بشری نے اسے اتنے دنوں سے ہاتھ کاچھالا بنا کر رکھا ہے وہ صرف اس کے ساتھ رہنا چاہیے گی۔

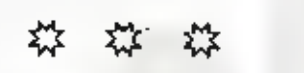
گھر عدیل کی محبت اس کے دل میں ابھی بھی کمزور نہیں پڑی تھی۔
”مثال! وہ صرف اتنا کہہ سکی۔ مثال ماں کے سینے سے لگی سسکتی رہی۔
”میری بچی یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ، ہم دونوں کے ساتھ۔ ہم دونوں اب کبھی ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔“

آپ کو فیصلہ کرنا ہو گا کہ آپ کو کس کے ساتھ رہنا ہے۔ میرے ساتھ صرف یا اپنے پاپا کے ساتھ۔“ وہ اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر بولی اور اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو بشری کو ترپا گئے۔
”ہیں ماما! میں نہیں جانتی۔“ وہ صاف اقرار بھی نہیں کر رہی تھی کہ اسے دونوں میں سے کس کے ساتھ رہنا ہے۔

اور بشری تو جیسے خود پر بھی حیران تھی۔ آج سے پہلے تو کوئی یہ بات مذاق میں بھی کہتا تھا کہ مثال کو عدیل کے پاس چھوڑ آ تو وہ مرے مارنے پر مل جاتی تھی اور آج خود وہ یہ سب مثال سے پوچھ رہی تھی۔ وہ اپنی اس کلیا پلمٹپہ خود بھی جیسے حیران سی تھی مثال کو تو اس نے کچھ نہیں کہا۔
کہ بالکل صاف جواب تو وہ ابھی خود کو نہیں دے پائی تھی کہ مثال کو کس کے ساتھ رہنا چاہیے تو یہ معصوم سی بچی کیا فوراً جواب دیتی۔

”مگر کیا میں خود اپنے فیصلے سے پھر چکی ہوں کہ مثال صرف میرے پاس رہے گی؟“ وہ خود سے پوچھ رہی تھی۔
”نہیں۔۔۔ نہیں میں مثال کو کبھی خود سے جدا نہیں کر سکتی۔ میں اس کے بغیر رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ نہیں نہیں۔“ وہ زور سے خود اپنی نفی کرنے لگی۔

”پھر میں نے مثال سے کیوں پوچھا؟“ اس کے پاس پڑا سیل فون بج رہا تھا۔
”حسن کمال! جیسے اس کا نام دیکھتے ہوئے اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔
”کیا! حسن کمال کی وجہ سے میں نے یہ سب سوچا کہ مثال عدیل کے پاس چلی جائے تو۔“
”نہیں نہیں۔ میں اتنی خود غرض نہیں ہو سکتی۔ میں اپنی بیٹی کو۔ جان سے پیاری بیٹی کو خود سے دور نہیں کر سکتی۔“ فون بجے جا رہا تھا اور وہ خود کو مضبوط کر رہی تھی۔



عاصمہ نے کلام پاک پڑھ کر اسے بند کرتے ہوئے الماری میں رکھا۔
آج شام کو اس نے محلے کی چند خواتین کو۔ قرآن خوانی کے لیے گھر میں بلا یا تھا۔
”جب آپ کو ہمیں سے سکون نہ ملے تو پھر اللہ کے کلام کی طرف رجوع کرو۔“ اس کے دل نے اسے یہ راہ سمجھائی تھی۔

اس نے اوپر کا پورشن صاف کرنے کے بعد قالین جو ان کے پہلے ڈرائنگ روم میں بچھا تھا وہ بچھا کر چادریں بچھا دیں چائے کے ساتھ اس نے گھر میں سمو سے ”آلو“ چکن کباب اور شٹھاتیا رکھا تھا۔
خرچا ہو گیا تھا مگر جانے کیوں اس کے دل کو یقین تھا۔ آج کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکل آئے گا۔
اس کا فون مسلسل بج رہا تھا۔

وہ اپنی سوچوں سے نکل کر تیزی سے بچن سے باہر آئی۔
باشم بھائی کی کال تھی۔ اس کا دل خوش ہو گیا۔
”بہت کوشش کر رہا ہوں عاصمہ! کسی طرح واپسی کی کوئی راہ نکل آئے مگر ابھی اللہ کو شاید منظور نہیں۔“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ایچ آر ایچ کے ساتھ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ سرچیم کو الٹی، مارل کو الٹی، کیریڈ کو الٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن عقی کی مکمل ریٹخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

میرے ویزے کی مدت پانچ سال ہے۔ سوچ رہا ہوں۔ درمیان میں ایک چکر لگا لوں دونوں بچوں اور تمہاری بھانجی کو ساتھ لے کر۔

”بھائی! یہ تو بہت خوشی کی خبر ہے۔ کب آئیں گے آپ؟“ وہ یہ بات سن کر ہی جیسے جی اٹھی۔ ”بھائی مجھے بھی آپ سے کچھ ضروری مشورے کرنے ہیں فون پر تو بہت مشکل ہوتا ہے۔“

”ابھی کچھ دنوں میں بتا دوں گا اور سنو میں تھوڑے سے پیسے بچھ رہا ہوں۔ تمہارے اکاؤنٹ میں کل ٹرانسفر ہو جائیں گے۔“

”بھائی نہیں پلیز یہ نہیں کریں۔ میں۔“

”عاصمہ! مجھے شرمندہ نہیں کرو۔ میں پہلے ہی تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکا۔“ ہاشم کچھ شرمندگی سے بولا۔

”آپ کی وجہ سے تو بھائی! اپنے بچوں کو اپنی چھت تلے لے کر بیٹھی ہوں ورنہ میں تو جیسے پوری دنیا میں بے آسرا ہو گئی تھی۔ بہت کچھ کیا ہے آپ نے میرے لیے۔ میں آپ کا احسان نہیں چکا سکتی۔“

عاصمہ کو وہ خوفناک دن یاد آئے تو آنسو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

”غیروں جیسی باتیں نہیں کرو، یہ تمہارا حق تھا مجھ پر اور میں الیاس کو فون کر رہا ہوں۔ اس کا نمبر نہیں مل رہا ہے۔ کیا اس کا نمبر بدل گیا ہے؟“

”جی بھائی! میں آپ کو دیتی ہوں اس کا نیا نمبر۔“

”کرائے دار ٹھیک طرح سے رہ رہے ہیں نا؟“ کرایہ وقت پر دیتے ہیں؟ کوئی مسئلہ تو نہیں؟“ عاصمہ اس کی بات سن کر ٹھنک سی گئی۔

”اب بھائی الیاس کو فون کریں گے اور وہ میری بے وقوفی کے بارے میں بتائے گا تو ہاشم بھائی کیا کہیں گے۔ نہیں جب تک نئے کرائے دار نہیں آجاتے، مجھے ابھی بھائی کو نہیں بتانا کچھ بھی۔“ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ الیاس کا نمبر ابھی ہاشم کو نہیں دے گی۔

دو چار ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ہاشم نے فون بند کر دیا۔

عاصمہ گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے تیزی سے کچن میں چلی گئی کہ ابھی بہت کچھ کرنے والا رہتا تھا اور ٹائم کم تھا۔



بشری مثال کا ہاتھ تھا چہرے پر۔ خوشگوار مسکراہٹ لیے دوسرا ہاتھ سینٹی کے ہاتھ میں دیے احسن کمال کے ساتھ چل رہی تھی۔ چاروں بہت خوشگوار موڈ میں تھے۔

باتیں کرتے ہوئے کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ بشری باری باری جھک کر دونوں بچوں سے کچھ پوچھ رہی تھی۔ احسن کمال خنجر نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

وہ بھی ساتھ میں جھلکا اور پھر مسکراتے ہوئے باتیں کرتے چاروں آگے بڑھ گئے۔ عدیل کو لگا کہ جس جگہ کھڑا ہے اب صدیوں تک وہاں سے مل نہیں سکے گا۔ پتھر کا بن کر رہ گیا ہے۔ اسے تو یہ بھی پتا نہیں چل رہا تھا کہ اس کی سانسیں چل بھی رہی ہیں یا نہیں۔ اتنے مہینوں کے بعد بشری کو دیکھا تھا۔ یوں ہنستے مسکراتے خوشگوار موڈ میں۔

اس کی مثال خوب صورت فراک میں ماں اور دو اجنبیوں کے ساتھ کتنی خوش اور کھلی کھلی سی تھی۔

”پھر میں کون ہوں۔؟ کیوں ہوں۔؟ کس لیے میرا ان کے ساتھ تعلق تھا اگر مجھے یہ منظر ہی دکھانا تھا تو۔“
 اس کی آنکھیں بے طرح جلنے لگی تھیں۔
 ”پلیز۔ راستہ دیں۔“ وہ کب سے رستے کے بیچ میں کھڑا تھا۔ کسی نے پیچھے سے کہا تھا۔
 وہ چونک کر خالی خالی نظروں سے ارد گرد کی چوٹیوں کو دیکھنے لگا۔
 بہت پر رونق شاپنگ مال تھا یہ۔

اور وہ بہت دنوں بعد آج مثال کے لیے کچھ خریدنے نکلا تھا۔
 وہ سوچ رہا تھا کہ فون کر کے ذکیہ سے کہے کہ وہ مثال کو لینے کے لیے آ رہا ہے۔ کچھ دیر میں شاپنگ کے بعد اسے
 واپس چھوڑ جانے لگا۔
 ”تو ای کا کہا جھوٹ نہیں تھا لیکن وہ سب سن کر بھی مجھے کچھ نہیں ہوا تھا مگر یہ منظر۔ یہ منظر کتنا تکلیف دہ تھا
 جیسے کسی نے مجھے پھانسی پر چڑھا کر بغیر تپائے ری چھینچ دی ہو اور میرا وجود کسی خلا میں معلق ہو۔
 بشری کی ہنسی، مثال کی مسکراہٹ سب کچھ تو موجود ہے، بریاد تو صرف میں ہوا ہوں۔ خالی ہاتھ، خالی دل تو میں
 ہوں۔“

میں اکیلا ہوں۔ بالکل اکیلا۔ اس بھرے شہر اس بھری دنیا میں بالکل تنہا۔
 اسے رونا آ رہا تھا۔

وہ کسی کے بھی کندھے پر ڈیوار پر سر رکھ کر بہت رونا چاہ رہا تھا۔
 اسٹیرنگ پر اس کی انگلیوں کی گرفت، بہت مضبوط تھی مگر پھر بھی جانے کیسے وہ غلط موڑ کاٹ رہا تھا۔ غلط سا بیڑ
 میں جا رہا تھا۔ اس نے اشارہ بھی کیا۔
 اور پھر ایک تنہا اکیلی سنسان سڑک پر جا کر اس نے بالکل درمیان میں ایک دم سے بریک لگا دی۔ ہر طرف
 شانے کا راج تھا۔
 یہ کوئی پوش رہائشی ایریا تھا۔ ارد گرد کھڑی سنگ مرمر کی اونچی اونچی کوشیاں، جتنکے سب بالکل خاموش اس کی
 طرف دیکھ رہے تھے۔ اسے لگا جیسے ہر کھڑی ہر دروازے میں بشری اور مثال کھڑی ہیں اور دونوں ہنس رہی ہیں
 مسکرا رہی ہیں۔

بشری، مثال کو گود میں اٹھا کر اس کی طرف طنزیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اسے بہت کچھ بتا رہی ہے۔
 ”دیکھو، گیا ہوا۔ مجھے تم نے چھوڑ بھی دیا تو کیا ہوا۔ میں تو ابھی بھی مکمل ہوں۔ ادھورے تو تم ہو گئے اور ادھورے
 آدھے اکیلے، نا مکمل تم مجھے بریاد کرنا چاہتے تھے نا۔ بریاد تو تم ہو گئے۔ ہم تو ابھی بھی آباد ہیں خوش ہیں اور سکھی
 ہیں۔“

عدیل کو پتا بھی نہیں چلا۔ کب اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔
 وہ اسٹیرنگ پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اسے لگا اس نے آج ہی بشری کو چھوڑا ہے۔ آج ہی اس کا گھر ٹوٹا ہے آج ہی مثال اس سے ہمیشہ کے لیے
 چھڑ گئی ہے۔
 ”دیکھو۔ دیکھ لو میں تو ہمارے بھی جیت گئی۔ اصل میں تو ہمارا اللہ نے تمہاری قسمت میں لکھی تھی۔ تم نے
 بے جا حال شہر کی سڑکوں پر اکیلے اپنی مروا گئی کا زعم لیے پھرتے رہو۔ اکیلے تنہا بریاد۔“ عدیل شاکد تھا۔
 بشری پھر کسی کھڑکی میں آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔
 اس کے چہرے پہ ہنسی اور مسکراہٹ نہیں تھی۔ نفرت اور حقارت تھی۔ لبوں پہ زہریلی مسکراہٹ تھی۔

عدیل کا یوں ایک دم سے اسپینڈ بڑھا تا چلا گیا۔
 وہ شہر کی روشن سڑکوں پر بھی یوں اندھا دھند گاڑی دوڑا رہا تھا جیسے پورے شہر میں وہ ایک گاڑی چلا رہا ہو۔
 ”وہ کیا سمجھتی ہے خود کو۔ میں بریاد ہوا ہوں۔ میں ہارا ہوں۔ اب میں اسے بتاؤں گا کہ کون ہارا ہے کون بریاد ہوا
 ہے۔ میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔“ غصہ، عین نفرت، انتقام اس کے دل دماغ پہ طاری تھے۔



قرآن خوانی کے بعد حاجن خالہ نے صدق دل سے بہت اچھی دعا کرائی تھی۔
 عاصمہ کے دل کو بہت سکون ملا تھا۔

”عاصمہ آپا! آپ کو ایک مشورہ دوں میں؟“ ساتھ والی نسرین کی بیٹی سعدیہ اس کے ساتھ کچن کے کام میں مدد
 کروا رہی تھی۔

واثق اور بیچیاں خالی برتن نیچے لاکھے تھیں۔
 عاصمہ انہیں دھو رہی تھی اور سعدیہ پھرتی سے سب کچھ سمیٹتی جا رہی تھی۔ عام سے نقوش والی مناسب قد
 کاٹھ کی سعدیہ جس کا رشتہ فی الحال کہیں نہیں ہو رہا تھا۔ جو نسرین کے لیے سرد رہا تھا مگر سعدیہ ایک متوازن
 شخصیت کی مالک تھی۔ کبھی اس کے چہرے سے اندر کے درد جزر کی خبر نہ ہوتی تھی۔
 ”کیسا مشورہ بھی؟“ عاصمہ بہت ہلکی پھلکی ہو چکی تھی۔

”آپ اپنا یہ پورشن ابھی کرائے نہ نہیں دیں۔“
 ”کیا مطلب۔؟ تم جانتی ہو ناں فی الحال میرے پاس جاب نہیں ہے تو ہمارا گزارا اسی پورشن کے کرائے پہ
 ہے۔“ عاصمہ اسے ٹوک کر بولی۔
 ”تو کیا فائدہ ایسے غلط سلط لوگ آرہے ہیں اگر اس الیاس نے اور کوئی الٹا سیدھا اٹھائی گہرا بھیج دیا تو۔“
 سعدیہ بولی۔

”اب تم مجھے ڈراؤ گی۔“ عاصمہ پریشان ہو کر بولی۔
 ”آپ کے برتن کتنے رہ گئے؟“ سعدیہ کچن تقریباً ”سمیٹ چکی تھی۔“
 ہاں۔ بس ہو گئے۔“ عاصمہ نے جلدی جلدی ہائی کے برتن دھو کر نوٹی بند کر دی۔
 ”تو آجائیں۔ باہر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔“

سعدیہ اس سے کہہ کر باہر نکل گئی تو عاصمہ نے بھی دو چار چیزیں سمیٹیں۔ کچن کی لائٹ بند کی اور باہر نکل آئی۔
 ”آپ اپنے اوپر والے پورشن میں ٹوشن سینٹر کھول لیں۔“
 ”ٹوشن سینٹر! اشاء اللہ۔ بچے کہاں سے آئیں گے؟“ عاصمہ جیسے طنز سے بولی۔

”تم نے بچے تو میرے پاس آئے ہیں پڑھنے۔ ہمارے گھر میں تو جگہ ہی نہیں ہے کہ میں دو تین سے زیادہ بچے پڑھا
 سکوں جب کہ مجھے ان بچوں کے کچھ جاننے والے بچے بار بار آکر کہتے ہیں کہ انہیں بھی ٹوشن پڑھنی ہے۔ لیکن
 ماں اجازت نہیں دیتیں۔“

عاصمہ خاموش بیٹھی جیسے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔
 ”میں تمہاری بات نہیں سمجھی سعدیہ!“ وہ متانت سے بولی۔
 ”تقریباً دس سے بارہ بچے ہوں گے ٹوشن کے ہم دونوں مل کر پڑھائیں گے۔ اسی حساب سے ہم دونوں
 فیس بھی تقسیم کر لیں گے چونکہ ٹوشن سینٹر کی جگہ آپ کی ہوگی تو آپ کو تین حصے اور میں ایک حصہ فیس کا لیا

کروں گی۔ آہستہ آہستہ بچوں کی تعداد بڑھے گی تو ہم صبح میں یہاں چھوٹے بچوں کی نرسری بھی شروع کر سکتے ہیں۔ مسعدیہ جوش میں کہہ رہی تھی۔

”مما! مسعدیہ تبا بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ چھ سات بچے تو میں بھی لے آؤں گا جو ہمارے محلے میں یا کچھ قاصدے پر رہتے ہیں۔“

”لیکن واائق!“ عاصمہ پریشان سی ہو گئی۔

”لیکن کیا آپ؟“ مسعدیہ غل سے بولی۔

”میں اتنی بڑھی لکھی کب ہوں۔ میں زیادہ ٹیوشن۔ میرا مطلب ہے زیادہ پانچویں چھٹی کے بچوں کو پڑھا سکتی ہوں وہ بھی سکس کامیتھس نہیں۔“ وہ جھجک کر بولی۔

”بھئی یہ سب مہینہ کر لیں گے۔ آپ باہمی تو بھریں۔ کل سے ہی شروع کرتے ہیں بس یہ مہینہ۔ بلکہ نہیں جو بچے ایڈوائس دیں گے تو اس سے آپ کا کچھ گزارا ہو جائے گا۔“ مسعدیہ چٹیلوں میں مسئلہ حل کرتے ہوئے بولی۔

”مسعدیہ! یہ بہت مشکل ہے۔“ عاصمہ متذہب تھی۔

”مما! آپ ہی تو کہتی ہیں مشکل کے ساتھ آسانی ہوتی ہے۔ ہمیں نظر نہیں آتی جب ہم ارادہ کرتے ہیں تو پھر نظر آنے لگتی ہے۔“ واائق عاصمہ کے اقوال زریں خوب یاد رکھتا تھا ایسے موقع پر جتنا نے کے لیے عاصمہ کو پہلے غصہ آیا پھر ہنسی۔ تینوں ہنسنے لگے۔



گاڑی گیٹ کے اندر داخل ہوئی۔ دونوں بچے پہلے گاڑی سے اترے۔ بشری انہیں احتیاط کی خیال رکھنے کی ہدایت کرتے ہوئے ان کے بعد

اتری۔ احسن کمال گاڑی بند کرتے ہوئے پچھلی ڈگی کھول کر شاٹنگ کا سامان نکال رہا تھا۔ بشری اس کے ساتھ کھڑی اس کی مدد کر رہی تھی۔

مثال اور سیفی اپنے کھلونے لینے کے لیے بے تاب کھڑے تھے۔

جب عدیل تیزی سے اندر آیا۔ گیٹ ابھی تک اوہ کھلا تھا۔ کسی کا دھیان ابھی اسے بند کرنے کی طرف نہیں تھا۔ وہ تیزی سے آنگے بڑھا اور

دوسرے لمحے اس سے پہلے کہ کوئی اس کی طرف متوجہ ہو یا دھیان دیتا وہ مثال کو گود میں بھر کر جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے باہر نکل گیا۔

لحہ بھر کو بشری اور احسن کمال ساکت رہ گئے۔

”مثال! دوسرے لمحے بشری کے منہ سے چیخ کی طرح نکلا۔ احسن کمال جیسے خواب سے چونکا۔

”یہ تمہارا آئی مین ایکس ہرینڈ۔“ وہ اس طرف اشارہ کر کے بولا جدھر ابھی عدیل گیا تھا۔

”مثال۔ مثال وہ لے گیا لیری مثال کو۔۔۔ لیری بیٹی۔۔۔ میری گڑیا۔“ وہ پانگلوں کی طرح دیوانہ وار گیٹ کی طرف بڑھی۔

عدیل گاڑی میں مثال کو لے کر بیٹھ چکا تھا۔ گاڑی ریورس ہوئی۔ دوسرے لمحے جیسے ہوا میں اڑتی تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔ بشری گیٹ کے باہر خالی ہاتھ کھڑی رہ گئی۔

عدیل کی گاڑی گیٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ بشری نے اندر آتے ہوئے سرسری نظر اس پر ڈالی تھی۔ مگر جانے کیوں وہ دھیان میں لا ہی نہ سکی تھی کہ یہ تو وہ گاڑی ہے جس میں وہ کئی سالوں سے بلا شرکت غیرے

انگلی سیٹ پر عدیل کے پہلو میں بیٹھ کر خوشی کے ست سے انمول لمحے بتا چکی ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گرم گرم لادے کی طرح پھوٹ رہے تھے احسن کمال نے اس کے کندھے پر آہستگی سے ہاتھ رکھا۔

”تم پریشان نہیں ہو بشری! ہم اسے لے آئیں گے۔“ وہ بہت کی طرح کھڑی آنسو بہاتی رہی۔

”وہ کسی بھی طرح مثال کو اپنے پاس رکھنے کا مجاز نہیں کہ چھوٹا بچہ ماں کے پاس ہی رہتا ہے۔ تم پریشان نہیں ہو میرا واقف ہے بہت بڑا ویل۔ میں ابھی اس سے بات کرتا ہوں۔“

”وہ نہیں دے گا۔ اسے میں جانتی ہوں۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”نہیں احسن! میرا خیال ہے عدیل اسے یہاں سے دور شہر سے باہر لے جا سکتا ہے۔ پلیز تم جلدی کرو گاڑی نکالو۔ میں اس کے پیچھے جاؤں گی اور اپنی بیٹی کو لے کر آؤں گی۔ پلیز جلدی کرو۔“ وہ اسے کھینچتے ہوئے اندر لے جانے لگی۔

احسن کمال اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر لے آیا۔

”پلیز گاڑی نکالو مجھے جانا ہے اس کے پیچھے۔“ وہ وحشت زدہ سی چیخ کر بولی۔ اسے لگا جیسے یکا یک اس کی دنیا اندھیر ہو گئی ہو۔ مثال تو اس کا سب کچھ تھی۔

”بشری! تم یقین رکھو وہ چاہے بھی تو اسے کہیں نہیں لے جا سکتا۔ شہر سے باہر کہاں لے کر جائے گا اور ملک سے باہر لے جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم ٹینشن نہیں لو۔“

”تمہاری بیٹی نہیں ہے وہ وہ تم سے اسے چھین کر نہیں لے گیا۔ اس لیے تم یہ سب کہہ رہے ہو۔“ وہ پانگلوں کی طرح چیختی تھی۔

”یاما یہ آوی کون تھا؟ وہ مثال کو کیوں لے گیا؟“ سیفی باپ کا ہاتھ ہلا کر پریشانی سے پوچھ رہا تھا۔

”تم اگر مجھے نہیں لے کر جا رہے تو میں خود چلی جاتی ہوں۔ ہٹو میرے راستے سے۔“ وہ اسے پرے دھکیل کر بولی۔

”بشری! پلیز بھڑائی ٹوانڈرا سینڈیار۔۔۔ اس کے پیچھے جا کر اس سے مثال کو چھینو گی تو وہ کیا ایسے تمہیں دے دے گا بچی کو۔ ابھی تم چلو میں بات کرتا ہوں پہلے معلوم کرتے ہیں وہ اسے کہاں لے کر گیا ہے پھر ہم اس کے پیچھے جائیں گے۔“ احسن کمال اسے سمجھا رہا تھا۔

ہاں چھین تو سکتی نہیں تھی وہ اسے اتنی سمجھ تو تھی بشری کو۔

”اگر وہ اسے کہیں اور لے گیا تو؟“ وہ اپنے آنسو کو شش کے باوجود ضبط نہیں کر پارہی تھی۔

”وہ ایسا کچھ نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔“

”احسن! میں جانتی ہوں اسے وہ ضد میں انتقام میں کچھ بھی کر سکتا ہے۔ صرف مجھے تکلیف پہنچانے کے لیے۔“ وہ پلھرتی جا رہی تھی۔

”میرا یقین تو ہے نا تمہیں۔۔۔ پلیز صرف تھوڑا سا چند گھنٹے تو انتظار کر سکتی ہوتاں۔۔۔ میں خود اسے تمہارے پاس لے کر آؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔“ وہ اس کا ہاتھ تمام کر نرمی سے بولا۔

بشری بے یقینی سے اسے دیکھتی جا رہی تھی۔

”صرف تھوڑا سا ویٹ کر لو۔ میں خود مثال کو لے کر آؤں گا اور تم یقین رکھو وہ صرف تمہارے پاس ہی رہے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

مہم خاص کیوں ہے :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹخ
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیگر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

گی۔ اس کے لہجے میں کچھ تھا کہ بشری کے آنسو تھم سے گئے اس کا دل ٹھہر سا گیا۔ اور جو پورے بدن میں بھونچال کی کیفیت تھی۔ اس میں ٹھہراؤ سا آیا۔

”کتنی دیر تک لے کر آؤ گے اسے۔“ وہ اب کے سہلے ہوئے لہجے میں بولی۔

”تم اندر تو چلو پھرتا تا ہوں تمہیں۔“ وہ اسے کندھے سے تھام کر اندر لے جانے لگا۔ سینٹی ان کے ساتھ تھا۔

ذکیہ یہ سب کچھ کھڑکی سے دیکھ رہی تھی۔ اور عدیل جیسے مثال کو لے کر گیا تھا۔ اتنے دنوں میں پہلی بار ذکیہ کے دل کو ڈھارس ہی ہوئی تھی۔ اب بشری جلد یا بدیر خواہ مثال کو حاصل کرنے کے خیال سے سہی احسن سے شادی کے لیے راضی ہو جائے گی۔

احسن نے آنے کے دو دن بعد ہی بشری کا ہاتھ ذکیہ سے مانگ لیا تھا۔ مگر ذکیہ کے ساتھ احسن کا بھی یہی خیال تھا کہ مثال کی وجہ سے بشری آسانی سے راضی نہیں ہوگی۔

اور جب تک مثال اس کے ساتھ رہے گی۔ وہ کبھی بھی اپنے نئے گھر کے بارے میں نہیں سوچے گی۔ دونوں کا خیال تھا اگر مثال درمیان سے نکل جائے تو ایسا ممکن ہے۔ مگر ایسا کرنا آسان نہیں تھا۔ بشری کبھی بھی بچی کو خود سے دور نہیں کرتی۔ مگر عدیل نے جیسے یہ ناممکن کام آسان کر دیا۔

وہ جو اتنے دنوں سے پریشان تھیں کہ بشری نے ابھی تک احسن کا پرنٹل قبول نہیں کیا اب انہیں امید ہو چلی تھی کہ جلد ہی ان کے دل کی مراد پوری ہونے والی ہے۔



عدیل تو عدیل نسیم مثال کو چوم چوم کر پیار کرتے ہوئے جیسے پاگل ہوتی جا رہی تھیں۔ بہت دنوں بعد انہیں لگا عدیل کی شادی کے بارے میں انہوں نے جو سوچ رکھا تھا۔ وہ اب پورا ہو جائے گا۔

”دیکھو۔ میں صاف کے دے رہی ہوں۔ عدیل! اب میں اپنی گڑیا کو کہیں بھی بھیجنے والی نہیں ہوں۔ یہ اب میرے پاس ہی رہے گی۔ اپنے باپا اور اپنی داد کے پاس۔ ہمیشہ۔ ہے نا مثال یہیں رہے گی تا میری گڑیا! وہ اسے جوش میں بونے بونے سے ساتھ لپٹاتی جاتیں۔

مثال سہمی ہوئی کبھی باپ کی طرف دیکھتی اور کبھی دادی کی نگاہ کو۔ نظریں جھکاتے وہ بار بار اس منظر کو سوچ رہی تھی جب عدیل اسے بشری سے چھین کر لایا تھا۔

”ای! میں مثال کو لے کر فی الحال اسلام آباد جا رہا ہوں کچھ دنوں کے لیے۔“ وہ کمرے میں آکر ایک دم سے بولا تو نسیم کے ساتھ مثال بھی خوف زدہ سی باپ کو دیکھنے لگی۔

پتا نہیں کیوں اسے یہ والے باپا اپنے پہلے والے باپا سے بہت مختلف بہت اجنبی سے لگ رہے تھے۔ وہ دل میں ان سے کچھ خوف زدہ سی تھی۔

”عدیل! یہ کیا کہہ رہا ہو بیٹے! اسلام آباد کیوں۔؟ کس لیے؟ وہاں کیا ہے اور میں کیا اکیلی رہوں گی یہاں نسیم ہری طرح سے بوکھلا گئیں اور ایک دم سوال پر سوال کرتی چلی گئیں۔

”ہی! کچھ دنوں کے لیے جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے بعد میں مستقل وہاں رہ جاؤں۔“ وہ اسی کھوہرین سے بولا جو اب اس کا تیرہ دنہا جا رہا تھا۔ نسیم کو تو یوں لگا جیسے کوئی ہماڑ کسی نے ان کے سر پر گر دیا ہو۔

”کیا۔ کتنا چاہتا ہے تو۔ ہمیشہ کے لیے وہاں۔ اکیس۔ کیوں۔ یہ کس لیے؟“ نسیم کو سب کچھ بھول گیا۔

ہاتھ پیر پھول گئے۔
 ”جب وہاں مستقل رہنے کا ارادہ کر لیا، گھر لے لیا، تو آپ کو بھی بلا لوں گا۔ لے جاؤں گا ساتھ۔“ وہ اسی اجنبی
 پن سے بولا۔ اس نے تھوڑی سی دیر میں اپنا اور مثال کا مختصر سامان ایک سوٹ کیس میں رکھ بھی لیا تھا۔
 ”عدیل! نسیم کی آنکھیں صدمے سے جیسے پھٹنے کو تھیں۔“

”تو میں اتنے دن یہاں اکیلی۔۔۔ یوں ہی بے یار و مددگار۔ عدیل تو سمجھ نہیں رہا۔ میں کیسے رہ سکتی ہوں
 اکیلی۔“

انہیں تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، بے ربطگی سے بول رہی تھیں۔
 ”یہ! یہ! آپ کی چوائس تھی کہ آپ کے گھر میں کوئی بھی دوسرا بندہ دخل دینے والا نہ ہو۔ آپ اکیلی اس
 بادشاہت کو چلائیں، سو آپ کو موقع مل رہا ہے۔“

وہ کیا بول رہا تھا۔ نسیم کو بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔
 وہ بس آنکھیں پھاڑے بے بس بیٹھی اسے دیکھے جارہی تھیں۔

”چلو مثال!“ وہ مثال کا ہاتھ تھام کر دوسرے ہاتھ میں سوٹ کیس کی اسٹریپ پکڑے جانے کو تیار تھا۔
 نسیم کا جیسے ہارٹ فل ہونے کو تھا۔ وہ بمشکل خود کو اپنے بھاری جسم کو سنبھالتی اٹھنے لگیں۔

”مے رکو۔۔۔ شہ۔ عدیل! یہ کیا کر رہا ہے۔ میں کیوں ایسا چاہوں گی۔ میں اکیلی یہاں، اس پورے گھر میں کیا
 کروں گی۔ میں نے نہیں رہنا، جہاں جدھر جا رہے ہو مجھے بھی ساتھ لے کر جاؤ۔“

وہ بچوں کی طرح اس کا ہاتھ پکڑ کر بے اختیار رونے لگی تھی۔ عدیل کے قدم جیسے کسی نے جکڑ لیے۔
 ”اے! بس آپ کو ساتھ نہیں لے جا سکتا۔“ اتنی دیر میں وہ پہلی بار قدرے نرم لہجے میں بولا تھا۔

”مم۔ میں چلی جاؤں گی۔ وہاں اسلام آباد میں میری پھوپھی کی بیٹی۔ یاد نہیں تھے خالہ شاہدہ رہتی ہیں، میں
 اس کے پاس چلی جاؤں گی۔ دو چار دن۔ جتنے دن مجھے رکنا ہو گا۔ میں بھی وہاں رک جاؤں گی۔ مجھے ساتھ لے کر
 جانا، عدیل! میں یہاں نہیں رہ سکتی۔“

نسیم نے مضبوطی سے عدیل کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے۔ وہ بے بس سا ہو گیا تھا۔
 ”بیا۔ مجھے ماما کے پاس جانا ہے۔ مجھے آپ کے ساتھ نہیں جانا۔“ مثال نے عدیل سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے
 کہا تو وہ شاکڈ سال سے دیکھنے لگا۔

”اے! ہم پہلے بھی تو میوشن پر ہاتھ تھے نا، دونوں مل کر۔ اب یہ سپرزا طریقے سے ہو جائے گا۔“

واٹن ماں کی جھجک اس کا خوف دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے تسلی دے رہا تھا۔
 ”وہ اور بات تھی بیٹا۔ تین چار بچے چھوٹی کلاسوں کے اور بس۔ یہ تو دوس سے بند رہنے کے ساتوں، آٹھویں
 کے بھی۔ انہیں پنڈیل کرنا۔ پھر۔ ان کے اچھے رزلٹ کی ذمہ داری۔ لیٹا تجھے واقعی بہت مشکل لگ رہا
 ہے۔“ وہ گھبرائی ہوئی تھی۔

جب بھی کوئی نئی مشکل اس پر آتی تھی وہ ایسے ہی گھبر جاتی تھی۔
 ”کچھ دن تھوڑی پریشانی ہوگی، پھر سب ٹھیک ہو جائے گا اور ماما! میرے خیال میں اوٹ پانگ لوگوں کو گھر
 کرائے پر دینے سے بہتر ہے کہ ہم خود اس کو استعمال کریں اور آپ بھی جب کبھی گھر سے نکلیں گی تو کیا یہ
 زیادہ بہتر نہیں۔“

”واٹن! یہ سب بچوں والی باتیں ہیں۔ اول تو مجھے امید نہیں اتنے زیادہ بچے آسکیں گے کہ ہم پورے گھر کا
 خرچ چلا سکیں۔ دوسرے۔“ باہر تھنسی جی تو وہ بولتے ہوئے رک گئی۔
 واٹن دروازہ کھولنے چل دیا۔

سعدیہ تین لڑکیوں کو لے کر اندر آ رہی تھی۔
 اس کے چہرے پر جوش سا تھا اور کچھ کروکھانے کا جذبہ۔

”کپا! آپ کی تین شاگردیں تو سمجھیں آگئیں۔“ وہ اندر آ کر بولی۔ واٹن نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ماں کا
 حوصلہ بڑھایا۔

”چلو ٹھیک ہے، تم دونوں اوپر چلو۔ میں نے کمرے صاف کر کے بیٹھنے کا انتظام کر لیا ہے۔ میں ان تینوں کو لے
 کر آتی ہوں تو پھر دیکھتے ہیں کیا کرتا ہے۔“

وہ ایک بار پھر سنبھل چکی تھی کہ اسے اب اس مشکل کا مقابلہ کرنا ہے۔ اگر گھر بیٹھے اس کے بچوں کے رزق کا
 انتظام اللہ کر رہا تھا تو اسے بھرپور کوشش کرنا ہوگی۔ دو دن سے وہ سوچ سوچ کر پریشان تھی۔ اب ایک دم سے لگا یہ
 تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔

ہاتھ نے پچیس ہزار کی رقم اسے بھجوائی تھی۔ اس سے مہینہ آرام سے گزر سکتا تھا۔
 اور جو سعدیہ کی تجویز تھی کہ عاصمہ کو آگے اتر کے بعد اپنی پڑھائی کو پھر سے شروع کرنا چاہیے، پہلے تو وہ
 شرمیلی گھبرائی اور خوب پریشان ہوئی تھی کہ اس عمر میں بچوں کی طرح پھر سے پڑھنا عجیب سی بات تھی۔

مگر پھر آہستہ آہستہ بچوں کو پڑھاتے سمجھاتے اس کا دل اس بات کو بھی مان گیا۔
 علم حاصل کرنے کی کوئی عمر نہیں ہوتی، وقت کی قید نہیں ہوتی، شوق اور ضرورت انسان کو کسی بھی وقت اس
 سیر می پر پھر چڑھنے کی طرف راغب کر سکتا ہے۔

سعدیہ نے اسے اپنی گریجویشن کی بکس لادی تھیں، وہ اب اکثر رات میں ان کو پڑھنے کی کوشش کرتی۔ اسے
 ابھی اپنے لیے مضامین کا انتخاب بھی کرنا تھا۔

سعدیہ اچھی لڑکی تھی، پھردو کار بھی۔ اس کے بہتر رویے نے عاصمہ کے لیے بہت سی آسانی پیدا کر دی تھی۔
 کچھ بچے جو اسکول نہیں جاتے تھے کسی وجہ سے وہ صبح میں بھی عاصمہ کے پاس پڑھنے کے لیے آنے لگے۔

اس کے گھر میں اب ایک پڑھائی والا ماحول سا بننا جا رہا تھا۔ جس میں وقت ملنے پر وہ بھی اپنی کتابیں لے کر بیٹھ
 جاتی۔

الیاس کو اس نے فی الحال منع کر دیا تھا کہ ابھی اسے گھر کرائے پر نہیں دینا، وہ یہ تجربہ بھی کر کے دیکھنا چاہتی
 تھی۔

اور ابھی تک اسے بہت اچھا نتیجہ ملا تھا۔
 گھر کا خرچ تھوڑا تنگی سے مگر ہو رہا تھا، پھر اتنی مصروفیت اسے الٹی سیدھی سوچوں سے بچانے لگی۔

اس کی تمام تر توجہ بچوں کی اپنی پڑھائی کی طرف تھی۔
 سعدیہ بڑی لڑکیوں اور بچوں کو پڑھاتی۔ عاصمہ، چھوٹی کلاسز کو اور بڑی کلاسز کے آسان مضامین کو۔ رفتہ رفتہ
 اسے پڑھانے کا، سمجھانے کا سلیقہ آ گیا اور بہت سی مشکلیں آسان ہوتی چلی گئیں۔ صرف محنت زیادہ تھی جس کی
 وہ عادی تھی۔

گھر بیٹھے عزت کے ساتھ روزی حاصل کرنے کا یہ طریقہ اسے بہت اچھا لگا تھا۔ وہ بہت محفوظ اور پرسکون
 محسوس کرنے لگی تھی خود کو۔ چند ہی دنوں میں جیسے بہت کچھ بدل سا گیا۔

عاصمہ بہت میتوں کے بعد گھر اور بچوں کے ساتھ خوش تھی اور اب بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے بہت پر امید تھی۔

پھر عدیل، مثال کو سمجھا سمجھا کر تھک گیا مگر وہ دتے ہوئے ایک سی ضد کیے جا رہی تھی کہ اسے بشری کپاس جانا ہے۔

عدیل اس کی بات سنانے ہوئے جیسے ہار سا گیا۔
”تھیک ہے میں تمہیں تمہاری ماں کے پاس چھوڑ آؤں گا مگر پھر تم کبھی مجھ سے نہیں ملو گی۔“ عدیل کی کڑی شرط نے مثال کے معصوم دل کو ہلا کر رکھ دیا۔

وہ پریشان سی باب کو دیکھے گی۔
”تاتا۔ میں آپ کو بھی نہیں چھوڑ سکتی۔ آپ کے ساتھ بھی رہنا ہے مجھے۔“ پتا نہیں کہاں سے اس کے اندر بہت آگئی۔ وہ باب کا ہاتھ پکڑ کر رے ہوئے لہجے میں بولی۔

عدیل اسے دیکھا رہ گیا۔
اسے اس مسئلے کا کوئی حل نہیں سوچ رہا تھا۔
”میں تمہارے کھانے کے لیے کچھ لاتا ہوں۔ تم بیٹھو۔“ وہ تھکے ہوئے انداز میں کہہ کر باہر نکل گیا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ وہ بھونچکی سی احسن کمال کی شکل دیکھ کر رہ گئی۔ ذکیہ یوں کرے میں بیٹھی تھیں جیسے وہاں موجود ہی نہیں۔

”اس کے بغیر بشری میرے لیے کوئی بھی قدم اٹھانا ممکن نہیں۔“ وہ بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔
”اس طرح تو عدیل کو اور موقع مل جائے گا یہ کہنے کا کہ اب میں مثال کی بالکل بھی دیکھ بھال نہیں کر سکتی۔“ وہ روہا سی ہو کر بولی۔

”صرف تم عدیل کا کیوں سوچ رہی ہو بشری! تم مثال کا سوچو اس کو حاصل کرنے کا یہی ایک راستہ ہے۔“ ذکیہ جیسے اس کی دل چوٹی کرتے ہوئے بولیں۔
بشری بے بسی سے ماں کو دیکھ کر رہ گئی۔

اسے یہ تو معلوم تھا کہ یہ اس کی ماں کی بھی مرضی ہے۔ مگر وہ اس طرح یہ سب پورا کرنا چاہیں گی اسے یہ امید نہیں تھی۔

”جتنا سوچو گی اتنا بھونکی۔“ احسن نے نرمی سے کہا۔
”ہاں تو اور کیا وہ سمجھتا ہے یہ تنہا اکلی ہے کمزور ہے کچھ کر نہیں سکتی وہ مرد ہے طاقت ور ہے سب کچھ کر سکتا ہے جب اسے پتا چلے گا کہ اس کے ساتھ بھی کوئی کھڑا ہونے والا ہے کوئی سارا کوئی مضبوط آسرا ہے تو دیکھنا اس کی ساری اکڑ ساری شیخی جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گی۔“ ذکیہ اسے دلیلوں سے قائل کر رہی تھیں۔

”میں! وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پارہی تھی۔“
”بشری! تم اتنی پریشان ہو تو سوچو مثال کتنی سہمی ہوئی ہو گی۔ اس نے اس کی کمزوری پر ہاتھ رکھا۔
”وہ معصوم تم دونوں کے جھگڑوں کو کیا سمجھے گی مگر وہ تمہاری محبت کو سمجھتی ہے۔ اسے اپنے مضبوط ساتھ کا یقین دہیے تب ہی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ جانے والے انداز میں ممکن سے آگے خاموش ہو گیا۔ کرے میں لہ

بھر کو خاموشی سی ہو گئی۔
”مگر اس کے بعد بھی عدیل نے مجھے میری بیٹی واپس نہیں کی تو؟“ بشری کچھ دیر بعد بولی۔ ”جبکہ میں ابھی بالکل بھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔“

”تم کتنا چاہتی ہو گی کہ اس طرح نکاح کر کے تم پھنس جاؤ گی۔ اگر تمہیں بعد میں عدیل نے پتی واپس نہیں کی تو؟“ احسن نے کچھ چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔
”بشری کچھ شرمندہ سی ہو گئی کیونکہ اس کا مطلب یہی تھا۔

”تم فکر نہیں کرو پھر۔ ہم یوں ہی نکاح اٹاؤ اس کر دیتے ہیں۔ جھوٹ موٹ اور مثال کو حاصل کرنے کے بعد۔“

”ہرگز نہیں۔ میں اس کی اجازت نہیں دوں گی۔ خدا نخواستہ نکاح مذہب کوئی کھیل تو نہیں۔“ ذکیہ کو لگا اگر یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو پھر بشری کو نکیل ڈالنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جائے گا۔ احسن نے ذکیہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”نکاح ہو گا ابھی اور اسی وقت ہو گا ورنہ پھر کبھی نہیں اس لڑکی کا لیا ہے اسے تو اپنے برے بھلے کی کچھ تمیز نہیں۔“ ذکیہ خم ٹھونک کر بولیں۔
”میں۔ میں ابھی ایسا کچھ نہیں سوچ رہی پلیز۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تقام کر بولی۔

ذکیہ کا بٹی چاہا اسے دو تین لگائیں۔
”تھیک ہے سچی بات اسے مجبور نہیں کریں اور نکاح جیسے معاملے کو کسی بلیک میلنگ کے تحت ہماری زندگی میں شامل نہیں ہونا چاہیے۔“ احسن کمال نے اسے ایک بار پھر حیران کر دیا۔

وہ اتنا بد ہوا اتنا متحمل مزاج کب سے ہو گیا۔ اسے سخت حیرت سی ہوئی تھی۔
”بلیک میلنگ اللہ نہ کرے کیوں کریں گے ہم۔ سیدھی بات ہے اسے سچی چاہیے تو اس کے لیے یہاں بیٹیل رہے ہیں اگر یہ نہیں چاہتی تو اور بھی اچھی بات ہے وہ بھی اس کا باب ہے خدا نخواستہ کوئی دشمن تو نہیں بھلے اس کے پاس وہ رہتی رہے کچھ نہیں ہو گا بلکہ اچھا ہے دودھڑوں میں تقسیم ہونے کے بجائے وہ ایک گھر میں رہ جائے۔“ ذکیہ نے جیسے معاملہ ہی آر پار کر دیا۔

احسن سر ہلا کر رہ گیا۔ بشری انگیک سی تھی۔
یہ تو وہ کبھی بھی نہیں چاہتی تھی کہ مثال ہمیشہ کے لیے عدیل کے پاس رہ جائے چاہیے وہ اس کا کتنا ہی خیال کیوں نہ رکھنے کا وعدہ کرے۔ اندر ہی اندر اس کی بھی یہی ضد تھی کہ اسے بھی عدیل کو یہ خوشی نہیں دینی جس طرح سے وہ ناخوش ہے عدیل نے اسے جیسے دھوکا دیا۔ ساری دنیا میں تماشا بنایا۔ وہ بھی اب اس کا بدلہ لے لے گی۔ کبھی اسے خوش نہیں ہونے دے گی۔

”چچی جان! میں کل اپنے گھر میں شفٹ ہو جاؤں گا سیفی کولے کر۔ اب اتنے دن ہو گئے یہاں رہتے ہوئے آپ لوگوں کو بہت تکلیف دی میں نے۔“ وہ ذکیہ سے کہہ رہا تھا۔
”بچے! بیڑا ہٹا گھر سے تو نے نہیں کیا تکلیف دتا تھی بلکہ تیرے آنے سے تو جی ایسا خوش ہوا تیری ماں زندہ ہوتی تو کیسا نہال ہوتی۔“ ذکیہ آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے بولیں۔

”بشری! تم فکر نہیں کرو میں نے اپنے دوست سے بات کی ہے اور کل صبح ہم دونوں کی میٹنگ ہے اس کے ساتھ۔ اس نے امید تو دلائی ہے اور پتی تمہیں ہی ملے گی اور بہت جلد۔ اس میں زیادہ ٹائم نہیں لگے گا۔ یوں بھی میرے خیال میں مثال تمہارے ساتھ زیادہ الٹیج ہے۔ اگر کوئی مرحلہ ایسا آیا پتی کی رائے پوچھنے کا تو وہ یقیناً“

تہمارے ساتھ رہنا چاہیے گی۔
 وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔ بشری کا جی پھر آیا۔ وہ کیا اس کا ہمدرد تھا اور وہ اس کی ایک بات بھی نہیں مان رہی تھی۔ کوئی خوشی بھی اسے نہیں دے رہی تھی۔
 وہ توجہ سے آیا تھا مسلسل اس کی بول چالی اس کی تسلی کے بندوبست میں لگا تھا۔
 اور پھر کل یہ چلا جائے گا۔ اس عالی شان گھر میں جسے دیکھتے ہی خوابوں میں کھوجانے کوئی چاہتا ہے۔
 اور ہو سکتا ہے اسے چند ہی دنوں میں کوئی اور بھی پسند آجائے اور یہ جس طرح فیصلے کرنے کا عادی ہے اگلے ہفتے ہی ہاتھ میں شادی کا کارڈ لیے ہوئے آجائے۔
 اس کے بچے کو اس کے گھر کو تو ایک عورت کی ضرورت ہے اور میں اکیلی کب تک اور کہاں تک عدیل کے ساتھ مثال کی کسٹڈی کی جنگ لڑوں گی۔
 وہ زمانے بھر کا گھٹیا انسان۔ اگر اسے مجھ سے ذرا بھی محبت ذرا بھی خیال ہوتا میرے دکھ کا احساس کر کے وہ خود ہی مثال کو مجھے دے دیتا مگر وہ تو اسے مجھ سے بددردی سے چھین کر لے گیا اور میں اس کی خاطر کب تک اچھی زندگی سے منہ موڑتی رہوں۔ لمحوں میں وہ وہاں بیٹھے بشری نے بہت سے حساب کتاب لگائے۔
 پچی جان! میں اب سونے کے لیے جا رہا ہوں۔ صبح مجھے جلدی اٹھنا ہے۔ ظاہر ہے گھر شفٹ کرنا آسان نہیں۔ وہ جانے کے لیے کھڑا تھا۔

۲۱ حسن۔ ”وہ ایک دم سے کھڑی ہو گئی۔
 دونوں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔
 ۲۲ میں ابھی۔ ابھی نکاح کے لیے راضی ہوں احسن کے ساتھ۔ کیونکہ میں مثال کے بغیر نہیں رہ سکتی۔
 اس کے بغیر زندگی بے معنی ہے میرے لیے۔
 کہتے کہتے وہ بے اختیار آگے بڑھ کر اس کے گلے لگ کر رونے لگی۔
 ”میری بچی! میری بشری! اللہ تیری جھولی خوشیوں اور میٹھی مرادوں سے بھرے تیری گود ہمیشہ آباد رہے تیری بچی کے دم سے۔“ ذکیہ پر تو جیسے شادی مرگ طاری ہونے لگا۔
 ”اور وہ معصوم سائیلی اسے مل جائے گی۔ مثال کو باپ کا پیار مل جائے گا۔ تیری اس اجڑی اور دکھنی زندگی میں اللہ کے فضل سے پھر ہمارا آجائے گی۔ اللہ میری دعا میں اس طرح سنے گا مجھے لیکن نہیں تھا وہ بڑا مہربان ہے۔“

وہ بشری کو ساتھ لگا کر کہنے لگیں۔
 احسن کمال نے طمانیت بھرا گہرا سانس لے کر بشری کی طرف دیکھا۔ اس کی اتنے دنوں کی محنت رائیگاں نہیں گئی تھی۔
 ۲۳ حسن بیٹا! عمران کو بلاؤ میرے خیال میں سادگی سے ابھی نکاح کر دیتے ہیں پھر تم دونوں اکٹھے وکیل سے ملنا۔ میاں بیوی کی حیثیت سے دیکھنا کیسے وہ عدیل بھگیلی بنتا ہے پھر۔“ ذکیہ کے دل کی کلی کھل اٹھی تھی۔

”بیٹا۔ ماما۔ شادی کر رہی ہیں۔ احسن انکل سے سوہ اچھے ہیں۔ بہت مگر پاپا اب تو نہیں۔“
 مثال باپ کے چہرے پر اپنے ننھے ننھے ہاتھ پھیرتے ہوئے آنکھوں میں نمی لیے سونے سے پہلے کہہ رہی تھی۔

”کاش میں اپنی بیٹی کو اس امتحان میں کبھی نہ ڈالتا۔“ وہ رونا چاہتا تھا۔ مثال کو تسلی دینا چاہتا تھا کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ مگر وہ کچھ بول ہی نہیں سکا۔ بس مگر مگر مثال کو دیکھا رہا۔
 ”بیٹا! کیا وہ دوسری شادی کر لیں گی۔ پھر میں کہاں جاؤں گی؟“ وہ نیند سے پہلے معصومانہ لہجے میں سوال کر رہی تھی اور آج عدیل کے پاس اس کے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ ایسا ہر حق خود کھو چکا تھا۔ جس سے وہ بشری کو ایسا کوئی بھی قدم اٹھانے سے روکے، جس سے مثال کی نفسیات پر اس کی ذات پر اتنے برے اثرات پڑیں۔
 ”بیٹا۔ آپ ماما سے پھر شادی کر لیں۔ ہم سب پھر ایک ساتھ رہنے لگیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا؟“ اس کا معصوم ذہن بھی حل نکال سکا تھا۔
 عدیل پھر بھی کچھ نہیں کہہ سکا، بس دیکھا رہا۔ مثال جیسے اپنے ہی سوالوں کی بازگشت سنتے سنتے تھک گئی۔ اس نے پلکیں موند لیں اور ذرا دیر میں بچپن کی معصوم نیند اس پر طاری ہو گئی۔
 عدیل اس کے پاس گم صم سا بیٹھا رہا۔
 وہ تو دن بھر یہی سوچتا رہا تھا کہ وہ مثال کو بشری سے چھین لے گا تو وہ ایک بار پھر برباد ہو جائے گی۔ تباہ ہو جائے گی۔ اسے خوب مزہ ملے گا عدیل سے علیحدگی کا۔ مگر اس نے تو ایک بار بھی نہ تو فون کیا نہ مثال کو لینے آئی۔
 ”کیا میں نے مثال کو کہاں لاکر اس کے دل کی مراد پوری کر دی؟ کیا وہ یہی چاہتی تھی؟“ اس کا دل غ جیسے اس سوال کو سوچتے ہوئے ٹھنک سا گیا۔
 ”وہ دوسری شادی کر رہی ہے اسے اب مثال کی کیا پروا؟ وہ نئی زندگی میں اسے تو ایک پال ہی سمجھے گی نا۔ میں نے مثال کو کہاں لاکر اس کے دل کی خوشی پوری کر دی۔ یہ خیال اور بھی سکون برباد کر دینے والا تھا۔“

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

میرے خواب لوٹا دو	کسی راستے کی تلاش میں	شریک سفر	ساری بھول ہماری تھی
تہمت عبداللہ	میمونہ خورشیدی	زہرہ ممتاز	راحت جبین
قیمت 400 روپے	قیمت 350 روپے	قیمت 550 روپے	قیمت 300 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

ماہانہ شعاع مارچ 2014 237

اس کا تکی چاہا بھی اور اسی وقت مثال کو اٹھا کر وہیں چھوڑ آئے جہاں سے لے کر آیا تھا۔
اور بشری بھی دو سری شادی کی خواہش پوری نہ کر سکے وہ مٹھیاں بھیچے کرے میں ٹھل رہا تھا۔

سادگی سے دو گھنٹے کے اندر دونوں کا نکاح ہو گیا۔ بشری نے جو سوچا نہیں تھا وہ لمحوں میں ہو گیا۔
وہ اس نے تو یہی سوچا تھا کہ زندگی بھر وہ عدیل کے سوا کسی اور کا نہیں سوچے گی۔
مگر اب نکاح کے پیر زپر دستخط کرتے ہی اسے لگا جیسے وہ ہمیشہ سے صرف احسن کمال کی تھی۔ عدیل تو یوں ہی
دونوں کے درمیان آیا تھا۔

یہ بیچ کے آٹھ سال تو یوں ہی بیچ میں آگئے تھے پورے وہ دونوں تو شروع سے ایک تھے۔
احسن کمال کے چہرے یہ اسے دیکھ کر خوشی بھی تھی اور اطمینان بھی۔

ذکیہ کو تو جیسے دو جمانوں کے خزانے مل گئے تھے۔
اتنا بڑا ہاڑ جو انہوں نے سوچا تھا کہ ان کے سینے پر آپڑا ہے اب کبھی نہیں اترے گا اتنی آسانی سے سب
ہو گیا۔ بشری کو گلے لگائے ہمار کر رہی تھیں۔
عمران بھی خوش تھا کہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ تھا یہ جو حل ہو گیا۔ اب اس کی اپنی شادی کی راہ میں
کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔
اور احسن کمال کو لگ رہا تھا وہ جس مقصد کے لیے پاکستان آیا تھا وہ مقصد بھر حال پورا ہو گیا۔

”پاپا! کیا آپ مجھے اسلام آباد لے کر جا رہے ہیں۔“ مثال باپ کی مسلسل خاموشی سے کچھ سمی ہوئی تھی۔
خاموشی سے مثال کے اور اپنے کپڑے تیار ہونے کے لیے نکال چکا تھا۔ خود تیار ہو چکا تھا مثال کی مدد کر رہا تھا۔

”پاپا! تائیں نا؟“ وہ اس کی چیمہ پھر بولی۔
”ہیں۔“ اسے کہنا پڑا۔ مثال کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ الجھے ہوئے بالوں کو بمشکل سلجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔
”یہ ماما سلجھاتی ہیں اور پونی ہٹاتی ہیں۔ مگر یہ مجھ سے نہیں ہو رہے۔“ اس نے تھک کر ریش بند پر پھینک دیا۔
”اوکے۔ بال ایسے ہی رہنے دو پونی نہیں ہٹاؤ ہینر بند لگا لو۔“ عدیل نے اسی سنجیدگی کے ساتھ اسے ہنسر
کہہ جو پکڑا دیا۔

اور خود بیٹھ کر جوتے پہننے لگا۔

”تو ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ وہ پھر اسی سوال سے الجھتے ہوئے بولی۔

”تم کہاں جانا چاہتی ہو؟“ عدیل نے سراٹھائے بغیر پوچھا۔

مثال اندازہ نہیں کر سکی کہ عدیل نے کس موڈ میں پوچھا ہے۔ وہ جو جواب دینا چاہتی ہے اسے سن کر پاپا کو
غصہ آجائے گا یا نہیں وہ خاموش رہی۔ آہستگی سے وہ باپ کے پاس آکر کھڑی ہوئی اور اس کے سراٹھانے کا
انتظار کرنے لگی۔

”پاپا! وہ باپ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولے سے بولی۔ عدیل نے آہستگی سے اسے اٹھا کر گود میں بھر لیا۔
عدیل کے چہرے پر خوف ناک سی سنجیدگی تھی۔ مثال کو خوف بھی آ رہا تھا مگر ترس بھی اس کے پاپا کو کمزور
ہو گئے تھے۔

بہلے کتنا جانتے تھے مسکراتے تھے اور اب تو اس نے انہیں کبھی ذرا سا بھی خوش ہوتے نہیں دیکھا۔
لیکن ماما تو احسن انکل کے ساتھ ہنستی بھی ہیں، ہنسا پنگ بھی کرتی ہیں، انجوائے بھی کرتی ہیں۔ اور پاپا۔۔۔ بے
چارے۔ اسے باپ کی شکل دیکھ کر رونا آ رہا تھا۔

”نہیں۔ میرے پاپا بے چارے نہیں ہو سکتے۔“ اسے اپنی سوچ پر خود ہی غصہ آ گیا۔

”پاپا! ایک بات بولوں۔ آپ غصہ تو نہیں کریں گے۔“ وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

”ہیں میری جان! آپ جانتی ہو پاپا آپ کی بات پر غصہ نہیں ہوتے۔“ وہ اسے پیار کر کے بولا۔

”ہیں۔ اس بات پر غصہ ہو سکتے ہیں۔“

”مثال! کیا بات ہے جتاؤ مجھے۔“

”ہم ابھی تیار ہو کر کہاں جا رہے ہیں؟“ شاید وہ بات کہنے کے لیے اسے کچھ اور وقت درکار تھا۔

”تمہاری ماما کے پاس۔“ عدیل نے سنجیدگی سے کہا۔ مثال بے یقینی سے باپ کی طرف دیکھنے لگی۔

”واقعی پاپا!۔۔۔ ماما کے پاس جا رہے ہیں۔“

”صرف تم۔ تمہیں میں وہاں چھوڑنے جا رہا ہوں۔“ وہ تھیح کرتے ہوئے بولا۔ مثال کا چہرہ اتر سا گیا۔

”جی۔ میں جانتی ہوں۔“ وہ آہستگی سے کہہ کر گود سے اتر آئی۔

”میری بیٹی کون سی بات کہنے والی تھی ابھی۔“ عدیل کو یاد آیا۔ مثال خاموش اسے دیکھنے لگی۔

”جان! میں نہیں ناراض ہوں گا۔ نہیں ڈانٹوں گا پر اس“ آپ بولو کچھ چاہیے پیسے کھلوانے یا کچھ بھی۔“ وہ

پیارے بولا۔

”کچھ بھی نہیں پاپا۔ ان میں سے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”تو پھر؟“

”پاپا!۔۔۔ آپ بہت اچھے ہیں بہت اچھے۔“ وہ باپ کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر بولی۔ یہ اس کی مخصوص عادت تھی،
جب باپ پر بہت پیار آتا تھا تو وہ ایسے ہی کرتی تھی۔

”اوکے۔ اب بول دیجئے۔ یہ سب کیوں کہا جا رہا ہے۔“ وہ اسے چوم کر بولا۔

”پاپا! آپ ہنسا کریں ماما کی طرح۔ وہ بھی احسن انکل کے ساتھ خوش رہتی ہیں۔ آپ۔۔۔ بھی آپ بھی شادی

کر لیں۔“ کہہ کر وہ ڈرے ہوئے انداز میں باپ کو دیکھنے لگی۔ عدیل اسے دیکھا رہ گیا۔

بشری خوب صورت ساڑھی، میچنگ جیولری اور میک اپ کے ساتھ تیار حلیے میں احسن کمال کے ساتھ
گاڑی میں بیٹھ رہی تھی، جب کلمے گیٹ سے مثال دوڑتی ہوئی اندر آئی اور اس سے گپٹ گئی۔ بشری نے گیٹ پر
کھڑے عدیل کو دیکھا، جو یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

لکھنؤ

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشری ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشری کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی نوبی ہے۔ بشری اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصالحتی بیٹا بہو سے لگاؤ رکھتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشری کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ سائچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشری کی سند فوزیہ کا بالا خراک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشری دو لہنا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشری کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر مات نند بن سکی تھی۔ نکاح والے دن زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشری اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کرتا ہے۔ بشری اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشری کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹ اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہیں۔ عاصمہ کو فون کے ذریعے کوئی اطلاع ملتی ہے جسے سن کر وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔

فون پر پتا چلتا ہے کہ شہر آتے ہوئے عفان اور فاروق صاحب ذکیہ کی واردات میں قتل ہو گئے۔ عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹ سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔



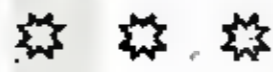
وہ اسے ساتھ لگائے تھکتے ہوئے تسلی دے رہا تھا۔
 ”میرا سیل نمبر ہے نا آپ کے پاس۔ آپ کو جب بھی جس چیز کی ضرورت ہو، کوئی پریشانی ہو، کچھ چاہیے ہو،
 آپ مجھے فوراً فون کیجئے گا۔ آپ کے پایا دوڑے چلے آئیں گے آپ کے پاس پرائمز۔“ اسے سامنے کرتے
 ہوئے وہ نم آنکھوں کے ساتھ مسکرا کر بولا۔
 ”پاپا۔“ وہ باپ کو نظریں جمائے دیکھے جارہی تھی۔
 ”جی پاپا کی جان!“ وہ فریفتہ ہونے والے انداز میں بولا۔
 ”پاپا! میری شجر کتنی ہیں وقت کبھی ایک جیسا نہیں رہتا، ہمیشہ بدلتا رہتا ہے، ایسا ہی ہے پاپا؟“
 ”ہاں میری جان۔“ وہ سر ہلا کر بولا۔

”اور یہ وقت ہمیں بھی بدل جاتا ہے پاپا۔“ وہ پھر سے بڑے سن سے بولی۔
 ”آپ کیا کہنا چاہتی ہو میری گڑیا؟“ وہ اس کی بات کچھ تو سمجھ گیا تھا اور کچھ سمجھتے ہوئے بھی سمجھنا نہیں چاہتا
 تھا۔

”پاپا! ایک وعدہ کیجئے۔“ وہ عدیل کو ایک دم سے اپنی عمر سے بہت بڑی لگنے لگی تھی۔ وہ کچھ ڈر سا گیا۔
 ”آپ ہمیشہ اپنا والہا فون نمبر ہی رکھیے گا۔ کبھی اسے بدلے گا نہیں پاپا۔“
 ”مثلاً۔ میری گڑیا!“

”معلوم نہیں پاپا! مجھے کب آپ کی ضرورت پڑ جائے اور آپ نے اپنا نمبر چیخ کر لیا ہے۔ اور آپ مجھے انفارم
 کرنا بھی بھول چکے ہوں تو۔ پھر میں کیسے آپ کو بلاؤں گی؟“ اس کے لہجے میں اس کے لفظوں میں کون سا دکھ
 نہیں رہا تھا۔ عدیل کا دل جیسے بھٹ سا گیا۔
 ”نہیں میری پیاری بیٹی! میں کبھی اپنا نمبر چیخ نہیں کروں گا۔ تمہیں بتانے بغیر تو بالکل بھی نہیں۔“ وہ اسے
 اپنے ساتھ لپٹا کر روہی پڑا۔
 ”اور پاپا! ہماری مس کتنی ہیں شوگ جیسے جیسے اولڈ ہوتے جاتے ہیں۔ وہ باتوں کو چیزوں کو لوگوں کو اور اپنے
 وعدوں کو جلدی جلدی بھولنے لگتے ہیں۔“

is it True Papa? (کیا یہ سچ ہے پاپا؟) وہ بالکل بھی نہیں رو رہی تھی۔
 باب کے گلے سے الگ ہو کر بڑی خوف ناک سنجیدگی سے کہہ رہی تھی اور عدیل کو لگا۔ وہ اب اس کے کسی
 سوال کا بھی جواب نہیں دے پائے گا۔ وہ لا جواب ہو گیا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کے سامنے لا جواب ہو گیا تھا۔ اپنی چھوٹی
 سی کم سن بیٹی کے سامنے۔
 وہ تیزی سے اسے چھوڑ کر بھاگتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ مثال خشک آنکھوں سے وہ جاتے اور ایک ہیولہ بننے
 باپ کو پلکیں جھپکائے بغیر دور تک دیکھتی چلی گئی۔



صبح سے شام ہو گئی، واٹن گھر نہیں آیا تھا۔
 عاصمہ، تین بار بار ہر جا کر اسے پانکوں کی طرح ڈھونڈ چکی تھی مگر اس کا کہیں پتا نہیں چل سکا تھا۔
 وہ صبح فجر کی نماز کے بعد یوں ہی ذرا استانے کو لیٹی تھی اور جب بچوں کو اسکول بھیجنے کے خیال سے غجالت میں
 اٹھی تو دھک سے رہ گئی کہ واٹن اپنے بستر پر موجود نہیں تھا۔ دونوں بچوں کو اسکول بھیجنے کے بعد بھی وہ بہت دیر
 تک اس کے آنے کا انتظار کرتی رہی۔ پہلے اسے شدید غصہ تھا۔ وہ پھر تک یہ غصہ تشویش اور پریشانی میں بدل چکا

”صرف حقیقت بیان کر رہا ہوں، بلکہ سادہ لفظوں میں کہوں گا کہ تم کو خیر وار کر رہا ہوں۔ اگر وہ سری بار اس
 طرح کی دولت سے بچنا چاہتی ہو تو اپنی توجہ ساری کی ساری اس نئی زندگی کے تقاضوں کی طرف کر لو۔ زیادہ بہتر تو یہی
 ہے کہ مثال میرے پاس رہے، لیکن میں جانتا ہوں، تم صرف ضد اور ہش و مہری کی وجہ سے اس پہ اپنا حق جتانے
 ہوئے پیچھے نہیں ہٹنا چاہتیں، ورنہ یہ ضروری تھا۔“
 ”مگر آپ اپنی بات مکمل کر چکے تو آپ جاسکتے ہیں کہ مجھے آپ سے مزید کوئی بات نہیں کرنی۔“ وہ سخت
 روکھے لہجے میں بولی۔

”اوکے میں چلتا ہوں، ٹھیک بندہ دن بعد میں مثال کو لینے کے لیے آؤں گا۔ امید ہے تمہیں میری بات
 سمجھ میں آگئی ہوگی۔ خدا حافظ۔“ وہ جھٹکے سے اٹھ کر تیز قدموں سے چلتا ہوا پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر باہر نکل گیا۔
 اور یا ہر دو روز سے لگی کھڑی مثال کو دیکھ کر بے اختیار ٹھٹک کر رک گیا۔ مثال کے چہرے پر خوف اور سخت
 پریشانی تھی۔

وہ جھک کر اس کے پاس دو زانو بیٹھ گیا۔ نرمی سے اس کے رخساروں کو چھو کر اسے پیار کرنے لگا۔
 ”اواس ہو میری جان!“ وہ اس کی طرف ایک ٹک دیکھتے ہوئے بولا وہ نہیں بولی۔
 ”مثلاً! اب وہ پہلے والے دن جب تمہارے پاپا اور ماما اکٹھے رہتے تھے۔ کبھی بھی لوٹ کر نہیں آسکتے۔ تم سمجھ
 رہی ہون۔“ وہ سفید پڑتے چہرے کے ساتھ باپ کو دیکھتی رہی۔

”اب تم لفٹین ڈیز اینی ماما کے پاس رہا کرو گی اور فیکسٹ لفٹین ڈیز میرے پاس۔ اچھی بات ہو گی نا۔ آپ
 کسی سے بھی دور نہیں ہوگی۔ ہم دونوں ہی آپ سے بہت پیار کرتے ہیں اور آپ کے بغیر رہ بھی نہیں سکتے۔ آپ
 بھی ہم دونوں کے بغیر نہیں رہ سکتیں تو میرے خیال میں یہ ایک بہتر حل ہے۔ اس مسئلے کا کہ بجائے آپ کو
 بہت سارے سال، ہم دونوں میں سے کسی ایک کے بغیر رہنا پڑتا ہے نا۔“ مثال پھر کچھ نہیں بول پائی۔
 ”مثلاً! آپ کو یہ بات اچھی لگی یا بری۔ مجھے بتائیں کچھ؟“ وہ اس کے ننھے ننھے ہاتھ اپنے مضبوط بوڑے
 ہاتھوں میں لے کر نرمی سے بولا۔

”ماما۔ اب کس گھر میں رہیں گی پاپا؟“ اس نے بہت دیر بعد عدیل کی توقع سے بالکل مختلف سوال کیا۔ فوری
 طور پر عدیل اس کا جواب نہیں دے سکا۔

”وہ ادھر ناؤ کے ساتھ رہیں گی نا؟“ وہ پھر سے بولی۔
 ”ہاں۔ شاید۔“ عدیل مجھ سے انداز میں بولا۔
 مثال باپ کو دیکھتی رہی۔ پھر فوری نشی میں سر ہلا کر جیسے سرگوشی میں بولی تھی۔
 ”وہ یہاں نہیں رہیں گی۔ میں جانتی ہوں۔“

عدیل کو پہلی بار اپنی چھوٹی سی بیٹی کی بسے بسی پر دناسا آ گیا۔ اس معصوم کو اب ایک تیسری جگہ جا کر ایڈجسٹ
 ہونے کا خوف تھا۔

”حسن! انکل آپ کو پیار تو کرتے ہیں نا؟“
 ”آپ جتنا تو نہیں کہہ سکتے نا!“ وہ بہت مددرا نہ انداز میں بولی۔ عدیل اسے دیکھ کر رہ گیا۔ بے اختیار اس کو گلے
 لگا کر پیار کرنے لگا۔

”میرے جان! میں ہمیشہ آپ کے پاس ہوں، آپ کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ ہمیشہ اپنی بیٹی کو اپنی جان سے
 بڑھ کر عزیز رکھوں گا۔ جب آپ تھوڑی بڑی ہو جاؤ گی تو پھر آپ، ہم دونوں میں سے جس کے پاس رہنا چاہو گی وہیں
 رہ لیتا۔ اور پریشان نہیں ہونا۔ احسن! انکل اچھے ہیں، پھر آپ کی ماما بھی تو ہیں۔ وہ آپ کا بہت خیال رکھیں گی۔“

تھا اور اب تو شام ہونے کو آئی تھی۔ اس نے ٹیوشن والے بچوں کو بھی آج چھٹی دے دی تھی۔ سعدیہ اپنی نانی کے گھر گئی ہوئی تھی۔ اس کی سوجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دائن کا کہاں جا کر رہتا ہے۔ اس سے کیسی بھول ہوئی کہ کل اس سے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ وہ کہاں الیکٹریشن کا کام کیسے جاتا ہے وہاں جا کر رہتا ہی کر آئی۔

حمیدہ خالدہ دوپٹوں میں اس کے بلانے پر آئی تھیں۔ وہ بھی پریشان ہوئیں۔ مگر پھر ان کے گھر سے کسی فوننگی کا بلاوا آیا تو وہ وہاں چلی گئیں اور کسی سے عاصمہ کی اتنی جان پہچان نہیں تھی۔

”مما! بھائی کب آئے گا گھر؟“ اربہ اس کے پریشان چہرے کو دیکھ کر اس کے پاس آ کر بولی۔ عاصمہ کی آنکھوں میں آنسو ہی تو آگئے۔

”مما! بھائی کہاں چلا گیا ہے؟“ وہاں کی خاموشی پر پھر سے اس کا کندھا ہلا کر پوچھنے لگی۔

”میرے خیال میں مجھے الیاس بھائی کی دکان پر جا کر ان سے کہنا چاہیے کہ وہ ہمیں اسے تلاش کریں یا کسی کو بھیج دیں میرے ساتھ۔“ وہ خود ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے بولی۔

”میری چادر لے آو اربہ! اندر کمرے سے جا کر۔“ وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

”ایسے تو کبھی نہیں ہوا کہ وہ اتنی دیر تک باہر رہے۔ اگر وہ ناراض بھی تھا تو بھی اسے یوں بغیر بتائے تو نہیں جانا چاہیے تھا۔“ وہ سوچتی جا رہی تھی اور پریشان ہوتی جا رہی تھی۔

”تھیلے اس نے اتنا بڑا قدم اٹھاتے ہوئے کون سا مجھ سے پوچھا تھا جو اب ایسا کرے گا۔“ وہ مایوس سی ہوتی جا رہی تھی۔

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے عاصمہ۔ سن۔ کوئی اور بھی اس کے ساتھ ہو، میرا مطلب ہے جو اسے راہ سے بھٹکا رہا ہو۔“ الیاس بھائی کی بات نے ایک دم سے اسے چونکا دیا۔

اس نے تو یہ بات کل سے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچی تھی اور واثق تو ایسا کبھی بھی نہیں رہا تھا کہ ایسے خود سے فیصلے کرنا پھرے۔ دوسرے وہ تو خود بڑھائی کا بہت دیوانہ تھا۔

”کتاہیں اسکول ان سب سے تو اسے عشق تھا پھر ایک دم سے اندر ہی اندر ایسا کیا ہو گیا کہ اس نے اسکول ہی جانا چھوڑ دیا۔ ایسا کون ہو سکتا ہے۔“ وہ بھی سوچنے پر مجبور ہو گئی۔

”اس عمر کے لڑکے ضرور کسی نہ کسی بری کمپنی میں پڑ کر اس طرح بڑھائی سے بھاگتے ہیں۔ بلکہ یہ بھی ہو سکتا۔“ وہ کچھ مزید بولتے ہوئے جھجک کر رک سا گیا۔

”کیا ہو سکتا ہے اور الیاس بھائی؟“ وہ اور بھی ڈر سی گئی تھی۔

”کبھی۔ آپ کو کچھ ایسا لگا ہو۔ مطلب۔ کچھ ایسا محسوس کیا ہو آپ نے۔ کہ وہ کسی نشہ وغیرہ میں یا کسی اور غلط کام میں مبتلا ہوا ہو۔“ وہ رک رک کر بولا۔ تو عاصمہ کی سانس جیسے وہیں ٹھم سی گئی۔ ایسا تو اس نے ذرا بھی نہیں سوچا تھا۔ اسے اس پر کبھی شک بھی نہیں ہوا تھا۔

ہاں اب سوچنے پر اسے یاد آیا کہ وہ کچھ دنوں سے اسے پہلے سے کمزور ضرور لگا تھا۔ مگر اس نے خود ہی کہہ کر سر جھٹک دیا تھا کہ وہ آج کل بڑھائی میں شاید محنت زیادہ کر رہا ہے تو اس لیے کمزور لگ رہا ہے۔ مگر اس کمزوری کی وجہ نشہ نہیں۔ نہیں۔ اس کا دل کانپ سا گیا۔

”یہ تو بہن جی! آج کل ایک عام سی بات ہو چکی ہے پھر آپ کے بچے تو نہ باب کا سایہ ہے نہ کسی بڑے کا ڈر۔ باہر نکلنے والا اس کے پیچھے جانے والا کوئی مرد بھی نہیں تو ایسے لڑکوں کے ہاتھوں سے نکلنے کا زیادہ ڈر ہوتا ہے۔“ وہ

مزید کہتا چلا گیا۔

”آپ تو الیاس بھائی! مجھے بہت ڈرا رہے ہیں۔ سچی بات ہے۔ مجھ میں تو اب مزید کوئی دکھ جھیلنے کی سکت نہیں اور اس کی رکھوالی کرنے کی تو ہمت بھی نہیں۔ میں تو بہت کمزور اور بے بس ہوں۔“ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آنسوؤں پر قابو پایا تھا۔

”خدا! خواستہ میرا مقصد آپ کو کوئی تکلیف پہنچانا نہیں تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے یہ سب میرا آپ کا وہم ہو، واثق ایسی کسی کمپنی میں نہ انوالو ہوا ہو۔ بہر حال آپ گھر جائیں، میں خود جاتا ہوں اس کا پتا کرنے اور اسے ساتھ لے کر آتا ہوں۔ ان شاء اللہ وہ ٹھیک ہو گا۔ آپ زیادہ پریشان نہیں ہوں۔“ وہ اس کی حالت دیکھ کر تسلی دینے والے انداز میں بولا۔

”الیاس بھائی! شام بہت ہو گئی ہے، میرا دل بیٹھا جا رہا ہے، ایسا کبھی بھی نہیں ہوا اور میں نے کل شاید اس کے ساتھ کچھ زیادہ ہی سختی کر دی تھی تو شاید اس سے خائف ہو کر وہ کہیں گھر سے بھاگ تو نہیں گیا۔“ وہ ڈر ڈر کر خود ہی بولی۔

الیاس لحد بھر کو خاموش سا ہو گیا۔

”یہ بات بھی ہو سکتی ہے اور بہن ایسے بچوں پر سختی اکثر الٹا کام ہی کرتی ہے، آپ کو گھر جا کر ایک بار تسلی سے ہر چیز کی تلاش لینا ہوگی کہ کہیں وہ جاتے ہوئے اپنے کچھ کپڑے اور کچھ پیسے یا کوئی قیمتی شے تو ساتھ نہیں لے گیا اگر گھر سے ایسا کچھ غائب ہے تو پھر واقعتی۔ وہ کہیں چلا نہ گیا ہو۔“

”میرے خدا! عاصمہ تو سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

”اور اب تو شام ہو چکی اگر ایسا کچھ اس کا راہ تھا تو اب تک وہ شہر سے باہر کہیں دور نکل گیا ہو گا۔“

اور عاصمہ کی آنکھوں کے آگے گہرا اندھیرا چھا گیا۔ وہ اپنے چکراتے سر کو تھامنے لگی۔

* * *

”یہ کیا ہے؟“ عدیل حیران سلمان کی طرف دیکھنے لگا۔ فیم نے کچھ ناراض نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ تینوں تصویریں اچھے گھر کی لڑکیوں کی ہیں ان میں سے یہ نیلے سوٹ والی کی مرن چار ماہ ہی شادی۔ اس کے بعد ساس، خمنوں نے ظلم ستم کر کے طلاق دلوادی اور یہ گلانی کپڑوں والی ذرا سی عمر کی زیادہ ہے مگر ابھی شادی نہیں ہوئی اس کی۔ خوب لبا چوڑا چیز اور پیسہ بھی بڑے رہے ہیں اماں باوا شادی میں۔ اور یہ تیسری سفید کپڑوں والی بی بی میرے دل کو تو یہ بھائی ہے، عفت نام سے اس کا۔ شکل کی بھی معصوم بھولی بھالی اور پڑھی لکھی بھی ہے۔ ماں باپ بچپن میں مر گئے تھے ان کی محرومی دیکھ رکھی ہے اس نے۔ چچا، چچی نے پالا ہے۔ بھلے جیسا بھی پالا ہو گا۔ ماں باپ جیسا پار تو نہیں دے سکتے نا۔“

فیم سب کا پایا بیوڑا بناتے ہوئے سانس لینے کو رکھیں۔

عدیل نے آگے اس دوران تصویریں میز پر لٹا دیں۔ اس کے چہرے پر سوائے کوفت اور بے زاری کے اور کچھ نہیں تھا۔

فیم باتوں کے دوران اس کا چہرہ بھی بدبختی جا رہی تھیں۔

”پڑھی لکھی بی بی اے پاس ہے، سلائی کڑھائی میں ماہر کھانا پکانا سب کچھ جانتی ہے۔ بہت فرماں بردار، ادب آداب والی بچی ہے۔ اپنی مثال کہاں کا پیار بھی ملے گا اور اس کا خیال بھی رکھے گی۔“ فیم نے آخری لالچ دیا جس کے دھوکے میں عدیل آسکتا تھا۔

لے جائے تمہیں۔ امی ٹھیک کہتی ہیں میں تم پر ناحق اپنی محبت ضائع کر رہی ہوں۔ تم پھر بھی میری نہیں ہوئے والی۔ بشری کو ایک صوم سے غصہ آیا۔
 ”نہیں۔ نہیں ماما! بالکل بھی نہیں۔ میں تو آپ کے پاس ہی رہنا چاہتی ہوں۔“ وہ بری طرح سے ڈر گئی تھی۔
 ممانے ابھی اسے گھر سے نکال دیا تو۔ اسے تو اس نئے علاقے کے کسی بھی راستے کا پتا نہیں اور پایا اگر اسے نہیں آئے تو وہ ڈر گئی تھی۔
 بشری اسے خود سے الگ کرتی اندر احسن کمال کے پاس جا چکی تھی اور مثال سہمی ہوئی اس شان دار لافونج میں اکیلی کھڑی رہ گئی تھی۔

”سواری ماما! وعدہ پر اس۔ آپ کو آئندہ کبھی یوں تنگ نہیں کروں گا وعدہ کرتا ہوں۔ میں آج صرف جاؤں انکل کو بتانے گیا تھا کہ میں کل سے نہیں آسکوں گا مگر انہوں نے اپنے آدمی کے ساتھ مجھے شہر سے باہر کسی کو بھی میں بجلی کا کام کرنے بھیج دیا۔ میں نے ان سے بہت کہا بھی۔ مگر پلیز ماما! نہیں روئیں۔ میں اب کبھی آپ کی اجازت کے بغیر۔ آپ سے پوچھے بغیر گھر سے باہر نہیں نکلوں گا۔“
 وہ ماں کی حالت دیکھ کر خود بھی رونے لگا تھا مگر اس کو اپنے آنسوؤں بہت کنٹرول تھا۔
 الیاس کے آنے سے پہلے وہ گھر واپس آ گیا تھا مگر عاصمہ کی حالت دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا تھا۔
 بار بار ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ رہا تھا مگر عاصمہ تو روئے جا رہی تھی۔
 ”میں کل سے اسکول بھی جاؤں گا اور پوری لگن سے محنت کروں گا۔ آپ کی ہر بات مانوں گا۔ ان شاء اللہ پیاس بھی ہو جاؤں گا۔ پلیز اب تو نہ روئیں۔“ وہ اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے منت سے بولا تو عاصمہ نے بے اختیار اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

”سوری ماما! وعدہ پر اس۔ آپ کو آئندہ کبھی یوں تنگ نہیں کروں گا وعدہ کرتا ہوں۔ میں آج صرف جاؤں انکل کو بتانے گیا تھا کہ میں کل سے نہیں آسکوں گا مگر انہوں نے اپنے آدمی کے ساتھ مجھے شہر سے باہر کسی کو بھی میں بجلی کا کام کرنے بھیج دیا۔ میں نے ان سے بہت کہا بھی۔ مگر پلیز ماما! نہیں روئیں۔ میں اب کبھی آپ کی اجازت کے بغیر۔ آپ سے پوچھے بغیر گھر سے باہر نہیں نکلوں گا۔“
 وہ ماں کی حالت دیکھ کر خود بھی رونے لگا تھا مگر اس کو اپنے آنسوؤں بہت کنٹرول تھا۔
 الیاس کے آنے سے پہلے وہ گھر واپس آ گیا تھا مگر عاصمہ کی حالت دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا تھا۔
 بار بار ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ رہا تھا مگر عاصمہ تو روئے جا رہی تھی۔
 ”میں کل سے اسکول بھی جاؤں گا اور پوری لگن سے محنت کروں گا۔ آپ کی ہر بات مانوں گا۔ ان شاء اللہ پیاس بھی ہو جاؤں گا۔ پلیز اب تو نہ روئیں۔“ وہ اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے منت سے بولا تو عاصمہ نے بے اختیار اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

اس کی شرمندگی اس کی معذرت میں بہت سچائی تھی۔ عاصمہ کو اپنے بیٹے پر دل سے یقین آ گیا۔ واثق نہ جھوٹا تھا اور نہ کسی ایسی کسی کہانی میں مبتلا ہوا تھا۔ اسے یقین تھا۔
 اگلے ہی دن وہ اس کے اسکول جا کر ریسپل کی منت کر کے اسے ری ایڈمٹ کروا آئی تھی۔
 ٹیچرز نے بھی واثق کے پچھلے ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے ہر طرح کی مدد تعاون کرنے کا وعدہ کیا تھا۔
 عاصمہ نے شکرانے کے نقل پڑھے۔ اسے لگا واثق بہت دور جاتے جاتے پلٹ آیا تھا۔
 اللہ نے اس سے بہت رحم کیا تھا۔ اس کے اٹانے کو بچالیا تھا اور نہ الیاس بھائی نے جس طرح کا نقشہ کھینچا تھا۔ وہ تو اندر تک سنبھل کر رہ گئی تھی۔
 واثق اگلے دن باقاعدگی سے اسکول جانے لگا۔ عاصمہ کو پھر سے اس کے ساتھ کچھ بھی کرنا نہیں پڑا تھا اللہ نے اس آزمائش کے بعد اس کے راستے سیدھے کر دیے تھے۔

”سواری ماما! وعدہ پر اس۔ آپ کو آئندہ کبھی یوں تنگ نہیں کروں گا وعدہ کرتا ہوں۔ میں آج صرف جاؤں انکل کو بتانے گیا تھا کہ میں کل سے نہیں آسکوں گا مگر انہوں نے اپنے آدمی کے ساتھ مجھے شہر سے باہر کسی کو بھی میں بجلی کا کام کرنے بھیج دیا۔ میں نے ان سے بہت کہا بھی۔ مگر پلیز ماما! نہیں روئیں۔ میں اب کبھی آپ کی اجازت کے بغیر۔ آپ سے پوچھے بغیر گھر سے باہر نہیں نکلوں گا۔“
 وہ ماں کی حالت دیکھ کر خود بھی رونے لگا تھا مگر اس کو اپنے آنسوؤں بہت کنٹرول تھا۔
 الیاس کے آنے سے پہلے وہ گھر واپس آ گیا تھا مگر عاصمہ کی حالت دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا تھا۔
 بار بار ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ رہا تھا مگر عاصمہ تو روئے جا رہی تھی۔
 ”میں کل سے اسکول بھی جاؤں گا اور پوری لگن سے محنت کروں گا۔ آپ کی ہر بات مانوں گا۔ ان شاء اللہ پیاس بھی ہو جاؤں گا۔ پلیز اب تو نہ روئیں۔“ وہ اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے منت سے بولا تو عاصمہ نے بے اختیار اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

اندر میرے میں وہ بہت خوفناک چہرہ تھا۔ بہت لمبی سرخ زبان تھی اس کی اور سفید املی ہوئی آنکھیں۔ کالا سیاہ داغ دار چہرہ اور سیاہ جسم اس کے ہاتھوں کے نوکیلے لمبے ناخن اس کے چہرے کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔
 مثال کی نیند سے جاگی آنکھیں خوف سے بند ہونے لگیں۔ دوسرے لمحے وہ آنکھیں بند کیے زور زور سے چیختی چلی گئی۔
 یکایک گھپ اندھیرے میں بے تمنا روشنی ہو گئی تھی۔ بشری اسے ساتھ لگائے چمنائے اسے سنبھالنے کی

”میں میری جان! آپ کی ماما کو آپ کا انتظار ہے۔ ان کے پاس آپ کے لیے ایک سربراہ بھی ہے۔ آپ جاؤ گی تو خوش ہو جاؤ گی۔ پندرہ دن بعد ہمیں لینے آ جاؤں گا۔ تم وہاں بہت خوش رہو گی اور میری جان۔ کچھ چاہیے تو نہیں۔“

اور مثال تو دم بخود سی رہ گئی۔ عدیل نے کس طریقے سے اسے خود سے ہٹا کر عفت کی طرف اپنی توجہ کی۔
”یار! سامان پیک کرو مثال کا۔ اس کی ماں کا ڈرائیور لینے آ رہا ہے اسے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بہت سے محبت بھرے پیغام چھوڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”اور میری پینٹنگ مجھے بھی تو جانا ہے پچا جان کی طرف سوہ بھی تو کر لوں نا!“ عفت ادا سے پلکیں جھکا کر بولی۔
”مجھے بھی وہاں رہنے جانا ہے۔“

”تمہیں تو میں اچھی طرح جانے دوں گا۔ کہیں نہیں جا رہی ہو تم۔ منے جانا ہے تو آؤ گے گھٹے کے لیے ملو لاؤں گا۔ رات رہنے کا تو سوچنا بھی نہیں۔“ عدیل پیار بھری سرگوشی میں چھیڑ چھاڑ کرتے اس سے کہہ رہا تھا۔ وہ زور سے ہنس پڑی۔ سب بھر بھری کا ڈرائیور مثال کو لینے آچکا تھا۔
مگر یہ تو بہت شروع کی باتیں تھیں جب دونوں طرف سے اسے لینے ڈرائیور آیا کرتے تھے اور کوئی اس کا منتظر ہوا کرتا تھا۔

زوردار چھٹا کے سے جیسے بہت سے کالج کے برتن ایک ساتھ ٹوٹے تھے اور اندر باتیں کرتے سب ہی لوگ بے اختیار ٹھنک کر ادھر دیکھنے لگے جدھر سے آواز آئی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

پہلے تو وہ باسی کھانے یا ہوٹل سے منگوا کر گزارہ کرتی تھیں مگر مثال کے آتے ہی۔ عدیل مختلف فرمائشیں پروگرام جاری کر دیتا جنہیں پورا کرنے میں نسیم کی حالت خراب ہو جاتی۔

عدیل ہاتھوں سے نہ نکل جائے وہ ہر بات بلا چوں چرامان گیتیں مگر عدیل کی غیر حاضری میں وہ مثال کو اس کی ماں کو خوب سناتیں۔ اور پیپا کے گھر تو اسے اکثر ہی گندے یونیفارم کے ساتھ اسکول جانا پڑتا۔ وہ پڑھائی میں بھی بہت عجیب ہوتی جا رہی تھی۔

نیچرز کے بلائے پر بھی بشری اس کے اسکول جانے کا ٹائم نہیں نکال پاتی تھی۔ عدیل دو ایک بار گیا مگر پھر اس کے بھی آفس کے کچھ ایسے ٹپ نکل آئے جو شہر سے باہر تھے۔
مثال کے لیے ماں باپ ہی نہیں ہر چیز بدل گئی تھی۔

نسیم تو اب باقاعدہ مثال سے جھاڑو اور برتن دھلوانے کا کام عدیل کی غیر موجودگی میں لینے لگی تھیں۔ مسلسل بازار کے کھانے کھانے سے مثال کو ڈاڑھیا ہو گیا اور اس کے بعد بخار جو بڑھ کر پھیلا ہوا گیا۔ بشری اسے اپنے گھر بلوانا بھول گئی۔ مثال کی حالت دیکھ کر پہلی بار عدیل کو احساس ہوا کہ بچی کو سنبھالنے کے لیے گھر میں کسی عورت کا وجود کتنا ضروری ہے۔

”میں تیار ہوں امی! شادی کے لیے آپ جہاں کہیں گی جس سے کہیں گی میں کر لوں گا۔ میری شرط صرف یہی ہے کہ وہ مثال کا بہت خیال رکھے گی اسے اپنی بیٹی کی طرح سمجھے گی۔“

اور نسیم کو تو جیسے شادی مرگ ہو گیا تھا۔
اگلے ہی ہفتے وہ عام سی شکل والی مرعجان مرعج عفت، مثال کی نئی ماما بن کر آئی۔ نسیم اور عدیل کی ہدایت کے عین مطابق اس نے گھونگھٹ اٹھاتے ہی مثال کو اپنی آنکھوں میں سمیٹ لیا تھا۔

اس دوران بشری کے گھر ایک اور گڑیا آچکی تھی جو سینی کی لاڈلی، سن اور احسن کمال کی آنکھ کا تارا تھی۔
اور بشری کے لیے احسن کمال کی زندگی میں قدم چمانے کی باقاعدہ سند۔ مثال تو ان بہت سارے دنوں میں کہیں گم ہو کر رہ گئی تھی۔

عفت نے اسے اتنی محبت اتنی توجہ دی کہ وہ بشری کو واقعی جیسے بھول چلی تھی۔
”ہاں میں بھجوا رہا ہوں مثال کو تھوڑی دیر میں۔“ عدیل فون پر کسی سے کہہ رہا تھا۔
”عفت! مثال کا بیگ تیار کرو اسے اس کی ماما کے پاس جانا ہے۔“ مثال صدمہ سے باپ کی طرف دیکھتی چلی گئی۔

”پاپا۔ میں نے... مجھے ابھی نہیں جانا۔ کہیں بھی۔ میں آپ کے پاس۔ عفت ماما کے پاس رکوں گی۔ میں۔“ وہ بہت مشکل سے اس بھرے لہجے میں بولی تھی۔

ماں کی طرف سے تو وہ بہت مایوس ہو چکی تھی۔ اب وہ بشری سے کبھی کوئی فرمائش نہیں کرتی تھی مگر عدیل کی طرف ابھی اس کے دل میں بہت سی امیدیں تھیں۔
”میری بیٹی! عدیل نے اسے خود سے لپٹا لیا۔ اور پیچھے کھڑی بنی سنوری عفت پہ نظر ڈالی جو چند دن کے لیے اپنے بچاؤ کے گھر جانے والی تھی۔

اور نسیم کا کماچ ہوا تھا۔ عام سی شکل والی ساہ سی عفت پہ شادی کے چند دنوں میں ایسا غضب ناک رنگ و روپ آیا تھا اور اس کا سوکھا سڑا جسم ایسا بھرا بھرا ہو گیا تھا کہ بہت سارے دنوں سے عدیل نے ایک بار بھی بشری کو یاد نہیں کیا تھا۔ اور ابھی بھی عفت کی شرمیلیں نگاہیں اور دکھتا روپ اس سے بہت کچھ کہہ رہا تھا جسے وہ نظر انداز نہیں کر پاتا تھا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوشگوار

میرے خواب لوٹا دو	کسی راستے کی تلاش میں	شریک سفر	ساری بھول ہماری تھی
گفتہ عبداللہ نبت-4001 پے	میونہ خورشیدی نبت-3501 پے	زہرہ ممتاز نبت-5501 پے	راحت جنیں نبت-3001 پے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار، کراچی فون نمبر 32735021